سلسلہ شرح کلام اقبال کا چوتھا حصہ

مطالب

اسرار و رموز

یعنی

علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی فارسی مثنویوں "اسرار خودی" و "رموز بیخودی"

جامع، سلیس اور عام فہم شرح

غلام رسول مہر

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، کشمیری بازار، لاہور

برانچیں:۔ لاہور، کراچی، پشاور، حیدرآباد

سلسلۂ شرح کلامِ اقبال کا چوتھا حِصّہ

مطالب

اسرار و رموز

یعنی

علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی فارسی مثنویوں "اسرار خودی" و "رموز بیخودی" کی جامع، سلیس اور عام فہم شرح

غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۹۲

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : علمی پرنٹنگ پریس ۱۷۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور

ناشر : شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز پبلشرز لاہور

(طبع اوّل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

اسرارِ خودی اسرار و رموز میں سے پہلی مثنوی یعنی اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ خود اقبال نے منشی سراج الدین کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

"یہ مثنوی (اسرارِ خودی) گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی، مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن (بیرسٹری) میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے کام بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوگا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے۔ گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے، جو اپنے اختیار کی بات نہیں[1]"

یہ مکتوب ۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مثنوی کا آغاز ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ فکر و تصور میں بھی آغاز کا وقت یہی درست تسلیم کر لینا چاہیے یا سلسلہ بہت پیچھے جاتا ہے؟

اکرام الحق صاحب سلیم کا بیان اکرام الحق صاحب سلیم بی، اے فرماتے ہیں: اقبال ابھی کیمبرج ہی میں تھے اور کسی انگریزی رسالے کے لیے اسلامی سیاست پر مضمون لکھ رہے تھے کہ یکایک ان کے دل میں سوال پیدا ہوا، مسلمانوں کے زوال کا نفسیاتی محرک کیا تھا؟ اس کے جواب کے لیے سارا ذخیرہ دیکھ گئے، جو ان کے نزدیک کسی نہ کسی پہلو سے قابلِ اعتنا تھا، تاہم انھیں شافی جواب نہ مل سکا۔ اسی وقت سے وہ وجوہِ تنزل پر غور کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی قوتِ عمل شل ہو چکی ہے۔ ان میں اسلاف کا سا ولولہ، جوش،

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۴۲، ۴۳

خلوص اور ایثار باقی نہیں رہا۔ وہ توحید کی روح سے خالی ہو چکے ہیں۔ خوفِ خدا کی جگہ اُن چیزوں نے لے لی ہے، جنھیں اسلام سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے حقیقی اسلامیت کی بیداری کے لیے ایک نظامِ فکر ترتیب دیا، جس کے پہلے حصّے نے "اسرارِ خودی" کی شکل اختیار کی۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں ابتدائی دور کی عملی روح اور خدا کے سوا ہر شے سے بے پروائی پیدا نہ ہو گی، وہ کوئی کام انجام نہ دے سکیں گے۔ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ادبیّات کے ذخیرے میں ایسی کتابیں ناپید ہیں، جو مسلمانوں میں خودی اور جدّوجہد کی روح پھونک سکیں۔ جتنی کتابیں ان میں رائج تھیں، خودی، خودداری، ہمّت، جوش اور ایثار کی تصنیف کا باعث تھیں۔

محترمہ عطیہ فیضی کے نام مکتوب

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مقصد و نصب العین نے شاعر کی کارگاہِ افکار میں کیا کیا شکلیں اختیار کیں، یہاں تک کہ یہ "اسرارِ خودی" کے سانچے میں ڈھل کر منظرِ عام پر نمودار ہُوا۔ اقبال کی اپنی تحریرات کا مطالعہ بہ دقّتِ نظر کیا جائے تو کہیں کہیں ایسے نقوش مل جاتے ہیں، جن کی رہنمائی میں ہم "اسرار و رموز" کے مختلف ارتقائی مراحل کا سراغ لگا سکتے ہیں، مثلاً میرے علم کے مطابق ایک فارسی مثنوی کا ابتدائی ذکر اقبال نے ۷۔ جولائی ۱۹۱۱ء کے ایک مکتوب میں، جو محترمہ عطیہ فیضی کے نام تھا، کیا تھا۔ بہ ظاہر یہ کسی ایسی ہی مثنوی کا ذکر تھا، جیسی بعد میں "اسرارِ خودی" کے نام سے منظرِ عام پر آئی۔ فرماتے ہیں؛

> "قبلہ والد صاحب نے فرمائش کی کہ حضرت بوعلی قلندرؒ کی مثنوی کے طرز پر ایک فارسی مثنوی لکھوں۔ اس راہ کی مشکلات کے باوجود میں نے کام شروع کر دیا ہے،"

تمہیدی بند ملاحظہ فرمایئے:

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن ‌ ‌ ‌ ‌ بزم را از ہاؤ ہو آباد کن
آتش استی بزمِ عالم برفروز ‌ ‌ ‌ ‌ دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سرمنزلِ صد نالہ ساز ‌ ‌ ‌ ‌ اشکِ خونیں را جگر پرکالہ ساز
پشتِ پا بر منزلِ دنیا بزن ‌ ‌ ‌ ‌ موجۂ بیرونِ ایں دریا بزن

شیخ بوعلی قلندرؒ کی مثنوی

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ اقبال نے ۱۹۱۱ء میں والدِ ماجد کی فرمائش پر ایک مثنوی، شیخ بوعلی قلندرؒ کی مثنوی کے انداز پر لکھنی شروع کر دی تھی۔ شیخ موصوف کے مطبوعہ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ دیوان اور متفرقات کے علاوہ ان سے تین مثنویاں منسوب ہیں۔ ایک خاصی طویل ہے، اس کا نام "مخزن معنوی" بتایا گیا ہے۔ دوسری پہلی سے ذرا مختصر ہے، اس کا نام "کلامِ قلندری" ہے۔ تیسری مثنوی سب سے چھوٹی ہے اور اس کا کوئی خاص نام نہیں۔ مطبوعہ کلام میں اسے "مثنوی بوعلی قلندرؒ" قرار دیا گیا ہے۔ یہی مشہور و متداول تھی اور الگ طبع ہو کر بھی فروخت ہوتی رہی — میں سمجھتا ہوں کہ اقبال اور ان کے والدِ ماجد کے پیشِ نظر یہی آخری مثنوی تھی۔ "اس کے طرز" سے مقصد غالباً صرف

بحر تھی، باقی ظاہر ہے کہ شیخ کی مثنوی کے جو مطالب تھے، وہ اقبالؔ کی مثنوی کے مطالب نہیں ہو سکتے تھے۔ اقبالؔ نے خود بھی شیخ بو علی قلندرؒ کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اس مثنوی کا پہلا شعر خفیف سی ترمیم کے بعد شامل کر لیا ہے[۱] اور ایک شعر "رموز" میں بھی ہے[۲]:

پھر کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اقبالؔ ابتدا میں ایک مختصر سی فارسی مثنوی لکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے شیخ بو علی قلندرؒ کی مثنوی کا حوالہ دیا، جو مختصر تھی؟ یا ممکن ہے کہ اقبالؔ نے والدِ ماجد سے مجوزہ مثنوی کا ذکر کیا ہو اور انھوں نے مشورہ دیا ہو کہ شیخ بو علی قلندرؒ کی مثنوی کا انداز پیشِ نظر رکھو۔ اس کے لیے قرائن موجود ہیں، البتہ ظاہر ہے کہ یقین و وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا:

مولانا رومؒ | یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا میں مختصر مثنوی لکھنے کا خیال ہو، پھر اس موضوع پر غور و فکر کا سلسلہ جاری رہا تو زیادہ مطالب سامنے آ گئے اور مثنوی کو پھیلانا پڑا، یہاں تک کہ اس کے تین حصے لکھنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، مگر صرف دو حصے لکھ سکے۔ اس وقت مولانا رومؒ پیشِ نظر آئے اور ان کی مثنوی سے انتساب مناسب سمجھا گیا۔ نیز مولانا رومؒ مختلف صورتوں میں ان کی ذہنی اور روحانی رہبری فرماتے رہے۔ جو چار شعر محترمہ عطیہ فیضی کے مکتوب میں منقول ہیں، ان میں سے تین (دو تھوڑی سی ترمیم کے بعد) "اسرارِ خودی" کے اس حصے میں شامل ہیں، جس میں مولانا رومؒ نے بہ عالمِ خواب مثنوی لکھنے کی ہدایت فرمائی[۳]:

بہر حال اگر اکرام الحق صاحب سلیمؔ کا بیان درست ہے کہ اقبالؔ دورانِ قیامِ کیمبرج ہی میں کوئی ایسی چیز لکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے جو مسلمانوں میں حقیقی بیداری پیدا کر سکے تو قیاس یہی ہے کہ اس چیز نے ذہن میں مختلف شکلیں اختیار کیں۔ ابتدا میں اس کی حیثیت کچھ تھی، پھر نئے نئے پہلو سامنے آتے رہے، یہاں تک کہ دو مثنویوں کا خاکہ ان کے ذہن میں مکمل ہو گیا۔ ایک کا تعلق حیاتِ فرد سے تھا، اس کا نام "اسرارِ خودی" رکھا، دوسری کا تعلق حیاتِ ملت سے تھا اور ملت افراد کے اجتماع سے ترکیب پاتی ہے یعنی افراد مشترک مقاصد و مصالح کی غرض سے انفرادی ہستیوں پر پابندیاں لگا لیتے ہیں، لہٰذا اسے "رموزِ بیخودی" سے موسوم کیا گیا۔ باقی رہا اقبالؔ کا یہ ارشاد کہ "اسرارِ خودی" گزشتہ دو سال میں لکھی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مثنوی کا خاکہ مکمل کر لینے کے بعد دو سال کے اندر اس میں رنگ بھرا گیا۔ یہ مطلب نہیں کہ اس سے پیشتر مثنوی کی کوئی الگ صورت ذہن میں نہیں آئی تھی یا وہ دوسرے خطوط پر غور و فکر نہیں کرتے رہے تھے۔

مثنوی کا نام | مثنوی کے نام کا مسئلہ اس کی تکمیل کے بعد بھی اقبالؔ کے زیرِ غور رہا۔ وہ اپنے دوستوں سے بھی نام کے بارے میں مشورے فرماتے رہے۔ چنانچہ ۲۔ فروری ۱۹۱۵ء کے ایک مکتوب میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے، اب قریباً تیار ہے"

۱؎ اسرار و رموز صفحہ ۱۷، شعر ۷ ۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۱۸۲ شعر ۴ ۔ ۳؎ اسرار و رموز صفحہ ۹، شعر ۱۱، ۵، ۸

اور پریس میں جانے کو ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی عمدہ نام تجویز فرمائیے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام "اسرارِ حیات"، "پیامِ سروش"، "پیامِ نو"، "آئینِ نو" تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ میں انتخاب کرسکوں"۔[1]

مثنوی کی ابتدائی جھلک "اسرارِ خودی" کی اشاعت سے چھ سات مہینے پیشتر انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہوا تھا، جس میں اقبال نے "عجمی تصوف اور اسلام" پر لکچر دیا تھا۔ اس میں انھوں نے فرمایا تھا:

"اس مروّجہ تصوف کو اسلام کے سادہ قواعد اور عربی روحِ دین سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کا بنیادی ستم یہ ہے کہ یہ خودی کو تباہ کرتا ہے، حالانکہ خودی ہی ایک ایسی چیز ہے جو افراد و اقوام کی زندگی کی ضامن اور انسان کو بلند ترین مادّی و روحانی مدارج پر پہنچانے کی کفیل ہے"۔

مزید آگے بڑھ کر فرمایا:

"تصوف کے لٹریچر میں جہاں کہیں خودی کو مارنے کا ذکر آیا ہے، وہاں عوام اس کے معنی "غرور و تکبر" کرتے ہیں، جو حقیقتاً رذائل میں سے ہے اور اس سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے، لیکن متصوفین نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا، بلکہ "احساسِ ذات"، "انا" اور "میں" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے، اپنے نفس کی نفی کردے، تب معرفت کی منزل پر فائز ہوسکتا ہے، حالانکہ یہ تصور بالکل خلافِ اسلام ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قائم رہے، بلکہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جو اس کے لیے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور میں نہیں آسکتا"۔[2]

اس کے بعد فرمایا کہ میں نے "اسرارِ خودی" کے نام سے ایک مثنوی مرتب کی ہے، جس میں خودی کے متعلق حقائق واضح کیے ہیں۔ یہ مثنوی عنقریب شائع ہوگی اور اس سے عجمی تصوف کا وہ طلسم پاش پاش ہوجائے گا جس نے مسلمانوں کو توفیقِ عمل سے محروم کرکے جامد و منجمد بنا رکھا ہے۔ پھر مثنوی کے کچھ اشعار سنائے۔ یہ اس کتاب کی پہلی جھلک تھی جو آگے چل کر اقبال کی مستقل تعلیمات میں بنیادی حیثیت اختیار کرنے والی تھی۔

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۳۶۸۔ [2] رسالہ "اقبال" بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۶۵

مثنوی کے کچھ اشعار اشاعت سے پیشتر خواجہ حسن نظامی کے اخبار "توحید" میں بھی شائع ہوئے تھے اور خواجہ صاحب نے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ازبر کر لینے کی سفارش کی تھی۔ بعد میں بحثیں چھڑیں تو خواجہ صاحب نے خود بھی ایک تحریر میں اس واقعے کا اعتراف کیا تھا۔[1]

مثنوی کے خلاف ہنگامہ

غرض مثنوی شائع ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ تھا جو بارہ صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔ فی صفحہ تقریباً ایک سو چالیس لفظ تھے۔ ایک پیشکش تھی، جس میں مثنوی کو سر علی امام سے منسوب کیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں وہ دولت آصفیہ کے باب حکومت کے صدر تھے، یعنی انھیں صدر اعظم کا منصب حاصل تھا، لیکن انتساب کی وجہ ان کا منصب نہ تھا بلکہ اُن کے اور اقبالؔ کے گہرے ذاتی مراسم تھے۔ باقی مثنوی کی عام حیثیت وہی تھی، جواب ہے، البتہ پہلے ایڈیشن میں خواجہ حافظؒ کے متعلق ایسے اشعار لکھے گئے تھے، جو مختلف لوگوں خصوصاً صوفیہ کو بہت ناخوشگوار محسوس ہوئے، حالانکہ اقبالؔ کا مقصود انتقاد خواجہ حافظؒ یا ان کی شاعری نہ تھی، بلکہ وہ بہتر اور صالح ادبیات پر زور دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دوسرے ایڈیشن میں یہ اشعار حذف کر دیے گئے اور اُن کی جگہ اصلاح ادبیاتِ اسلامیہ اور حقیقتِ شعر کے زیرِ عنوان اشعار شامل کر دیے گئے۔

اس مثنوی کے خلاف بعض حلقوں میں شور بپا ہوا، جس کے اسباب ذیل میں درج ہیں:

۱۔ سمجھا گیا کہ اقبالؔ تصوف کے مخالف ہیں، حالانکہ اس کے لیے کوئی قابلِ ذکر وجہ یا بنا موجود نہ تھی۔

۲۔ اقبالؔ نے خواجہ حافظؒ کی بے حرمتی کی ہے۔

۳۔ اقبالؔ نے وحدت الوجود کو غلط بتایا ہے۔

۴۔ اقبالؔ نے مثنوی سر علی امام سے منسوب کر کے دینی خودی پر ضرب لگائی۔

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، زیادہ تر لوگ خواجہ حافظؒ ہی کے معاملے سے متاثر ہوئے۔ خواجہ کو بالعموم شاعر نہیں، ولی سمجھا جاتا تھا اور ان کی شراب شرابِ معرفت مانی جاتی تھی؛ اگرچہ اس تعبیر کے لیے کوئی گنجائش موجود نہ تھی؛ تاہم میں یہاں کوئی بحث نہ چھیڑوں گا۔ میری خواہش یہ ہے کہ سب سے پہلے مثنوی کے تمام ضروری متعلقات خوانندگانِ کرام کے سامنے پیش کروں پھر وہ سب کچھ مرتب صورت میں سامنے لاؤں جو اقبالؔ نے اپنے افکار کی توضیح یا غلط انتسابات کی تردید یا بعض امور کے اعتراف میں کہا ہے، پھر ضرورت محسوس ہوئی تو بعض باتوں کی مزید توضیح کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ اپنے موقف کے دفاع کے لیے اقبالؔ بہترین اور موزوں ترین شخص ہو سکتے تھے۔ کوئی دوسرا شخص نہ ان سے بڑھ کر زیر غور مسائل کا اندازہ داں تھا، نہ ان مسائل کی تائید میں اقبالؔ سے قوی تر دلائل پیش کر سکتا تھا۔ کیوں نہ سب سے پہلے انھیں کے منتشر اور بکھرے ہوئے ارشادات کو یکجا کیا جائے؟ البتہ ممکن ہے، کوئی ضروری پہلو اتفاقیہ نظر انداز ہو گیا ہو، اس کے متعلق حسبِ ضرورت توضیحات پیش کی جا سکتی ہیں۔

---

[1] رسالہ "اقبال" اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۷۵

دیباچہ اب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دیباچے کے اہم نکات خود اقبال کے الفاظ میں پیش کر دیے جائیں، جسے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق حذف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جتنی توضیح فرمائی تھی، وہ اصل مطلب کے لیے کافی نہ تھی جتنی توضیح ضروری تھی، وہ ایسی تفصیل کی محتاج تھی کہ دیباچہ بجائے خود ایک کتاب بن جاتا، لہٰذا انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے حذف کر دیں۔ ہاں کوئی شخص ان کے موقف پر شرح و بسط سے لکھنا چاہے تو وہ دیباچہ اس سفر میں سنگہائے میل کا کام دے سکتا ہے۔ انھوں نے خود حافظ اسلم جے راج پوری مرحوم کو لکھا کہ دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا جیسا کہ بعض احباب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں، لہٰذا میں نے اسے حذف کر دیا۔[1]

اہم نکات دیباچے کا خلاصہ اقبال ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

۱۔ یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پُراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ خودی یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کے رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کے رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے، مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی، جس کے حکماء و علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس کے جواب کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔

۲۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی "انا" محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق انھیں ایسے نتائج کی طرف لے گیا، جن کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی۔

۳۔ ہندو قوم کے موشگاف حکماء نے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "انا" کی حیات کا یہ مشہور تسلسل، جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے، عمل سے متعین ہوتا ہے۔ گویا انسانی "انا" کے موجودہ کیفیات و لوازم اسی کے گزشتہ طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام کرتا رہے گا، وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔

۴۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکماء نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا بہ الفاظ دیگر جبر و اختیار

[1] اقبال نامہ جلد اول ص ۵۲۔

کی گتھی کو سلجھایا۔ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدّت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں، جو اس قضیئے سے پیدا ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ جب "انا" کی تعیین عمل سے ہے تو "انا" کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملّی پہلو سے نہایت خطرناک تھا۔

۵ - سری کرشن نے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترک عمل سے مراد ترک کلّی نہیں کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے۔ ترک عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق وابستگی نہ ہو۔

۶ - افسوس کہ جس عرفانِ معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے، سری شنکر (شنکر اچاریہ) کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

۷ - مسئلہ "انا" کی تحقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ کی یہ مماثلت نہایت عجیب و غریب ہے کہ جس نقطہ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدت الوجود کو اسلامی تخیّل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدالدین کرمانی اور فخرالدّین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے۔ رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگے گئے۔

۸ - ہندو حکماء نے وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو مخاطب کیا۔ ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا، یعنی انھوں نے دل کو آماجگاہ بنایا اور اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔

۹ - علماء قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکماء میں واحد محمود نے اسلامی تخیّل کے اس ہمہ گیر اعلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا، مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

۱۰ - مغربی اقوام اپنی قوّتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبیات و تخیّلات اہل مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں۔

۱۱ - مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی (سپنوزا) کے نظامِ وحدتِ الوجود سے ہوتی ہے، لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا۔ وحدت الوجود کا طلسم، جسے ریاضیات کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا، دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔

۱۲ - سب سے پہلے جرمنی میں انسانی "انا" کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب، بالخصوص

حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت، اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے۔

۱۳- جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لیے مختص حواس ہیں، اسی طرح انسانوں میں ایک اور حاسّہ بھی ہے۔ جسے "حسِ واقعات" کہنا چاہیے۔ ہماری زندگی واقعاتِ گردو پیش کے مشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے، مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس قوّت سے کام لیتے ہیں، جسے اصطلاحاً حسِ واقعات سے تعبیر کیا گیا ہے!

۱۴- انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں حسِ واقعات اور اقوام کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی "دماغ یافتہ" "فلسفیانہ نظام"، جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو، انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔

۱۵- یہ ہے اس مسئلے کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ جو اس نظم کا موضوع ہے۔ اس سے نظم کی تفسیر مقصود نہیں، محض ان لوگوں کو نشان راہ بتانا مقصود ہے جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دقتوں سے آشنا نہیں۔

۱۶- رہا شاعرانہ پہلو تو شاعرانہ تخیّل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیاتِ انا کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلۂ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔

۱۷- لفظ خودی اس نظم میں بہ معنی غرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام اردو میں مستعمل ہے اور اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعیین ذات ہے۔

اب میں مختلف امور کے متعلق خود اقبال کی تحریریں پیش کروں گا تاکہ ان کا نقطۂ نگاہ واضح صورت میں سامنے آجائے اور یہی اس مقدمے کی حقیقی غرض و غایت ہے۔

توحید اور وحدۃ الوجود کا فرق

انھوں نے "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ایرانی شعرا نے وحدۃ الوجود کی تفسیر میں دل کو آماج گاہ بنایا اور اس مسئلے میں ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیاں عوام تک پہنچیں تو تمام مسلمان قومیں ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں۔ اسی مسئلے کے متعلق اقبال کی مختلف تصریحات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے وہ توحید اور وحدۃ الوجود کا فرق واضح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"صوفیہ کو توحید اور وحدۃ الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مرادف نہیں، بلکہ مقدم الذکر کا مفہوم خالص مذہبی ہے اور مؤخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کے مقابلے میں یا اس کی ضد لفظ

"کثرت" نہیں، جیسا کہ صوفیہ نے تصور کیا ہے، بلکہ اس کی ضد "شرک" ہے وحدۃ الوجود کی ضد کثرت ہے۔

"اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدۃ الوجود یا زمانۂ حال کے فلسفۂ یورپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا، وہ موحد تصور کیے گئے، حالانکہ ان کے ثابت کردہ مسئلے کا تعلق مذہب سے نہ تھا، بلکہ نظامِ عالم کی حقیقت سے تھا۔

"اسلام کی تعلیم نہایت صاف و روشن ہے یعنی عبادت کے قابل صرف ایک ذات ہے۔ باقی جو کچھ کثرت نظام عالم میں نظر آتی ہے وہ سب کی سب مخلوق ہے، گو علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کنہ اور حقیقت ایک ہی ہو۔ چونکہ صوفیہ نے فلسفے اور مذہب کے دو مختلف مسائل یعنی توحید اور وحدۃ الوجود کو ایک ہی مسئلہ سمجھ لیا، اس واسطے ان کو یہ فکر ہوئی کہ توحید ثابت کرنے کا کوئی اور طریق ہونا چاہیے، جو عقل و ادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ اس غرض کے لیے حالت سُکر ممد و معاون ہوئی۔ یہ اصل ہے مسئلہ حال و مقامات کی۔ مجھے حالت سُکر کی واقعیت سے انکار نہیں، صرف اس بات سے انکار ہے کہ جس غرض کے لیے یہ حالت پیدا کی جاتی ہے، وہ غرض اس سے مطلق پوری نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ صاحبِ حال کو ایک علمی مسئلے کی تصدیق ہو جاتی ہے، نہ کہ مذہبی مسئلے کی۔"[۱]

وحدۃ الوجود پر انتقاد اس طرح توحید اور وحدۃ الوجود کے درمیان واضح امتیاز پیدا کر کے صوفیہ کی حالتِ سُکر کی حقیقت بھی کھول کر بیان کر دی۔ پھر یہ سوال سامنے آیا کہ وحدۃ الوجود ہے کیا؟ فرماتے ہیں:

"صوفیہ نے وحدۃ الوجود کی کیفیت کو محض ایک مقام لکھا ہے، لیکن یہ سوال کسی دل میں پیدا نہ ہوا کہ آیا یہ مقام کسی حقیقت نفس الامری کو واضح کرتا ہے؟ اگر کثرت حقیقت نفس الامری ہے تو یہ کیفیتِ وحدۃ الوجود، جو صاحب حال پر وارد ہوتی ہے، محض دھوکا ہے اور مذہبی اور فلسفیانہ اعتبار سے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اگر کیفیت وحدۃ الوجود محض ایک مقام ہے اور کسی

---

[۱] رسالہ اقبال بابت اپریل ۱۹۵۷ء (صفحہ ۸۶)

حقیقت نفس الامری کا انکشاف اس سے نہیں ہوتا تو پھر اسے معقول طور سے ثابت کرنا فضول ہے، جیسا کہ محی الدین ابن عربی اور دیگر صوفیہ نے کیا ہے۔ نہ اس کے محض معلوم ہونے سے روحانی زندگی کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ قرآن کی تعلیم کے رو سے وجود فی الخارج کو ذاتِ باری سے نسبت اتحاد کی نہیں بلکہ مخلوقیت کی ہے۔ اگر قرآن کریم کی تعلیم یہ ہوتی کہ ذات باری کثرت نظام عالم میں دائر و سائر ہے تو کیفیت وحدۃ الوجود کو قلب پر وارد کر سکنا مذہبی زندگی کے لیے نہایت مفید ہوتا بلکہ مذہبی زندگی کی آخری منزل ہوتا" [۱]

اعتراف حقیقت | بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ ایک زمانے میں اقبال خود ان عقائد کے قائل تھے۔ فرماتے ہیں:

"مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے، مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح کملا، مسئلہ وحدۃ الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں سے بعض کا ذکر عبد الکریم جیلی نے اپنی کتاب "انسان کامل" میں کیا ہے۔ یہ تینوں مسائل میرے نزدیک مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ مسئلہ قدم ارواح افلاطونی ہے۔ بو علی سینا اور ابو نصر فارابی دونوں اس کے قائل تھے چنانچہ امام غزالی نے اسی وجہ سے دونوں بزرگوں کی تکفیر کی ہے۔ شیخ ابن عربی نے اس مسئلے میں اس قدر ترمیم کی کہ صلحا و کملا کے ارواح کے قدم کے قائل ہوئے مگر ظاہر ہے کہ اصول وہی ہے اور مسلمانوں میں اس مسئلے نے قبر پرستی کی بنیاد رکھی" [۲]

وحدۃ الوجود اور تنزلات ستہ | آگے چل کر فرماتے ہیں کہ تنزلات ستہ کا مسئلہ افلاطونیت جدیدہ کے بانی پلوٹائنس کا تجویز کردہ ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں افلاطونیت جدیدہ کی ایک کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا گیا تھا اور اس کا نام "الٰہیات ارسطو" رکھ دیا گیا۔ مسلمان اب تک اس کے مضمون کو "فلسفہ ارسطو" تصور کرتے ہیں؛ حالانکہ اسی کے ایک پروفیسر نے قوی دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ اس کتاب کو الٰہیات ارسطو سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ پلوٹائنس کے خیالات کا عربی ترجمہ ہے یوں مسئلہ تنزلاتِ ستہ یونانی فلسفے سے منتقل ہو کر عربی میں آیا۔ اسلامی حکماء و صوفیہ

۱؎ رسالہ اقبال بابت اپریل ۱۹۵۳ء ۲؎ رسالہ اقبال بابت ۱۹۵۳ء و صـ۹۲، ۹۳۔

نے اپنی اپنی اغراض کے مطابق اسے اصطلاحات اسلامیہ میں بیان کیا۔

"شیخ شہاب الدین مقتول نے حکمۃ الاشراق میں اس مسئلے کو یوں بیان کیا ہے کہ اسلام سے پہلے کے زرتشتی فلسفے کو بھی اس میں ملا دیا ہے اور اس زرتشتی عنصر کی تصدیق و توثیق کے لیے قرآن کی مشہور آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تلاش کی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں بہت سے صوفی حضرات اس مسئلے کے قائل ہیں اور غالباً اس وجہ سے کہ وہ اس کی تاریخ سے آگاہ نہیں۔

"مسئلہ وحدۃ الوجود گویا مسئلۂ تنزلاتِ ستّہ کی فلسفیانہ تکمیل ہے بلکہ یوں کہیے کہ عقل انسانی خود بخود تنزلاتِ ستّہ سے وحدۃ الوجود تک پہنچی ہے..... میرا مذہب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نظام عالم میں جاری و ساری نہیں بلکہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے۔ جب وہ چاہے گا، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حکماء کا مذہب تو جو کچھ ہے، اس سے بحث نہیں، رونا اس بات کا ہے کہ یہ مسئلہ اسلامی لٹریچر کا ایک غیر منفک عنصر بن گیا ہے اور اس کے ذمہ دار زیادہ تر صوفی شاعر ہیں"[1]

اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی لٹریچر تمام و کمال اس زہر سے متاثر ہے۔ چند مستثنیات ضرور ہیں۔ پنجاب کے ناظرین کو ایک پنجابی شاعر کا قول شاید زیادہ پسند آئے:

"وحید خاں ایک پنجابی شاعر تھا جو کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفہ ویدانت (ویدانت اور وحدۃ الوجود ایک ہی چیز ہیں) کا قائل ہو گیا تھا۔ اس تبدیل خیال و عقیدہ نے جو اثر اس پر کیا، اسے وہ خود بیان کرتا ہے:

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ :: شرن پڑے رگھناتھ کے سکے نہ تنکا توڑ[2]

مطلب یہ کہ ہم پٹھان کے بیٹے تھے اور ہماری یہ کیفیت تھی کہ فوجوں کے منہ موڑ دیتے تھے، مگر جب سے رگھوناتھ جی کے قدم پکڑے ہیں، یعنی جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا جاری و ساری ہے، یہ حالت ہو گئی کہ ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتے، کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال دامن گیر رہتا ہے۔"

فلسفہ اور تصوف کا اختلاط ایک مصیبت یہ تھی کہ اہلِ تصوف نے فلسفے کے مسائل کو تصوف کے مسائل سمجھ لیا تھا بلکہ تصوف کے مسائل میں بھی عموماً فلسفے کی اصطلاحات استعمال کی جاتی تھیں اور اسی وجہ سے عام

[1] رسالہ اقبال بابت ۱۹۵۵ء صفحہ ۹۵ [2] ایضاً ایضاً صفحہ ۹۶

لوگوں کو مسائل تصوف کی پیچیدگیاں سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ پیچیدگیوں کی وجہ عموماً یہ سمجھی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کو سلوک کے معاملات سمجھانا مشکل ہے کیونکہ ان کا تعلق مشاہدے سے ہے اور مشاہدے کی پوری کیفیت الفاظ میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس کی مثال یہ سمجھ لیجیے کہ کسی ایسے منظر کو لفظوں میں پیش کرنا آسان نہیں ہوتا جو کبھی دیکھا نہ گیا ہو۔ ان دیکھی شے کو دیکھی ہوئی چیزوں کی تمثیل کا سہارا لے کر ہی ایک حد تک واضح کیا جا سکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ تمثیل کی توضیح جزواً ہی ذہن نشین ہو سکے گی، تاہم میری قطعی رائے ہے کہ بیان میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ فلسفیانہ مصطلحات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اولاً فلسفیانہ مسائل کو خواہ مخواہ تصوف کے مسائل بنا لیا گیا، ثانیاً جو مسائل تصوف سے متعلق تھے انھیں بھی فلسفیانہ مصطلحات کے ذریعے سے گراں بار اور غیر الفہم بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ اقبال لکھتے ہیں:

"فلسفیانہ اور مورخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے، جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں، مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے[1]۔"

اسلام میں ہندی و یونانی خیالات | اوپر تنزلاتِ ستّہ کا ذکر آ چکا ہے۔ اقبال مولانا سراج الدین پال کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لیے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں ... خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ میں ایام سے مراد تنزلات ہیں یعنی "فی ستۃ تنزلات" کمبخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان میں "یوم" کا یہ مفہوم قطعاً نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ "تخلیق بالتنزلات" کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے مخالف ہے، اس طرح ان لوگوں نے نہایت بیدردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیے ہیں[2]۔"

"آبِ حیات" کے نام سے "زہر" | ایرانی شاعروں نے وحدۃ الوجود کی بنا پر ایک ایسا ذخیرۂ ادبیات فراہم کر دیا جس میں شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ نہایت عجیب و غریب اور بہ ظاہر دلفریب طریقوں سے کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایسا لباس پہنا دیا کہ پڑھنے اور سننے والے کے دل میں اُس کی بُرائی کا احساس تازہ ہو جائے۔ اقبال فرماتے ہیں:

"اگر اسلام افلاس کو بُرا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم

---

[1] رسالہ اقبال بابت ۱۹۵۲ء، حصہ دوم۔ [2] اقبال نامہ حصہ اول ص۴۴۔

اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں، مثلاً:

غازی ز پئے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر از وست
در روزِ قیامت این بہ او کے ماند
این کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف، مگر انصاف سے دیکھیے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ آبِ حیات پلا یا گیا ہے۔[1]

خواجہ حسن نظامی کی کوششیں وحدۃ الوجود کے متعلق اقبال کے افکار خود انھیں کے الفاظ میں پیش کر دیے گئے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم اس سلسلے میں اقبال کی مخالفت کے لیے اتنے سرگرم تھے کہ انھوں نے چند سوالات مرتب کر کے وقت کے مشائخ کے پاس بھیج دیے۔ غالباً انھیں خیال ہوگا کہ مشائخ کی طرف سے تائیدی تحریریں آجائیں گی تو اقبال کی مخالفت کو خوب تقویت پہنچے گی۔ ان سوالات میں سے بعض یہ تھے:

۱۔ کیا توحید اور وحدۃ الوجود دو جداگانہ اشیاء ہیں؟

۲۔ کیا قرآن شریف عقیدہ وحدۃ الوجود کا مخالف ہے؟[2]

توحید اور وحدۃ الوجود کی تشریح اوپر اقبال کے لفظوں میں پیش کی جا چکی ہے۔ وہ انھیں دو جداگانہ چیزیں سمجھتے تھے اور حق یہی ہے کہ دو جداگانہ چیزیں تھیں۔ باقی رہا وحدۃ الوجود کو قرآن مجید کے ذریعے سے ثابت کرنا تو خواجہ صاحب کے نہایت معتمد علیہ رفیقوں نے بھی حوصلہ افزا جواب نہ دیا۔ مثلاً اکبر الٰہ آبادی نے خواجہ صاحب کو لکھا:-

"حضرتِ اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی مگر اب وہ سنبھل کر مسئلہ وحدۃ الوجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ میں آپ کو مناسب اور محفوظ جگہ میں نہ پاؤں گا، اگر آپ قرآن مجید سے مسئلہ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنے کے لیے قلم اٹھائیں گے، علماءِ شریعت نے غالباً فرما دیا ہے کہ یہ مسئلہ جزوِ اسلام نہیں۔"[3]

اسی طرح شاہ سلیمان پھلواروی نے جواب میں لکھا:

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۲۔ [2] رسالہ اقبال بابت ۱۹۵۲ء صفحہ ۔ [3] ایضاً صفحہ ۔

"اس میں شک نہیں کہ وحدۃ الوجود ایک علمی مسئلہ ہے جسے اصطلاح میں ربط الحادث بالقدیم کہتے ہیں اور تمام کتب الٰہیات میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ اسلامی سیر و سلوک اور مشاہدۂ انوار و تجلیات سے اس کا تعلق تو ضرور ہے مگر مدارِ نجات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں"[1]

اخلاص فی العمل سے محبت

چنانچہ خواجہ صاحب کی یہ کوشش بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ حق یہ ہے کہ موصوف کا موقف سراسر غلط اور بے بنیاد تھا۔ یقیناً انھوں نے عوام کے ان جذبات کو بھڑکا کر کارِ برآری کی کوشش کی جنھیں دین یا تصوّف یا اخلاق ہی نہیں، خالص ادبیات سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ اب سرسری طور پر تصوّف کے متعلق بھی اقبال کے افکار پیش نظر رکھ لینے چاہییں۔ اوپر ایک اقتباس پیش کیا جا چکا ہے جس میں انھوں نے فرمایا کہ مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی افکار کے زیرِ اثر ہیں۔ انھیں عربی اسلام، اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے قطعاً شناسائی نہیں۔ اُن کے ادبی نصب العین بھی ایرانی ہیں اور مجلسی نصب العین بھی ایرانی۔ اقبال کی آرزو تھی کہ ان ایرانی اثرات سے اسلامی عقائد و افکار اور اعمال و اخلاق کو پاک کر دیں۔ مثنوی میں جہاں کہیں عجمیت سے احتراز اور عربیت کی طرف رجعت کا ذکر آیا ہے، وہاں مقصود ملک عجم اور اس کے باشندے نہیں، بلکہ وہی ایرانی اثرات ہیں جو اسلامی عقائد و اعمال و اخلاق پر پڑے اور خلافِ مقاصدِ اسلام تھے۔ حقیقی تصوّف سے اُنھوں نے کبھی اختلاف نہیں کیا بلکہ وہ اس تصوّف کے، جو اصل اسلام ہے، جس طرح ابتدا میں شیدائی تھے؛ آخری وقت تک شیدائی رہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"اگر تصوّف سے اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوّف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے"[2]

ظاہر و باطن

ایک اور مکتوب میں خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں کہ:

"تصوّف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ دو باب لکھ چکا ہوں؛ یعنی منصورِ حلاج تک پانچ چار باب اَور ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی علّامہ ابن جوزی کی کتاب کا وہ حصّہ بھی شائع کروں گا جو انھوں نے تصوّف پر لکھا ہے۔۔"

---

[1] رسالۂ "اقبال" بابت ۱۹۵۲ء، ص ۷۹۔ [2] "اقبال نامہ" حصّہ اوّل ص ۵۳-۵۴۔

"تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے، نہایت قابل قدر ہے کیونکہ اس کے پڑھنے سے طبیعت پر سوز و گداز کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ فلسفے کا حصہ محض بیکار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیم قرآن کے مخالف۔ اسی فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکال غیبی کے مشاہدے کی طرف کر دی اور ان کا نصب العین محض غیبی اشکال کا مشاہدہ بن گیا، حالانکہ اسلامی نقطۂ خیال سے تزکیۂ نفس کا مقصد محض ازدیاد یقین و استقامت ہے اخلاقی اور عملی اعتبار سے متصوفین اسلامیہ کی حکایات و مقولات کا مطالعہ نہایت مفید ہے، لیکن دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے ہی سے کھلتی ہے۔ آج کل زمانے کا اقتضاء یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے عملی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے حضرات صوفیہ خود کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر ہے اور تصوف باطن، لیکن اس پُر آشوب زمانے میں وہ ظاہر، جس کا باطن تصوف ہے، معرض خطر میں ہے۔ اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔"[1]

مذہب کا مقصود حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ قوم کی عملی قوت کو زیادہ سے زیادہ پختہ و استوار رکھنا چاہتے تھے اور ہر اس شے کو مضر سمجھتے تھے، جو اس پختگی اور استواری میں خلل انداز ہو۔ افسوس کہ جس زمانے میں "اسرارِ خودی" لکھی گئی، اس زمانے کا تصوف بالعموم عملی قوت میں ضعف پیدا کرنے کا موجب تھا اور آج حالت غالباً اور بھی پریشان کن نظر آتی ہے۔ اقبالؔ کس درد اور سوز سے فرماتے ہیں کہ:

"مذہب کا مقصود عمل ہے نہ کہ انسان کے عقلی اور دماغی تقاضوں کو پورا کرنا اسی واسطے قرآن شریف کہتا ہے: وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ اگر مذہب کا مقصود عقلی تقاضوں کو پورا کرنا ہو بھی، جیسا کہ ہنود کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے، تو زمانۂ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کو نظرانداز کرنا چاہیے۔ اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی، جو اپنی عملی روایات پر قائم رہ سکے گی۔"[2]

اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

(۱) مکاتیب اقبال حصہ ۲ ص ۵۰ (۲) ایضاً ص ۵۰

متصوفانہ شاعری یقیناً اقبالؔ کے دل میں وحدۃ الوجود اور اس کے داعیوں کے متعلق اچھا خیال نہ تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے، جس نے "لمعات" میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظم کیا ہے (جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوا الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ اس پر میں انشاء اللہ مفصل لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے)۔"

انھیں یقین تھا کہ تصوف کی پوری شاعری مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے دور میں پیدا ہوئی فرماتے ہیں:

"جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اُس شکست کو جو انھیں تنازع البقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ۱؎"

اقبالؔ کا مقام ان تمام ارشادات سے روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے کہ اقبالؔ اسلام کی درخشاں مشعل اُٹھائے ہوئے قوم کو زندگی کے کس راستے پر لگا رہے تھے۔ دنیا نے انھیں شاعر سمجھا، بہت بڑا اور حکیم شاعر، جو ایک خاص پیغام بذریعہ الشعر دیتا رہا، لیکن یہ احساس آج تک نہ کیا جا سکا کہ اُن کے حقیقی کام کا دائرہ کس درجہ بنیادی، کتنا وسیع اور کس قدر دور رس تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبالؔ کے براہ راست مخاطب مسلمان تھے، لیکن اس کا پیغام پورے عالمِ انسانیت کے لیے تھا اور وہ مسلمانوں کو بھی اُسی راہِ عمل پر پختہ و استوار کر دینا چاہتا تھا جو خدمتِ انسانیت کے لیے اسلام نے پیش کی تھی۔ اقبالؔ کا مقام اتنا بلند تھا کہ ہم لوگ آج تک اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ یقیناً قدرت صدیوں کے بعد ایسے انسانوں کو دنیا میں بھیجتی ہے جو ماضی اور حال کی ظلمتوں کو چیر کر مستقبل کو صاف صاف ہر شخص کے سامنے روشن کر دیتے ہیں۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ قرآن مجید کی شان ہے۔ رسول اللہ صلعم کے اتباع میں قرآن مجید کی صحیح خدمت انجام دینے والے بھی حق کو باطل سے، کھرے کو کھوٹے سے، نیک کو بد سے اور راستی کو کجی سے اسی طرح الگ کر دیتے ہیں کہ کسی کے لیے اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ باقی رہے وہ لوگ جو سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں، پھر بھی نیک و بد میں تمیز نہیں کرتے یا نہیں کرنا چاہتے تو اُن کے لیے قرآن مجید پہلے ہی فرما چکا ہے کہ اُن کے پاس کان ہیں، مگر نہیں سنتے۔ آنکھیں ہیں، مگر نہیں دیکھتے۔

۱؎ اقبال نامہ حصہ اول صہ ۵۴

دل ہیں، مگر ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ چوپائے ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر گمراہ۔

ایک طعنے کا جواب

بہرحال اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اقبالؒ کو حقیقی تصوف سے نہ محض اختلاف نہ تھا بلکہ وہ اس کے سرگرم حامی تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے خواہ مخواہ اخباروں میں مشہور کر دیا کہ وہ صوفیۂ کرام سے بدظن ہیں اور انھیں اپنا موقف واضح کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مولانا اکبرؒ کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کون سا تصوف میرے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ نئی بات نہیں۔ حضرت علاء الدولہؒ سمنانی لکھ چکے ہیں، حضرت جنیدؒ بغدادی لکھ چکے ہیں۔ میں نے تو محی الدین (ابن عربی) اور منصور حلاج کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے، جو حضرت سمنانیؒ اور جنیدؒ نے ان دونوں بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ ہاں عقائد و خیالات سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے۔ اگر اسی کا نام مادیت ہے تو قسم بہ خدائے لایزال مجھ سے بڑھ کر مادہ پرست دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔"[1]

قومی زندگی کے لیے کیسا ادب چاہیے

دیکھیے، کتنی صاف اور واضح بات کہی۔ یہ تصوف کی مخالفت نہ تھی بلکہ ان بدعتوں کی مخالفت تھی، جو مختلف بلند نام اصحاب کے انتساب سے تصوف اور دین میں داخل ہو گئی تھیں، حالانکہ انھیں نہ تصوف سے کوئی علاقہ تھا، نہ دین سے۔ پھر اقبالؒ کی آرزو تھی کہ قوم از سر نو سربلند ہو۔ وہ ایسی ادبیات کے خواہاں تھے، جو طبیعتوں میں ہمت، جوانمردی اور عزم کار پیدا کریں؛ عجمی تصوف نے ایسا ادبی ذخیرہ مہیا کر دیا تھا، جو طبیعتوں کو پست کرنے والا تھا۔ اقبالؒ خود لکھتے ہیں:

> "عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن پیدا ہوتا ہے، مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔ پیسیمسٹک لٹریچر (قنوطی ادب) کبھی زندہ نہیں رہ سکا۔ قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا اپٹیمسٹک (رجائی) ہونا ضروری ہے۔"[2]

خواجہ حافظ

میرے تاثر کے مطابق "اسرار خودی" کے خلاف ہنگامہ پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں خواجہ حافظ کے متعلق اچھی رائے ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ خواجہ حافظ کو اولیا میں شمار کر لیا گیا تھا اور عام لوگوں

---

[1] اقبال نامہ، حصہ دوم ص ۵۵ [2] ایضاً ایضاً ص ۵۵ [3] ایضاً ایضاً ص ۵۵، ۵۶

کا عقیدہ یہی ہو گیا تھا کہ وہ بڑے بلند پایہ اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ انھیں شاعر سے کہیں زیادہ پارسا مانا جاتا تھا اور یہ معاملہ انھیں تک محدود نہ تھا بلکہ اکثر شاعر، جن کی کتابیں یہاں کے نصاب میں شامل رہیں، یہی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ حافظ کے اشعار شعرا سے کہیں زیادہ صوفیہ کی مجالس میں پڑھے جاتے تھے اور تصریف و تاویل کا جیسا عمل ان کے دیوان پر جاری ہوا، اس کی مثال شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے، حالانکہ خواجہ موصوف اصلاً شاعر تھے اور ان کے ہاں بھی وہی شراب جا بجا استعمال ہوئی، جو مرزا غالب، قاآنی یا دوسرے فارسی اور اردو شعرا کے ہاں مستعمل رہی۔ اقبال خواجہ حافظ کو بہت اچھا شاعر مانتے تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ:

از تخیل جنتے پیدا کند

اس سے بڑھ کر کسی شاعر کی تعریف میں کیا کہا جا سکتا تھا، لیکن اقبال جس نصب العین کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے تھے، خواجہ حافظ کا دیوان اس پر بہت بری طرح اثر انداز ہوتا تھا یعنی وہ ایسا ادب مہیا کرتا تھا جو قوم کی ہمت اور حوصلے کو پست کرے، اس کی عملی قوت کو کھا جائے اور اسے ناکارہ محض بنا دے۔ خواجہ حافظ واقعی بہت بڑے بزرگ بھی ہوتے تو ان کے دیوان کا یہ مضر اثر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور یقیناً قوم کی ترقی و برتری کے مقابلے میں خواجہ حافظ جیسے ہزاروں بزرگوں کو بھی بے تامل قربان کیا جا سکتا تھا۔ اقبال نے حافظ کی تحقیر کے لیے نہیں بلکہ قوم کی سربلندی کے لیے ان کے کلام سے گریز کی تلقین کی۔ یہ پہلو کسی خاص تشریح کا محتاج نہ تھا، لیکن رسم و عادت کے پجاری اس پر مشتعل ہو گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ خواجہ موصوف کے کلام سے گریز کی دعوت دے کر اقبال نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ نظیری نیشاپوری نے کتنی عمدہ بات کہی ہے:

خلافِ رسم دریں عہد خرقِ عادت داں
کہ کار ہائے چنیں از شمار بوالعجبیست

خواجہ حسن نظامی، مولانا اکبر الٰہ آبادی، پیرزادہ مظفر احمد فضلی، حکیم فیروز طغرائی، ملک محمد کاشمیری، ذوقی شاہ اور خدا جانے کون کون سے بزرگ تھے، جنھوں نے اس مسئلے میں اقبال کی مخالفت کو اپنا دینی اور قومی نصب العین قرار دے لیا اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کسی کا بھی نقطۂ نگاہ درست نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم صرف خواجہ حافظ، وحدۃ الوجود اور خودی کا نام لے کر خود بھی پریشان ہو رہے تھے اور دوسروں کو بھی پریشان کر رہے تھے۔ مولانا اکبر الٰہ آبادی نے سرے سے مثنوی پڑھی ہی نہ تھی اور دوسروں کی ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو گئے تھے۔ بالکل یہی کیفیت باقی اصحاب کی تھی۔ میں ان کے متعلق موقع پر ذرا تفصیل سے ذکر کروں گا۔

اقبال کا موقف پہلے خواجہ حافظ کے مسئلے میں اقبال کا نقطۂ نگاہ بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے جو انھوں نے مختلف صورتوں میں بار بار پیش کیا۔ مثلاً وہ مولانا اکبر الٰہ آبادی کو لکھتے ہیں:

"میں نے خواجہ حافظؔ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظؔ پر بالکل اَور نوعیت کا ہے۔ "اسرارِ خودی" میں جو کچھ لکھا گیا، وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی، جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر (رائج) ہے ۔ ۔ ۔ خواجہ حافظؔ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا، نہ ان کی شخصیت سے۔ نہ اُن اشعار میں "مے" سے مراد وہ مے ہے جو لوگ بوتلوں میں پیتے ہیں، بلکہ اس سے وہ حالتِ سُکر مراد ہے جو حافظؔ کے کلام سے بہ حیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ حافظؔ ولی اور عارف تصوّر کیے گئے ہیں، اس واسطے ان کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل ہی نظر انداز کر دی اور میرے ریمارک تصوف اور ولایت پر حملے کے مرادف سمجھے گئے۔"[1]

ادبی نصب العین کی تشریح پھر حافظ محمد اسلم جے راج پوری کو لکھتے ہیں:

"خواجہ حافظؔ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے، ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا، خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا، مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن حُسن ہے، خواہ اس کے نتائج مفید ہوں یا مُضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔"[2]

حالتِ سکر اسلامی نہیں انھوں نے اُس زمانے میں متعدد مقالات مرتّب کیے تھے، جو "وکیل" امرتسر یا بعض دوسرے جرائد و رسائل میں شائع ہوئے۔ ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

"میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ خواجہ شیرازؔ محض ایک شاعر ہیں اور ان کے کلام سے جو صوفیانہ حقائق اخذ کیے گئے ہیں، وہ بعد کے لوگوں کا کام ہے، مگر چونکہ عام طور پر انھیں صوفی اور مجذوب کامل سمجھا گیا ہے، اس واسطے میں نے ان کی تنقید ہر دو اعتبار سے کی ہے یعنی بہ حیثیتِ صوفی اور بہ حیثیتِ شاعر۔ بہ حیثیت صوفی ہونے کے ان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں (بذریعہ اپنے اشعار کے) وہ حالت پیدا کر

[1] "اقبال نامہ" حصۂ دوم صفحہ ۵۔ [2] "اقبال نامہ" حصۂ اول صفحہ ۵۔

جسے تصوّف کی اصطلاح میں حالتِ سُکر کہتے ہیں۔ ان کے صوفی شارحین نے صہبا و شراب سے یہی مراد لی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا سُکر کی حالت اسلامی تعلیم کا منشا ہے؟ رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک مسلمان قلب کی مستقل کیفیت بیداری ہے نہ کہ خواب یا سُکر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں تو کوئی مجذوب نظر نہیں آتا بلکہ ابتدائی اسلامی لٹریچر میں مجذوب کی اصطلاح بھی مثل بعض دیگر اصطلاحات صوفیہ کے نہیں ملتی۔

دوسرا سوال جو حالتِ سُکر کے متعلق پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ آیا یہ حالت زندگی کے اغراض کے منافی ہے یا ممد؟ کسی روز فرصت میں یہ ثابت کروں گا کہ علم الٰہیات کے اعتبار سے یہ حالت زندگی کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو لوگ اس حالت کو مستقل بنا لیتے ہیں، وہ کشمکش حیات کے بالکل قابل نہیں رہتے اور ملی و قومی اعتبار سے بھی ایسے افراد کا وجود مضرت رساں ہے۔ خاص مذہبی اعتبار سے بھی اس کے مضر ہونے کی مثالیں اسلامی تاریخ میں بہ کثرت ملتی ہیں۔"[1]

حافظ کی ساحری اور دعوتِ مرگ اس مضمون میں بھی اقبال نے اعتراف کیا ہے کہ حافظ بلند پایہ شاعر تھے۔ جو مقصد دوسرے شعرا پوری غزل سے بھی حاصل نہیں کر سکتے، حافظ ایک شعر سے حاصل کر لیتے ہیں، کیونکہ انسانی قلب کے راز کو پوری طرح سمجھتے ہیں، لیکن اصل سوال یہ ہے کہ انفرادی اور قومی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کون سا معیار ہونا چاہیے؟ اقبال کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے اشعار اغراضِ زندگی میں معاون ہیں تو وہ اچھا شاعر ہے۔ اگر وہ اشعار اغراضِ زندگی کے منافی ہیں یا اُن سے زندگی کی قوت میں کمزوری اور پستی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے تو وہ شاعر قومی اعتبار سے مضر ہے۔ ہر شاعر اپنے گرد و پیش کی اشیا و عقائد، خیالات اور مقاصد کو حسین و جمیل بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ قلوب ان کی طرف کھچ آئیں۔ ان معنی میں ہر شاعر جادوگر ہے:

"خواجہ حافظ اس اعتبار سے سب سے بڑے ساحر ہیں، مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے مقصد یا حالت یا خیال کو محبوب بناتے ہیں . . . وہ ایک ایسی کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراضِ زندگی کے منافی ہے بلکہ زندگی کے

---

[1] رسالہ 'اقبال' بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۹۶، ۹۵۔

لیے مضر ہے۔ جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ حالت ان افراد و اقوام کے لیے جو زمان و مکان کی اس دنیا میں رہتے ہیں، نہایت ہی خطرناک ہے۔ حافظ کی دعوت موت کی طرف ہے جسے وہ اپنے کمالِ فن سے شیریں بنا دیتے ہیں تاکہ مرنے والے کو دکھ کا احساس نہ ہو۔

ناوک اندازے کہ تاب از دل برد
نادکِ او مرگ را شیریں کند[1]

معیار عمومی حیثیت ہے | جیسا کہ اقبال بار بار کہہ چکے ہیں، انھوں نے نہ تو حافظ کے عام کردار پر کوئی حملہ کیا، نہ انھیں شراب نوش بتایا بلکہ ان کی نجی زندگی کے متعلق کچھ بھی نہ کہا۔ صرف اس نصب العین کو بُرا بتایا، جو صوفی شاعر ہونے کی حیثیت میں ان کے (حافظ کے) پیش نظر تھا اور جہاں جہاں اقبال کے اشعار میں حافظ کی صہباگساری، شراب نوشی یا گوسفندی کا ذکر آیا تھا، اس سے مقصود فقط وہ حالتِ سُکر تھی جو حافظ کے دیوان سے پیدا ہوتی تھی اور حافظ کو صرف اس لیے منتخب کیا کہ سُکر آور ادب پیدا کرنے والے گروہ میں وہ سب سے ممتاز تھے، گویا اپنے طبقے کے نمائندے تھے۔ نیز ان کا دیوان ہر حلقے میں پڑھا جاتا تھا۔ بلکہ اس سے فال لی جاتی تھی۔

حکیم فیروز طغرائی نے ایک چھوٹا سا رسالہ "لسان الغیب" کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں حافظ کے ایسے اشعار پیش کیے تھے، جو جدّ و جہد اور تحفظ ذاتی کے حامل تھے۔ بالکل یہی کام شیخ مشیر حسین قدوائی نے انجام دیا، جو اس وقت انگلستان میں تھے۔ انھوں نے ایک مضمون بعض اخباروں اور رسالوں میں چھپوایا تھا۔ اور اس مضمون میں دیوان حافظ سے وہ اشعار بہ طورِ خاص نقل کیے تھے جو خودی اور خودداری کی تائید کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اقبال کا جواب نہ تھا کیونکہ دنیا کے کسی شاعر کا کلام لے لیجیے، تلاش سے اس میں ہر قسم کے مضامین مل جائیں گے۔ سوال منتخب اشعار کا نہ تھا، بلکہ کلام کی عمومی حیثیت اور تاثر کا تھا۔ اقبال کیا خوب لکھتے ہیں:

"میری تنقید پر رائے زنی کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ حافظ شیرازی مسلمان تھے اور ان کے رگ و ریشہ میں اسلام تھا۔ وجودی تصوّف نے ان کے نقطۂ نظر کو کتنا ہی تبدیل کیوں نہ کر دیا ہو، ممکن نہیں کہ کبھی صحو سُکر پر غالب نہ آتا ہو اور وہ ایسے اشعار نہ لکھتے ہوں۔۔۔ غور کریں گے تو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ بہ حیثیت مجموعی خواجہ حافظ کا اخلاقی نصب العین حالتِ سُکر ہے نہ کہ حالتِ صحو اور کسی شاعر کی تنقید کے لیے اس کے عام نصب العین ہی کو ملحوظ

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۹۶۔ [2] ایضاً صفحہ ۹۵۔

رکھا جاتا ہے۔

فوق کو جواب حافظ کے سلسلے میں اقبال پر اعتراض کرنے والوں میں ایک منشی محمد دین فوق مرحوم بھی تھے، جو اقبال کے عزیز دوست تھے۔ کچھ مدت بعد منشی صاحب کی کتاب "وجدانی نشتر" اقبال کے پاس پہنچی تو اس میں ایک قصہ درج تھا کہ عالمگیر نے طوائفوں کو نکاح کر لینے کا حکم دے دیا، ساتھ ہی کہہ دیا کہ مقررہ مدت کے اندر اس حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو سب طوائفوں کو کشتی میں بھر کر دریا بُرد کر دوں گا۔ ایک حسین طوائف شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے سلام کو جایا کرتی تھی۔ بادشاہ کا حکم مل جانے کے بعد وہ آخری سلام کے لیے حاضر ہوئی۔ شیخ نے حقیقت حال دریافت فرمائی۔ طوائف نے بادشاہ کا حکم سنا دیا۔ شیخ نے فرمایا: حافظ کا حسب ذیل شعر یاد کر لو:-

در کوئے نیک نامی مارا گزر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تمہیں دریا کی طرف لے چلیں تو بہ آواز بلند یہی شعر پڑھتی ہوئی جانا۔ طوائفوں نے اسی پر عمل کیا۔ بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی تو بے تاب ہو گیا اور حکم دے دیا کہ سب کو چھوڑ دیا جائے۔

یہاں سوال اس قصے کی تاریخی حیثیت کا نہیں، اقبال اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"منشی صاحب کے نزدیک جو حافظ کا حسن ہے، میرے نزدیک وہی اس کا قبح ہے"[1]

"مسئلۂ تقدیر کی ایک غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو جو آئین حقۂ شریعۂ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور زنانیات کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو اس بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا، قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانین اسلامیہ کی تعمیل کرانے کی ہمت ہی نہ رہی۔"[2]

غلط بیانات خواجہ حسن نظامی نے ایک عجیب حرکت یہ کی کہ حافظ کے متعلق اقبال کے اشعار کا ترجمہ اردو میں کیا تو اسے خلاف حقیقت شکل دے دی اور ایسی تعبیرات شامل کر دیں جن کے لیے اصل میں کوئی بھی گنجائش نہ تھی۔ مثلاً اقبال نے حافظ کے متعلق لکھا تھا:

در محبت پیر نے فرہاد بود | بر لبِ او رشتۂ فریاد بود
تخم نخل آہ در کہسار کاشت | طاقتِ پیکار با خسرو نداشت

دوسرے شعر کا ترجمہ خواجہ صاحب نے یہ کیا: "وہ آہوں کے درخت جنگل میں بوتا تھا۔ اس میں بادشاہوں

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۷ [2] ایضاً صفحہ ۹۹

سے لڑنے کی طاقت نہ تھی"۔ حالانکہ خسرو کا لفظی ترجمہ "بادشاہوں" نہیں "بادشاہ" ہونا چاہیے تھا اور جس خسرو کو فرہاد سے تعلق تھا، وہ ایک مختص شخص تھا اور اس کے نام کا ترجمہ بالکل غیر مناسب تھا۔

دیباچے میں جس کے اقتباسات اوپر دیے جا چکے ہیں، اقبال نے یہ بھی کہا تھا کہ حکمائے انگلستان کی تحریروں سے مستفید ہو کر مسلمانوں کو اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس مفہوم کو یوں پیش کیا:

۱۔ "اہلِ مشرق اور مسلمان یورپ کے فلاسفروں کی پیروی کریں اور اپنے قدیمی عقائد بدل دیں؟

۲۔ اہلِ مغرب خصوصاً جرمنی اور انگلستان کے فلاسفروں کی قصیدہ خوانی کر کے مشرق والوں علی الخصوص مسلمانوں کو ہدایت ہوئی ہے کہ اپنی قدیمی روایات پر نظرِ ثانی کریں اور ان یورپین رہنماؤں کی تعلیم سے اپنے دل و دماغ کو روشنی پہنچائیں"۔

ظاہر ہے کہ یہ اقبال کے نقطۂ نگاہ کی کھلی ہوئی تحریف تھی۔ پھر عجیب امر یہ ہے کہ جب بعض مسلمان صوفیہ نے افلاطونیت جدیدہ کو اپنا لیا گیا جو دلوں کو تحت پست کرنے والی اور اخلاقی نقطۂ خیال سے نہایت مضر تعلیم تھی، تو حکمائے انگلستان یا حکمائے جرمنی کے فلسفے کی روشنی میں اپنی فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کیوں گناہ ہوئی؛ نیز ظاہر ہے کہ فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کرنا تبدیلیِ عقائد کو مستلزم نہیں۔

مولانا اکبر الٰہ آبادی | اقبال نے انھیں لکھا تھا کہ آپ میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔ بحث علمی انداز میں ہونی چاہیے یعنی مقصود یہ ہو کہ مولف قائل ہو کر راہِ راست پر آ جائے، یہ نہ ہو کہ اسے بدنام کیا جائے[1]۔ مولانا اکبر یقیناً ابتدا میں خواجہ حسن نظامی کی تحریرات کے زیرِ اثر "اسرارِ خودی" سے بدظن ہو گئے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے پوری "اسرارِ خودی" پڑھی بھی نہ تھی۔ چنانچہ اقبال ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کے ایک مکتوب میں مولانا اکبر کو لکھتے ہیں:

"مجھے آپ کے خطوط سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے مثنوی "اسرارِ خودی" کے صرف وہی اشعار دیکھے ہیں جو حافظ کے متعلق لکھے گئے تھے، باقی اشعار پر نظر شاید نہیں فرمائی۔ کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی تاکہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے"[2]۔

عجیب امر یہ ہے کہ اکبر کے اپنے خیالات بھی اصولاً اقبال سے مختلف نہ تھے۔ چنانچہ وہ خود ایک نظم میں مسلمانوں کے متعلق فرماتے ہیں:-

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم صفحہ ۵۔ [2] ایضاً ایضاً ص ۵۵

ان میں باقی ہے کہاں خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

خالدؓ جانباز یقیناً اسلامی قوتِ عمل اور ہمت و شجاعت کا بڑا قابلِ قدر پیکر تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلے میں جس رنگ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ واضح طور پر عمل اور ہمت و شجاعت کی نفی تھا۔ اقبال کے بیان کے مطابق مولانا اکبر نے مثنوی کے اشعار اور اس کے دینی مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے پرائیویٹ خط میں فرمایا تھا۔

"آپ کے (اقبال کے) ہیچ نظر جواہر ہے، اگر میں اس کی قدر نہ کروں تو مسلمان نہیں۔"

ذوقی شاہ، فضلی اور ملک محمد: اختلاف کرنے والوں میں سے حکیم فیروز طغرائی، اکبر الٰہ آبادی، خواجہ حسن نظامی اور شیخ مشیر حسین قدوائی کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے علاوہ ذوقی شاہ، پیرزادہ مظفر احمد فضلی اور ملک محمد کاشمیری نے بھی مخالفت میں سرگرم حصہ لیا تھا، لیکن ان سب کے اختلاف کی حیثیت "سوال از آسماں اور جواب از ریسماں" کے مترادف تھی یعنی اقبال نے کچھ کہا تھا اور ان حضرات نے کچھ اور ہی فرمایا۔ ان میں سے پیرزادہ مظفر احمد صاحب فضلی ڈپٹی کلکٹر اتھارہ کو فارسی شاعری میں بلند حیثیت حاصل تھی۔ ان کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ "گلبانگ سخن" کے نام سے ۱۹۱۸ء میں چھپ چکا تھا۔ انھوں نے "رازِ بیخودی" کے نام سے ایک مثنوی شائع کی، جس میں اصل بحث کو بالکل نظر انداز کر دیا، پوری مثنوی افلاطون اور حافظ کی مدح اور اقبال کی قدح کے لیے وقف کر دی۔ شعر اچھے ہیں، لیکن مضمون بے سروپا اور اصل مبحث سے یک قلم بے تعلق۔ یہ سب کچھ شائع ہوا اور ناپید ہو گیا۔ آج ان چیزوں کو تلاش کیا جائے تو ایک بھی شاید ہی مل سکے۔ اقبال کی "اسرارِ خودی" اور باقی تمام چیزیں زمانے کی آنکھوں کے لیے کحل الجواہر بنی ہوئی ہیں اور قرآن مجید کے اس اصول کی تازہ شہادت پیش کر رہی ہیں:

وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ (سورۂ رعد) (اور جو چیز انسان کے لیے نفع بخش تھی، وہ زمین میں باقی رہ گئی)۔

مسئلۂ انتساب: اعتراضات کے سلسلے میں صرف ایک چیز باقی رہ گئی یعنی "اسرارِ خودی" کا انتساب "اسرارِ خودی" سر علی امام سے منسوب کی گئی تھی، جو پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے، ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے اور بعد میں دولت آصفیہ کے صدرِ اعظم بھی ہو گئے تھے۔ وہ اقبال کے عزیز دوست تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے کہا کہ مثنوی کو سر علی امام سے نامزد کر کے اقبال نے اپنی خودی پر چوٹ لگائی ہے۔ اقبال نے اس کے جواب میں فرمایا کہ خواجہ صاحب شاید انتساب کے معنی نہیں سمجھتے۔ ان کی خدمت میں عرض ہے:

"اس سے مراد محض اظہارِ محبت و اخلاص ہے، جو دو آدمیوں کے ذاتی تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ میں نے ان اشعار میں ڈیڈیکیشن (انتساب) کی وجہ صاف

۱؎ رسالہ اقبال بابت اپریل ۱۹۵۳ء، ص ۵۶۔

لکھ دی ہے۔ آپ ان اشعار کو غور سے پڑھتے تو خود بخود یہ بات معلوم ہو جاتی ہے[1]

سر علی امام کے ساتھ اقبال کے تعلقات پہلے سے دوستانہ تھے، چنانچہ ایک مرتبہ لوگوں نے غالباً مزاحاً مولانا گرامی کو دھمکی دی کہ آپ کی پنشن بند کرادی جائے گی۔ اقبال کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو خان محمد نیاز الدین خان کو لکھا کہ یہ اچھا نسخہ ہاتھ آیا ہے جناب مولانا گرامی کو لاہور بلانے کے لیے انشاء اللہ یہی نسخہ استعمال کیا جائے گا:

"ان کو (مولانا گرامی کو) معلوم ہو گا، سید علی امام وہاں (حیدرآباد) بہ حیثیت صدر اعظم پہنچ گئے ہیں۔ اگر وہ (گرامی) لاہور نہ آئے تو میں انہیں (سر علی امام کو) ضرور لکھوں گا کہ گرامی کی پنشن بند کی جائے اور ان کی عرضیوں کا کوئی جواب نہ دیا جائے"[2]

اکبر کی رائے بھی سر علی امام کے متعلق قابلِ ملاحظہ ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں کہ علی امام سے ملیں تو آداب عرض کر دیں۔ بہ صد خلوص ملاقات:

"بعض حکماء کا خیال ہے کہ نیکی اور عقلمندی ایک ہی چیز ہے۔ سر علی امام کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ بہت شریف نفس شخص ہیں"[3]

"اسرار خودی" کے دوسرے ایڈیشن میں اقبال نے جہاں اور ترمیمیں کیں، وہاں مندرجہ ذیل ترمیمیں بھی کر دیں، جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ خواجہ حافظ کے متعلق اشعار حذف کر دیے اور ان کی جگہ "حقیقت شعر اور اصلاح ادبیات اسلامیہ" کے زیر عنوان نئے شعر شامل کر دیے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اقبال کی رائے خواجہ حافظ کے متعلق بدل گئی تھی، وجہ یہ تھی کہ جس مقصد کے پیش نظر وہ اشعار لکھے گئے تھے، لوگوں کی غلط فہمی کی بنا پر وہ مقصد فوت ہو رہا تھا اور مصلح کی شان یہی ہوتی ہے کہ اصل مقصد یعنی اصلاح کو تمام دوسری مصلحتوں پر مقدم رکھے۔ نیز حافظ کے متعلق پہلا نقطۂ نگاہ باقی نہیں رہا تھا۔

۲۔ دیباچہ حذف کر دیا۔

۳۔ انتساب کے تمام اشعار مثنوی سے الگ کر دیے۔

چنانچہ وہ مولانا اکبر کو لکھتے ہیں:

"اسرار خودی" میں حافظ پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے خارج کر کے اور اشعار لکھے

---

[1] رسالہ اقبال بابت اکتوبر ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۵۔ [2] مکاتیب اقبال صفحہ ۱۱۔ [3] مکتوب اکبر بنام خواجہ حسن نظامی صفحہ ۲۰۔

ہیں . . . ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور میرا اصل مطلب واضح ہو جائے گا۔[1]

مولانا اسلم جے راج پوری کو بھی یہی لکھا اور فرمایا کہ حافظ والے اشعار کی جگہ اُس لٹریری اصول کی تشریح کی ہے، جسے میں صحیح سمجھتا ہوں:۔

"دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا، جیسا کہ مجھے بعض احباب کے خطوط سے اور دیگر تحریروں سے معلوم ہوا، جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔"[2]

رموزِ بیخودی "اسرارِ خودی" کے ساتھ ہی اقبال نے دوسرے حصے کی ترتیب شروع کر دی تھی، چنانچہ انھوں نے اکتوبر ۱۹۱۵ء میں اپنے دوست منشی سراج الدین کو لکھا تھا کہ مجھے پوری فرصت ہوتی تو "اسرارِ خودی" کا دوسرا حصہ بھی تیار ہو جاتا، جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔[3] مولانا سراج الدین پال کے نام ایک مکتوب جولائی ۱۹۱۶ء میں تحریر فرمایا کہ میں مثنوی "اسرارِ خودی" کا دوسرا حصہ لکھ رہا ہوں، اس میں بعض مزید باتوں پر روشنی ڈالوں گا۔[4] پھر اسی مکتوب میں یہ بتایا کہ زیرِ تصنیف حصے میں شعر کا نصب العین واضح کریں گے۔[5] "مکاتیب اقبال" میں بھی "اسرارِ خودی" کے دوسرے حصے کی ترتیب کا ذکر ہے[6] بلکہ ایک مکتوب میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کا نام "رموزِ بیخودی" ہوگا۔[7] مولوی الف دین وکیل کیمبل پور کو ۹ جنوری ۱۹۱۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "اسرارِ خودی" کے دوسرے حصے کے قریباً پانسو شعر لکھے گئے بلکہ ایسے اشعار انھیں بطور نمونہ بھیج دیے تھے۔[8] ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں کہ میں تو مثنوی کا دوسرا حصہ ختم کر چکا تھا، مگر معلوم ہوا کہ ابھی دو تین ضروری مضمون باقی ہیں یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیاتِ ملت میں کیا ہے:

"ایسے ایسے مطالب ذہن میں آئے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لیے موجبِ حیرت و مسرت ہوں گے، کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، ملتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے سکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے، وہ محض بودے اور سست تاروں سے بنا ہوا ایک ضعیف جھونپڑا ہے۔ قومیت کے اصول حقہ صرف اسلام نے بتائے ہیں، جن کی پختگی اور پائیداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔"[9]

ایک اور تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ "اسرارِ خودی" کے دوسرے حصے سے پہلے حصے پر بھی کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی تشریحات جو پہلے حصے کے اشعار کی جا رہی ہیں، خود بخود غلط ہو جائیں گی:

---

[1] اقبال نامہ، حصہ دوم صـ ۵۶ ۔ [2] ایضاً حصہ اول صـ ۵ ۔ [3] اقبال نامہ حصہ اول صـ ۴۶ [4] ایضاً ایضاً صـ ۳۵ [5] ایضاً ایضاً صـ ۴۶ ۔ غالباً یہی مطالب تھے جو "اسرارِ خودی" کے دوسرے ایڈیشن میں "حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ" کے زیرِ عنوان مرتب ہوئے۔ اور حافظ والے اشعار کی جگہ انھیں رکھا گیا۔ [6] صـ ۶ ؛ [7] مکاتیب اقبال صـ ۷ ؛ [8] اقبال نامہ حصہ اول صـ ۲۰۱-۲۰۲ ؛ [9] مکاتیب اقبال صـ ۹ ۔

"یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خود ستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں
آج تک نہیں لکھی گئی ہے"[1]

اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ پہلی عالمی جنگ اس زمانے میں زوروں پر تھی اور حکومت نے اس کی وجہ سے ہر چھپنے والی چیز کے لیے سنسر سے منظوری لینی ضروری قرار دی تھی، چنانچہ "رموزِ بیخودی" بھی سنسر کے محکمے میں بھیجی گئی اور ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو اس محکمے سے واپس ملی[2]

مثنوی کا تیسرا حصہ "رموزِ بیخودی" کے پہلے ایڈیشن میں بھی ایک مختصر سا دیباچہ لکھا تھا۔ اس میں فرماتے ہیں:

"جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت، دفعِ مضرت، تعیینِ عمل و ذوقِ حقائقِ عالیہ،
احساسِ نفس کے تدریجی نشو و نما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے
اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بہ الفاظِ دیگر "قومی انا" کی
حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ
قوم کسی آئینِ مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی
اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے"[3]

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوّتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں یہ تسلسل قومی تاریخ کی حفاظت پر موقوف ہے۔ گویا قومی تاریخ قومی زندگی کے لیے بمنزلہ قوّتِ حافظہ کے ہے:

"میں نے اسی نکتے کو مدِ نظر رکھ کر ملّتِ اسلامیہ کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے مختلف
اجزا و عناصر پر نظر ڈالی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح
ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے"[4]

باقی رہا یہ سوال کہ ایسی مختص الہیئت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اس کی زندگی کو مضبوط بنانے کے عملی اصول کیا ہیں تو اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے:

"اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا"[5]

گویا ابتدا میں مثنوی کا تیسرا حصہ لکھنا منظور تھا، مگر بعد میں رائے بدل گئی اور انھوں نے اپنے افکارِ عالیہ دوسری کتابوں میں پیش کر دیے۔ اگر تیسرا حصہ لکھا جاتا تو اس میں ملّتِ اسلامیہ کے انحطاط کو ختم کر کے اس کی زندگی کو زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کے عملی اصول تفصیل سے پیش کیے جاتے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں وہ اصول صرف مجمل طریق پر بیان ہوئے ہیں۔

---

[1] "مکاتیبِ اقبال" ص۔ [2] ایضاً ص۔ [3] دیباچہ "رموزِ بیخودی" پہلا صفحہ [4] دیباچہ "رموزِ بیخودی" دوسرا صفحہ [5] ایضاً ایضاً۔

فن برائے فن | بعد ازاں اقبالؔ نے "اسرار و رموز" کو اکٹھا کر کے ایک کتاب کی شکل میں شائع کر دیا۔ "اسرار" کی حمایت میں بہت سے اشخاص نے قلمی جہاد میں حصّہ لیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں ایک زبردست مضمون بہ زبان انگریزی دونوں مثنویوں پر لکھا اور بار مغرب نے بھی ان کے متعلق مقالات شائع کیے۔ خود اقبالؔ نے انگریزی میں ایک مضمون مرتب کیا، جو لکھنؤ کے مشہور انگریزی اخبار "نیو ایرا" میں شائع ہوا (۲۸ جولائی ۱۹۱۶ء) اس میں فرماتے ہیں:

"تمام انسانی جد و جہد کا انجام فقط حیات ہے اور تمام انسانی علوم و فنون اسی مقصد کے حصول کے تابع ہیں، اس لیے ہر علم و فن کی منفعت کا اندازہ اس کی حیات آفریں قوّت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ ترین فن وہ ہے، جو ہماری طبعی قوّتِ ارادی کو بیدار کرے اور ہمیں مصائبِ زندگی میں مردانگی سے مقابلہ کرنے کی طاقت بخشے۔ تمام خواب آور اثرات، جو حقیقت سے گریز کی تعلیم دیں، بجائے خود پیغامِ انحطاط و ممات ہیں۔ ادبیات کو دنیائے افیون خوردہ کے نقوش سے مبرا ہونا چاہیے۔ فن برائے فن کا اصول زمانۂ تنزّل کی ایجاد ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ذوقِ حیات اور جذبۂ عمل سے محروم کر دے۔"

نواب سر ذوالفقار علی خاں مرحوم نے بھی اپنی کتاب میں مثنویوں کی طرف بہ طورِ خاص توجّہ منعطف کرائی۔

مولانا سیّد سلیمان کے ارشادات | اقبالؔ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ علم و فضل کا بحرِ بےکراں ہونے کے باوجود وہ ہر شخص سے بے تکلّف مختلف چیزیں پوچھتے رہتے تھے اور کبھی یہ خیال دامن گیر نہ ہوا کہ اپنے سے بہ درجہا کمتر علمی پایہ رکھنے والے لوگوں سے علی الاعلان کچھ پوچھنا غلط فہمی کا باعث بن جائے گا۔ چنانچہ جو بھی شخص ان کے پاس پہنچ جاتا، اس سے زبان یا مسئلے کے متعلق سوال کرنے میں تامّل نہ فرماتے، اگرچہ کتنے ہی آدمی پاس بیٹھے ہوتے۔ "رموزِ بیخودی" شائع ہوئی تو ایک نسخہ مولانا سیّد سلیمان مرحوم کی خدمت میں بھی اقبالؔ نے بھیجا۔ مولانا مرحوم نے غالباً مثنوی کی فارسیت پر اعتراضات بھی کیے، جن کی پوری کیفیت اس لیے عرض نہیں کی جا سکتی کہ مولانا سیّد سلیمان کے مکاتیب سامنے نہیں، صرف وہی امور سامنے ہیں، جن کا ذکر اقبالؔ کے جوابی مکاتیب میں آ گیا ہے۔ اقبالؔ کی شانِ علم ملاحظہ ہو کہ خود سیّد صاحب کو لکھتے ہیں، "آپ نے "رموزِ بےخودی" کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ ایک مہینے سے بھی زیادہ مدّت ہو گئی۔ امید ہے توجّہ فرمائی جائے گی تاکہ مثنوی کے دوسرے ایڈیشن کی ترتیب میں فائدہ اٹھایا جا سکے۔"[۱]

یہ بھی عرض کر دوں کہ فارسی کے دواوین و ادب پر مولانا سیّد سلیمان مرحوم کی نظر زیادہ وسیع نہ تھی۔ بلاشبہ وہ

۱۔ "اقبال نامہ" حصّہ اوّل صفحہ ۴۳۔

مولانا شبلی مرحوم کے جانشین مانے گئے تھے اور جانشینی کے تمام فرائض ادا کرتے رہے لیکن مولانا شبلی کو فارسی پر جو عبور خاص کا مقام دمرتبہ دوسرا تھا۔ چنانچہ مولانا سلیمان نے "رموز بے خودی" پر جا اعتراضات کیے، وہ میرے اندازے کے مطابق سب کے سب نادرست تھے۔ ان میں سے بیشتر کے جوابات خود اقبال نے دے دیے تھے اور ساتھ ہی اساتذہ فارسی کے کلام سے سندیں بھی پیش کر دی تھیں۔

چند مثالیں اختلاف

۱۔ اقبال کا ایک مصرع تھا:

خیمہ بہ زد در حقیقت از مجاز

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ "از" میں تجاوز کا مفہوم نہیں۔ اقبال نے سعدی کا یہ شعر مثال میں پیش کیا:

صوفی "از" صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار
وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار[۱]

۲۔ اقبال کا ایک مصرع تھا:

من ز جو باریک تر مے سازمش

سید صاحب نے لکھا تھا کہ باریک یہاں صحیح نہیں۔ حالانکہ اقبال کے قول کے مطابق "باریک" بہ معنی کم در عرض و عمق بھی آیا ہے، جیسا کہ صائب کے اس شعر سے واضح ہے:

نازک تر است از رگِ جاں گفتگوے من
"باریک" شد محیط چو آمد بہ جوے من[۲]

۳۔ اقبال کا ایک شعر تھا۔

کور ذوقاں داستاں ہا ساختند
وسعتِ ادراکِ او نشناختند

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ "کور ذوق" بے مزہ ترکیب ہے۔ اقبال نے جواب میں دو شعر پیش کیے:

ا۔ چہ غم زیں عروس سخن را بتر
کہ بر "کور ذوقاں" شود جلوہ گر (ظہوری)[۳]

ب۔ "کور ذوقاں" ز فیضِ تربیتت
چو مسیحا مزاجدان سخن (ملا طغرا)[۴]

۱؎ اقبال نامہ حصہ اول ص۳۸ ۲؎ ایضاً ایضاً ص۵۰ ۳؎ ایضاً ایضاً ص۵۱

۴۔ سید صاحب نے "بادۂ نارسا" پر بھی اعتراض کیا تھا اور جہاں اقبال کے مکتوب میں اس کا ذکر آیا ہے، اس پر سید صاحب نے خود نوٹ لکھا تھا کہ "یہ دو غلط لفظ اقبال نے استعمال کیے تھے"۔ اقبال نے جواب میں لکھا کہ مجھے اس کے لیے کوئی سند یاد نہیں، یعنی مکتوب لکھتے وقت کوئی سند یاد نہ آئی اور اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے لیکن اعتراض صحیح نہیں۔ شیخ علی حزیں کا مطلع ہے:

پختہ بر حکمتے کنم بادۂ "نارسائے" را
بر سرِ خُم نہادہ ام خشتِ کلیسیائے را[1]

ظاہر ہے کہ "بادۂ نارسا" پر بھی اعتراض صحیح نہ تھا۔

ایک لطیفہ اقبال نے "رموزِ بے خودی" کے آخر میں مثنوی کے مطالب کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر میں پیش کیا ہے۔ اس تفسیر کا پہلا شعر ہے:

من شبے صدیقؓ را دیدم بخواب
گل ز خاکِ راہِ او چیدم بخواب

مولانا سید سلیمان نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ دوسرے مصرع کا مطلب واضح نہیں۔ لیکن وضاحت نہ فرمائی کہ کیوں واضح نہیں؛ یعنی کسی بزرگ ہستی کی خاک راہ سے پھول چننے میں کیا ابہام ہے؟ ظاہر ہے کہ حضرت صدیقؓ جس راستے سے تشریف لائے ہوں، اس بلند منزلت وجود کے نقشِ پاک کی برکت سے یکسر تختۂ گل بن گیا ہوگا۔ اقبال نے اس تختۂ گل سے تبرک کے طور پر پھول چنے۔ اقبال نے اس کے جواب میں تفصیل پسند نہ فرمائی اور فرمایا:

"یہ واقعہ خواب کا ہے۔ جو کچھ خواب میں دیکھا گیا
بعینہٖ نظم کر دیا گیا"[2]

خواب میں صرف یہ دیکھا کہ میں نے (اقبال نے) حضرت صدیقؓ کی خاکِ راہ سے پھول چنے اور اسے نظم کر دیا۔ وہ خواب کے واقعے پر بہ طور خود اضافہ کیوں کرتے؟

شرح اسرار و رموز "اسرار و رموز" کی پیش نظر شرح کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے بھی مختلف اہل علم ان مثنویوں کے مطالب اردو میں بیان کر چکے ہیں۔ انھوں نے اس کے مسائل پر فلسفہ، تصوف اور دین کے نقطۂ نگاہ سے مفصل بحثیں کیں، لیکن میرا احساس برابر یہ رہا کہ مثنویوں کے اشعار کو عام خوانندوں کے فہم کی دسترس میں لانے پر پوری توجہ نہ فرمائی گئی حالانکہ شرح کا اصل مقصد یہی مدعا ہی تھا۔ میں نے چند پہلو بطورِ خاص سامنے رکھے:

۱۔ انتہائی احتیاط کی کہ اقبال کے اشعار کو اپنے معتقدات و افکار کا لباس نہ پہنایا جائے، بلکہ ظاہر الفاظ سے

---

[1] کلیات شیخ علی حزیں ص [illegible] [2] اقبال نامہ حصۂ اول ص ۹۵

اس مرحوم کے مطلب و مدعا کا جو اندازہ ہو سکے، اسی کو صاف اور واضح طریق پر عرض کر دیا جائے۔ البتہ اقبال کی بنیادی تعلیمات برابر مشعلِ راہ رہیں۔ ان کی روشنی کے بغیر نہ کوئی قدم اٹھایا جا سکتا تھا اور نہ اٹھانا مناسب تھا۔

۲۔ پورا اہتمام کیا کہ ہر شعر کا ترجمہ کیا جائے اور جو نکتے تشریح طلب ہوں، ان کی شرح اپنے فہم اور سمجھ کی بنا پر لکھ دی جائے۔ ان میں پیچیدہ اشعار کی تعداد بھی خاصی تھی، جنھیں تشبیہ و استعارہ کی رعایت سے اردو کا لباس پہنانا سہل نہ تھا۔ لیکن میں نے کہیں بھی مفہوم کو اپنے لفظوں میں بیان کر دینے کا آسان طریقہ اختیار نہ کیا۔ مشکل الفاظ کے معانی لکھے۔ شعروں کا ترجمہ کیا اور جو امور مزید تفصیل و توضیح کے محتاج نظر آئے، انھیں واضح کر دیا۔

۳۔ ممکن ہے میں نے بعض اشعار کو علم کی کمی اور فہم کی نارسائی کے باعث ٹھیک نہ سمجھا ہو۔ لیکن بلا ترجمہ و تشریح کوئی شعر نہیں رہنے دیا۔ البتہ مسائل کی توضیح کا پیمانہ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھا اور متوسط درجے کی شرح ایسی ہی ہو سکتی تھی۔ مجھے احساس ہے کہ بعض اہم علمی پہلو پوری طرح واضح نہ ہو سکے، لیکن جو معیار پیشِ نظر رکھا گیا تھا اس کی پابندی لازم تھی اور اس اعتراف میں تامل نہیں ہو سکتا کہ بعض مسائل کی تشریح کے لیے الفاظ مساعد نہ تھے اور یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا، وہی درست تھا۔

۴۔ میری آرزو تھی کہ "اسرارِ خودی" کے مختلف مسائل کے سلسلے میں خود اقبال نے جو کچھ تحریر فرمایا، اسے بھی مناسب ترتیب سے یکجا کر دوں اور وہ افادات "اسرارِ خودی" نیز "رموزِ بے خودی" کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے بہترین معاون کا کام دے سکتے تھے۔ ان افادات کا صحیح محل یہ تھا کہ انھیں شرح میں شامل کیا جاتا۔ چونکہ میرے پیشِ نظر اشعار کی الگ الگ شرح تھی اور اقبال نے اشعار پر نہیں بلکہ مثنوی کے مسائل پر بحث کی تھی، اس لیے ان تمام افادات کو مقدمے میں جمع کر دیا۔ مقاصد و مطالب کے فہم میں سہولت و اعانت کے علاوہ ان افادات کی فراہمی بجائے خود بھی ضروری تھی اور لازم یہی تھا کہ انھیں متعلقہ کلام سے وابستہ کر دیا جاتا۔

ترتیبِ ابواب و فصول دونوں مثنویوں کے مطالب اتنے پیچیدہ ہیں کہ ہر شخص انھیں سرسری نظر سے ذہن میں نہیں بٹھا سکتا۔ میں نے انھیں ابواب و فصول میں مرتب کرنے کی کوشش کی تاکہ خوانندگانِ کتاب محض فہرستِ مطالب دیکھ کر اندازہ فرما سکیں کہ مثنویوں کے مضامین کی کیفیت کیا ہے۔ ہر باب کے ماتحت اس کی فصلیں بھی فہرست میں درج کر دیں تاکہ بہ یک نظر پورا نقشہ سامنے آ جائے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ کوئی صاحب کسی خاص باب کی خاص فصل کسی وقت دیکھنا چاہیں گے تو فہرست سامنے رکھ کر اسے جلد از جلد نکال سکیں گے۔ گویا یہ فہرست ایک حد تک مثنویوں کے لیے اشاریہ کا کام بھی دے گی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا تاہم اپنی بساطِ فہم و بصیرت کے مطابق جو کچھ ممکن تھا، اس میں کوتاہی نہیں کی اور — لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

آخری گزارش: آخر میں بہ طور کسرِ نفس نہیں بلکہ بہ اعتبارِ حقیقت و واقعیت عرض کرتا ہوں کہ جو کچھ آئندہ اوراق میں لکھا گیا، وہ میرے فہم اور میری سمجھ کا مرقع ہے۔ اگر میں نے صحیح سمجھا تو اسے اللہ تعالیٰ کے فضلِ لایزال کا کرشمہ سمجھیے، اگر کہیں ٹھوکر کھائی تو وہ میرے دماغ کی کوتاہی و نارسائی کا نتیجہ ہے۔ جن بزرگوں کے کلام کی مزاولت میری زندگی کا محبوب ترین مشغلہ رہی، ان میں اقبال کا درجہ سب سے بلند نہیں تو کسی سے فروتر بھی نہیں۔ بایں ہمہ اپنے فہم و بصیرت پر کبھی اعتماد نہ ہوا اور آج بھی اس فہم و بصیرت کو شائستہ اعتماد نہیں سمجھتا۔ میری سعی و کوشش کا نصب العین یہ تھا کہ جس حد تک استطاعت مساعدت کرتی ہے، اردو خواں حضرات کو مثنویوں کے براہِ راست مطالعے میں مدد دوں۔ اسی غرض سے یہ شرح مرتب کی اور اقبال کی باقی فارسی کتابوں کی شرحیں بھی اسی غرض سے مرتب کر دینا چاہتا ہوں۔ خوانندگانِ کرام سے بہ صمیم قلب استدعا ہے کہ جہاں انہیں میری ناچیز کوشش سازگار نظر آئے، میرے لیے دعا فرمائیں، جہاں احساس ہو کہ میں نے کسی شعر کو صحیح نہیں سمجھا، وہاں مجھے آگاہ فرمائیں تاکہ غلطی اور لغزش کی تلافی کر سکوں۔

نیازمند
مہر

مسلم ٹاؤن لاہور
۱۷ جولائی ۱۹۶۰ء

فہرست مضامین

اسرارِ خودی

تمہید

پہلا باب — تمہید

خلاصۂ مطالب، پیغام کی ندرت، پیغام کی عظمت: ساقی سے خطاب
پیر رومؒ کا ارشاد، اسرار خودیؔ کا مقصد

دوسرا باب — نظامِ عالم کی بنیاد — خودی

تمہید، خودی، خودی کے مظاہر

تیسرا باب — خودی اور تخلیقِ مقاصد

مقاصد کی کارفرمائی، حقیقت افروز مثالیں

چوتھا باب — خودی اور عشق و محبّت

حقیقتِ عشق، رسول اکرم صلعم، سردارِ طے کی بیٹی کا واقعہ، حضور اکرمؐ
اور وحدتِ ملّت، عشقِ رسولؐ، حق کے لیے ہجرت کی دعوت

پانچواں باب — خودی اور سوال

سوال ہی اصل بیماری ہے، کائنات پر غور و فکر کی دعوت

چھٹا باب — خودی اور نظامِ عالم

شیخ بوعلیؒ قلندر کا واقعہ، شیخؒ کا فرمان بادشاہ کے نام

ساتواں باب — مغلوب قوموں کے مخفی حیلے

تمہید، گوسفندوں پہ شیروں کا حملہ، ایک دانا بکری کی تدبیر،
شیروں کے لیے پیغمبر، شیروں کی تن پروری اور زوال

آٹھواں باب — افلاطون اور مسلکِ گوسفندی

افلاطون کی خیالی دنیا، خواب اور نشہ

نواں باب — حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیات

آرزو اور مشن، شاعر کا حقیقی فریضہ، حیات سوز شاعری، ہماری شاعری کا سرمایہ
شاعر کا اصل کام

دسواں باب — تربیت خودی کی منزلیں
تمہید، پہلی منزل۔ اطاعت، دوسری منزل۔ ضبطِ نفس، تیسری منزل۔ نیابت الٰہی،
نائبِ حق کے لیے التجا

گیارھواں باب — اسرار حضرت علیؓ
تمہید۔ حضرت علیؓ کے مناقب، شرح اسم بوتراب، دعوت عمل، قوت اور ناتوانی

بارھواں باب — شیخ ہجویریؒ اور نوجوان مرو
شیخ علی ہجویری، نوجوانِ مرو کی درخواست، شیخ کے ارشادات، دعوت خودی

تیرھواں باب — پیاسے پرندے کی حکایت
پرندہ اور الماس، پرندہ اور شبنم، سبق

چودھواں باب — الماس اور کوئلے کی حکایت
تمہید، کوئلے کی زارنالی، الماس کا جواب، سبق

پندرھواں باب — شیخ و برہمن اور گنگا و ہمالہ
تمہید، برہمن، شیخ، گنگا، ہمالہ

سولھواں باب — مسلمان کی زندگی کا نصب العین
تمہید، رضار باری تعالیٰ، شیخ میاں میرؒ اور بادشاہ ہند

سترھواں باب — مسلمانوں کے لیے دعوت
تمہید، میر نجات کا نصیحت نامہ، رومیؒ اور تبریزیؒ، رومی اور تبریزی کی ملاقات،
اقبال کا نقطۂ نگاہ، علم و عشق، ملت سے خطاب

اٹھارھواں باب — وقت تلوار ہے
تمہید، الوقت سیفٌ، اصلیتِ زمان، عہدِ حضر، ماضی کی یاد، اہل مغرب سے خطاب،
مسلمان کی شان

انیسواں باب — دعا
تمہید، بارگاہِ باری تعالیٰ میں، اپنی کیفیت، غمگسار کا انتظار

مولانا رومؒ کے اشعار

اقبالؔ نے مولانا رومؒ کی ایک مشہور غزل کے تین شعر "اسرار خودی" کے آغاز میں درج کیے ہیں۔ ان کے مضمون کو مثنوی کے مطالب و مقاصد سے جو مناسبت ہے، وہ کسی تصریح کی محتاج نہیں۔

۱۔ کل شیخ چراغ لے کر شہر کے گلی کوچوں میں چکر لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں درندوں اور چوپایوں سے سخت رنجیدہ اور تنگ ہو گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی انسان مل جائے یعنی جو آدمی ہر جگہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، ان کی حقیقت چوپایوں اور درندوں کی سی ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ بدیہی حقائق کا اندازہ نہیں کر سکتے، اپنی ذات پر یا دوسروں پر سختی یا ظلم کرتے وقت انھیں قطعاً تامّل نہیں ہوتا۔ ان کی صحبت پر کوئی کیوں کر مطمئن ہو جائے؟ انسان درکار ہے۔ وہی انسان جس کے متعلق مرزا غالبؔ نے کہا ہے:

"آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

۲۔ میرے ساتھیوں کی حالت یہ ہے کہ ان کے وجود جن عناصر سے مرکب ہیں، وہ نہایت نکمے تھے۔ ان میں جدّ و جہد اور عمل کا کوئی بھی جوہر موجود نہیں، لہٰذا ان سے دل بیزار ہو چکا ہے۔ مجھے ایسے وجود چاہییں، جن میں شیرِ خدا اور رستم دستاں کی شجاعت، جوانمردی اور استعداد و جدّ و جہد موجود ہو۔ جو ناممکن کو ممکن کر دکھائیں۔

۳۔ میں نے کہا کہ آپ کو جس جنس کی طلب ہے، وہ تو گوہر نایاب کی حیثیت رکھتی ہے اور کہیں دیکھی نہیں گئی۔ شیخ نے کہا کہ جو دیکھی نہیں گئی، جو پائی نہیں جاتی، مجھے اسی کی آرزو ہے۔

گویا اسرار خودی کا مدعا بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ شیر خدا اور رستم دستاں جیسے انسان پیدا کرے۔ وہ جنس بروئے کار لائے جو اب بازار زندگی میں کہیں نظر نہیں آتی۔

نظیری کا شعر

اقبالؔ نے تمہید کے نیچے بہ طور طراز عنوان نظیریؔ کا یہ شعر درج کیا ہے:

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نہ شود، دار کنم

یعنی میرے جنگل کے خشک و تر میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں، جو مفید و کار آمد نہ ہو۔ جس درخت کی لکڑی وعظ و ارشاد اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے منبر کے کام نہیں آ سکتی، میں اس سے سولی تیار کرا دیتا ہوں تاکہ مجاہد اس پہ چڑھ کر حق کی شہادت دے سکیں۔

خشک و تر سے مراد ہے اچھی اور نکمی لکڑی۔ شاعر کہتا ہے کہ اچھی لکڑی تو منبر میں لگتی ہے اور جسے نکمی سمجھا جاتا ہے، وہ دار یعنی سولی ـــــ بنانے کے لیے دے دی جاتی ہے اور اعلان حق کے دو ہی ذریعے ہیں: مسجد کا منبر یا سولی۔ سولی کا درجہ زیادہ بلند ہے، اس لیے کہ یہ اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جو اعلان حق میں جان دے دینے پر آمادہ ہو، جیسا کہ مرزا غالبؔ نے کہا ہے:

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت

نظیریؔ کے شارحین نے اس شعر کی شرح عجیب انداز میں کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرے جنگل میں جو لکڑی اچھی ہے، اسے تو بادشاہ منبر بنانے کے لیے لے جاتے ہیں اور جو نکمی ہے، اس سے حاسدوں کے لیے سولی بنواتا ہوں۔ یعنی میرے تمام اشعار کی دو حیثیتیں ہیں، داناؤں اور عزیزوں کے نزدیک تو پسندیدہ ہیں اور حاسدوں کے لیے وہ خواری و رسوائی کا سبب ہیں۔ انھیں یہ شعر سن کر دیکھ کر ویسی ہی زحمت ہوتی ہے، جیسی کسی کو سولی پر چڑھنے سے ہو۔ میرے نزدیک بہتر اور مناسب حال شرح وہی ہے، جو پہلے مذکور ہوئی۔

پہلا باب

تمہید

خلاصۂ مطالب اشعار کی تشریح سے پیشتر تمہید کے مطالب کا خلاصہ ذہن نشین کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو زبان میں جو بڑی مثنویاں لکھی گئیں، ان میں مختلف مطالب تمہیدی طور پر بیان کیے جاتے تھے اور یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ مثنوی کیوں لکھی گئی۔ اقبالؔ نے تمہید میں ایسا انداز اختیار کیا، جو ہر لحاظ سے نیا ہے اور اسے اقبالؔ کے پیشِ نظر پیغام سے خاص مناسبت ہے۔ وہ طلوعِ سحر سے تمہید کا آغاز کرتے ہیں اور یہ آغاز ۔۔۔۔

۔۔۔۔ اس وجہ سے بہت موزوں ہے کہ وہ ایک نیا پیغام عالمِ انسانیت کو پہنچا رہے ہیں جو اُن حقائقِ حیات پر مبنی ہے اور جن سے لوگ بالعموم غافل ہیں۔ انھوں نے خاصے اشعار ایسے انداز میں کہے ہیں کہ شاید بادی النظر میں ذاتی ستائش پر محمول ہوں اور شعراء میں فخر و خود ستائی کا شیوہ عام رہا ہے، لیکن اقبالؔ نے جو کچھ کہا ہے، اس کا حقیقی مرجع ذات نہیں بلکہ وہ پیغام ہے جو قدرت نے اُن کے حوالے کیا اور جس کی تبلیغ میں اُن کی زندگی کے بہترین اوقات صرف ہوئے۔ بلاشبہ جو پیغام ان کے سپرد ہوا، اُس کی بنا پر وہ اپنے لیے بلند سے بلند تر الفاظ کہتے تو قطعاً بے محل نہ ہوتے، مگر اُن کے سامنے پیغام کی جلالت و عظمت کے سوا کچھ نہیں، البتہ شعر کا انداز وہی ہے جو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔

پیغام کی اہمیت کے بعد وہ ساقی سے مخاطب ہوئے اور اُس شراب کی آرزو کی جس کی اصل زمزم تھی کہ فقیر بھی پیے تو جمشید بن جائے۔ جس کی برکت سے گھاس کے تنکے کو پہاڑ کا وقار اور لومڑی کو شیر کی قوت حاصل ہو جائے۔

وہ مولانا روم کے اسلوب پر اپنا پیغام مرتب کرنا چاہتے تھے؛ لہٰذا انھوں نے مولانا ہی کو اپنا پیشرو قرار دیا۔ مولانا ہی نے عالمِ خواب میں اُن سے یہ کہا کہ کب تک غنچے کی طرح خاموش بیٹھے رہو گے؟ کیوں پھول کی طرح اپنی خوشبو ہر سمت نہیں بکھیرتے؟ تم ایک قافلے کے لیے بانگ درا کی حیثیت رکھتے ہو۔ اٹھو اور قافلے کو راہِ مقصود پر لگا دو۔ یہ سنتے ہی اقبالؔ نے حقائقِ حیات کی تشریح کا فیصلہ کر لیا اور خودی کے راز سے پردہ اُٹھا دیا۔

دیکھیے، کس درد و سوز سے فرماتے ہیں کہ میری آنکھیں عالمِ انسانیت کی ہمدردی میں اشکبار رہیں۔ اس کے بعد مجھ پر قدرت نے زندگی کے اسرار بے نقاب کیے۔ میں بہ ہر حال ملّتِ بیضا کی گرد راہ ہوں۔ اگرچہ میری حیثیت دھوئیں کی ہے، لیکن اصل تو آگ ہی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اس نصب العین کے لیے کیا کہ قطرہ سمندر بن جائے

اور ذرہ بڑھ کر صحرا کا درجہ اختیار کرے

آخر میں فرماتے ہیں کہ اگرچہ بپیشِ نظر مطالب کے لیے میں نے شعر کا انداز اختیار کیا لیکن میرا اصل مقصود شاعری نہیں۔ پھر فارسی زبان اس لیے اختیار کی کہ اس میں زیادہ مٹھاس ہے اور یہ میرے افکار کی بلندی کا ساتھ زیادہ خوش اسلوبی سے دے سکتی ہے۔

پیغام کی ندرت | راہ زدن۔ لوٹنا۔ شکست دینا۔ فنا کرنا۔

آب زدن۔ پانی چھڑکنا۔ چھینٹے دینا۔ گرد و غبار دھونا۔

فتراک۔ چمڑے کا تسمہ جو زین کے دائیں بائیں شکار یا دوسری چیزیں باندھنے کی غرض سے لگا رہتا تھا۔ شکار بند۔

رامش گری۔ نغمہ و سرود۔ راگ رنگ۔

عُود۔ ایک قسم کا ساز۔ بربط۔ سارنگی۔

۱۔ دنیا کو روشن کرنے والے سورج نے رات کو ختم کر دیا۔ میرے آنسوؤں نے پھول کے چہرے پر چھینٹے دیے تاکہ وہ بیدار ہو جائے اور اس کا گرد و غبار دھل جائے۔

۲۔ میرے آنسوؤں نے نرگس کی آنکھ سے نیند زائل کر دی۔ سویا ہوا سبزہ میری ہنگامہ آرائی سے بیدار ہو کر اگ پڑا۔

۳۔ فطرت کے باغبان نے میرے کلام کا زور آزمایا اور میری پوشیدہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ کر لیا۔ نزرِ کلام کی یہ خاصیت تھی کہ مصرع زمین میں بو کر تلوار کاٹ لی جاتی۔ مطلب یہ کہ میرے ہر مصرع میں تلوار کے جوہر درخشاں تھے۔

۴۔ اس نے باغ میں میرے آنسوؤں کے دانے کے سوا کچھ بونا گوارا نہ کیا اور میرے نالہ و فغاں کا تانا باغ کے بانے سے پیوند کر دیا۔

۵۔ اگرچہ میں ذرہ ہوں لیکن زمانے کو روشن کرنے والا سورج میری ملکیت ہے اور سینکڑوں صبحیں میرے گریبان سے پھوٹ سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس ذرے کو مہرِ منیر کی ملکیت میسر ہے، وہ ہر لمحہ صبح پیدا کر سکتا ہے۔

۶۔ میری خاک جامِ جمشید سے بھی زیادہ روشن ہے، اس لیے کہ جام میں تو دنیا کے صرف موجود حالات دیکھے جا سکتے تھے، لیکن میری خاک اُن حالات سے بھی آگاہ ہے۔ جو ابھی تک عالمِ ظہور میں نہیں آئے۔

۷۔ میری فکر نے حقیقتوں کا وہ ہرن اپنے شکار بند سے باندھ لیا ہے۔ جس نے ابھی تک عدم سے باہر قدم نہیں رکھا۔ حاصل یہ کہ میں شعر میں وہ حقائق پیش کرنے والا ہوں جو پہلے کسی شاعر کو نصیب نہ ہوئے۔

۸۔ جو سبزہ ابھی تک اگا نہیں، وہ میرے باغ کے لیے زیب و زینت کا سامان بنا ہوا ہے۔ جو پھول ابھی تک شاخ کے اندر چھپا ہوا ہے، وہ میرے دامن میں پہنچ گیا ہے۔ اس شعر میں کا مضمون دوسرے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

۹۔ شاعر بالعموم نغمہ و سرود اور راگ رنگ کی مجلس آراستہ کرتے تھے۔ میں ایسی مجلس کو درہم برہم کر رہا ہوں اور ساز کے تاروں کے بجائے رگِ کائنات کے تار چھیڑ رہا ہوں۔ دوسرے شاعر صرف وقتی عیش و نشاط کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ میں زندگی کے حقائق سے پردہ اٹھا رہا ہوں۔

۱۰۔ میری فطرت کے ساز سے نادر نغمے جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ میرے رفیق اُن سے بالکل ناآشنا ہیں۔

۱۱۔ میں آفاق میں ایک نیا سورج پیدا ہوا ہوں۔ پرانے سورج کے برعکس مجھے آسمان کے رسم و آئین کا ابھی تجربہ نہیں ہوا۔

۱۲۔ سورج نکلتا ہے تو تارے چھپ جاتے ہیں، مگر میرے سورج کی روشنی سے تاروں کو بھاگنے اور چھپنے کی نوبت ابھی نہیں آئی۔ میں بلاشبہ پارا ہوں، تاہم ابھی اُس میں تڑپ اور بے قراری پیدا نہیں ہوئی۔

۱۳۔ ابھی تک سمندر میری روشنی کے رقص سے بے بہرہ ہے۔ پہاڑ میری حنا کے رنگ سے محروم ہے۔

۱۴۔ زمانے کی آنکھ مجھ سے مانوس نہیں۔ میں اپنے چہرے سے پردہ اٹھا کر نمایاں تو ہو رہا ہوں لیکن اس اندیشے سے جسم پر لرزہ طاری ہے کہ خدا جانے، میرے متعلق کیا رائے قائم کی جائے۔

یہاں تک پیغام کی ندرت پیشِ نظر تھی؛ آئندہ اُس کی عظمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پیغام کی عظمت | بام ۔ بامداد کا مخفف ۔ صبح۔

زرتشتی۔ زرتشت کا پیرو ۔ زرتشت پارسیوں کا پیغمبر تھا جس سے انھوں نے آتش پرستی منسوب کر دی۔

عمان۔ عمان عرب کے جنوبی و مشرقی حصے میں خلیج فارس کے دہانے پر واقع ہے۔ اس کے سامنے کے سمندر کو خلیج عمان کہتے ہیں، جو دراصل بحیرۂ عرب کا ایک حصہ ہے۔ اصل خلیج فارس، خلیج عمان کے خاتمے پر راس مسندم سے شروع ہوتی ہے، لیکن عموماً خلیج عمان کو بھی خلیج فارس ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال فارسی اور اردو میں عمان سمندر کے معنی میں مستعمل ہے:

باب ۔ درخور ۔ لائق ۔ شائستہ۔

پنجہ کردن ۔ قبضے میں لینا ۔ پکڑنا ۔ لے لینا۔

برات ۔ حصہ ۔ بخرا ۔ قسمت ۔ وہ کاغذ جس کی بنا پر خزانے سے روپیہ لیا جاتا ہے ۔ چک۔

۱۔ میری صبح مشرق سے نمودار ہوئی اور رات کا اندھیرا ختم ہو گیا۔ دُنیا کے پھول پر نئی شبنم آ گری۔

۲۔ میں منہ اندھیرے جاگنے والوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو میری روشن کی ہوئی آگ کی طرف اُسی طرح کھچے چلے آ رہے ہیں، جس طرح زرتشتی علی الصباح آتشکدے کی طرف جاتے ہیں۔

۳۔ میں ایک ایسا نغمہ ہوں، جو مضراب سے بالکل بے نیاز ہو، لیکن میں اُس شاعر کی آواز ہوں، جس کا دور مستقبل میں شروع ہوگا۔

۴ - میرا زمانہ رازوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لہٰذا میرا یوسف اس بازار میں صحیح قیمت نہیں پا سکتا۔

۵ - میں پُرانے دوستوں کی رفاقت سے ناامید ہوں۔ میرے طُور پر آگ روشن ہے، شاید اس کے لیے بھی کوئی کلیم آ پہنچے۔

۶ - میرے قدیم رفیق، جو سمندر پیے بیٹھے ہیں، شبنم کی طرح جوش و خروش سے عاری ہیں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ میری شبنم بھی سمندر کی طرح طوفان آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

۷ - میرا نغمہ ایک نئی دُنیا کی خوش خبری سُناتا ہے۔ یہ جرس ایک نئے قافلے کا طلبگار ہے۔

۸ - ۹ - بہت سے شاعر ایسے بھی ہیں، جو مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور ہماری آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ وہ دوبارہ عدم سے زندگی کا سر و سامان لے کر آجاتے ہیں اور اپنی قبر کی خاک سے پھول کی طرح اُگ آتے ہیں۔ شعر ۹ میں "رخت ناز از نیستی بیروں کشید" غلط چھپا ہے، صحیح ہے "رخت باناز نیستی بیروں کشید"۔

چونکہ شاعر کو احساس تھا کہ اُس کا عہد حقائقِ زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اُس کی حقیقی حیثیت کا اندازہ پُرانے رفیق نہیں کر سکتے، اس لیے فرمایا کہ ایسے شاعر بھی گزرے ہیں، جو اپنا پیغام پہنچاتے پہنچاتے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ پھر اُن کے پیغام کی حقیقت سب پر آشکارا ہوئی۔ گویا وہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہو گئے شاید میرے لیے بھی یہی مقدّر ہے۔

۱۰ - اس صحرا میں سے اکثر قافلے گزر گئے، لیکن سانڈنی کی طرح اُن کے چلنے کی آواز کسی کے کان تک نہ پہنچی۔ گویا شاعر قافلہ در قافلہ گزر گئے، مگر کسی کو احساس تک نہ ہو سکا کہ انھوں نے کیا کہا اور کیا کر گئے۔

۱۱ - میں محض شاعر نہیں، ایک دعوت اور ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ اُس دعوت کے لیے میرے دل میں ایسی شیفتگی اور اس درجہ تڑپ ہے کہ ہر دل میں اُسے اتار دینا چاہتا ہوں، لہٰذا فریاد میرا ایمان ہے اور فریاد کی یہ کیفیت ہے کہ قیامت کا شور میرے آگے آگے چلنے والوں میں سے ہے۔

۱۲ - میرے ساز کے تار میرا نغمہ سنبھال نہیں سکتے، لیکن میں وہ نغمہ ضرور سناؤں گا۔ اگر اس وجہ سے میرا ساز ٹوٹ بھی جائے تو مجھے ہرگز پروا نہیں۔

۱۳ - قطرے کے لیے یہی بہتر ہے کہ میرے سیلاب سے دُور ہی رہے۔ سمندر کے لیے یہی زیبا ہے کہ میرے طوفان سے اپنے آپ پر دیوانگی کی کیفیت طاری کرے۔

قطرے سے مراد کم ہمت اور فرومایہ افراد ہیں۔ سمندر سے اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے جو ہمت اور جوشِ عمل کے پیکر ہوں۔

۱۴ - میرا سمندر چھوٹی چھوٹی ندیوں میں نہیں سما سکتا۔ جو طوفان میں اپنے دامن میں لیے بیٹھا ہوں، اُس کے واسطے وسیع

سمندر چاہییں۔

۱۵۔ جس کلی میں نشوونما پاکر باغ بن جانے کی اہلیت موجود نہ ہو، وہ میرے ابرِ بہار سے فیض پانے کے لائق نہیں۔

۱۶۔ میری جان میں بجلیاں سوئی ہوئی ہیں۔ پہاڑ اور جنگل ہی میری تگ و تاز کا صحیح میدان ہیں۔

۱۷۔ اگر تو صحرا ہے تو میرا سمندر اپنے اندر جذب کر لے۔ اگر تو طور سینا ہے تو میری بجلی اپنے رگ و پے میں سمیٹ لے۔

۱۸۔ قضا و قدر نے آبِ حیات میرے حوالے کر دیا ہے اور مجھے زندگی کے بھیدوں کا محرم بنا دیا ہے۔

۱۹۔ ذرہ میرے نغمے کی حرارت سے زندہ ہو گیا۔ اُس نے بال و پر نکالے اور جگنو بن گیا۔

۲۰۔ میں جو راز آشکار کر رہا ہوں، وہ کسی نے نہیں کیے۔ میری فکر کی طرح کسی نے موتی نہیں پروئے۔

۲۱۔ اگر تو ہمیشہ کی زندگی کا بھید دریافت کرنا چاہتا ہے تو میرے پاس آ۔ زمین اور آسمان، دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتیں تجھے مل جائیں گی۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں بظاہر رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً شاعر کے پیشِ نظر ہے۔

۲۲۔ یہ اسرار مجھے بوڑھے آسمان یعنی قضا و قدر نے بتائے۔ دوستوں اور رفیقوں سے راز چھپائے نہیں جا سکتے۔

ساقی سے خطاب

پہنا۔ وسعت۔ فراخی۔

احمر۔ نہایت سُرخ۔

کالا۔ متاع۔ سامان۔

۱۔ اے ساقی! اُٹھ اور میرے پیالے میں شراب ڈال۔ زندگی کے غم و رنج میرے دل سے دُور کر دے۔

۲۔ مجھے وہ رواں دواں شعلہ، وہ آتشِ سیال چاہیے، جس کی اصل زمزم ہے۔ یہی وہ شے ہے کہ اگر بے نوا فقیر بھی اس کا پرستار بن جائے تو جمشید کا درجہ حاصل کرے گا۔

۳۔ وہ شراب ایسی نہیں جو عقل و فکر پر مدہوشی طاری کر دے، بلکہ ان میں زیادہ مستعدی اور تیزی پیدا کرتی ہے۔ جاگتی ہوئی آنکھوں کو اور زیادہ جگا دیتی ہے

۴۔ وہ گھاس کے تنکے کو پہاڑ کا دقار بخشتی ہے۔ لومڑی کو شیر کا زور عطا کر دیتی ہے۔

۵۔ وہ خاک کو ثریا کی بلندی پر پہنچا دیتی ہے۔ قطرے میں سمندر کی وسعتیں پیدا کر دیتی ہے۔

۶۔ وہ ایسی شراب ہے کہ جہاں موت کی سی خاموشی طاری ہو، وہاں قیامت کا ہنگامہ بپا کر دیتی ہے۔ اُس سے چکور کے پنجے میں اتنی قوت آ جاتی ہے کہ وہ باز کے لہو سے سرخ ہو جاتا ہے۔

۷۔ اے ساقی! اُٹھ اور میرے پیالے میں خالص شراب ڈال دے۔ میری فکر کی رات پہ چاندنی بکھیر دے یعنی

اسے نور سے جگمگا دے۔

۸۔ تاکہ میں گم کردہ راہوں اور بے مقصد تگ و دو کرنے والوں کو منزلِ مقصود کی طرف لے چلوں۔ ان کی تگ و دو کو نتیجہ خیز بناؤں اور نگاہوں میں بیتابی کا ذوق پیدا کر دوں۔

۹۔ نئی جستجو کی تڑپ میں بیخودانہ گام زن ہو جاؤں، اور نئی آرزو سے رُوشناسی حاصل کروں۔

۱۰۔ اہلِ ذوق کی آنکھ میں پتلی بن جاؤں۔ دنیا کے کان میں آواز کی طرح گم ہو جاؤں۔

۱۱۔ شعر و سخن کے مال کی قیمت بڑھا دوں اور اپنے آنسوؤں کے موتی بھی اس میں شامل کر دوں۔

۱۲۔ اے ساقی! مجھ پر کرم فرما کہ میں پیر رُومؒ کے فیض سے پھر وہ دفترِ دنیا کو سنا دوں، جس میں علوم کے اسرار بند ہیں۔

۱۳۔ پیر رومیؒ اپنے اندر شعلوں کا خزانہ لیے ہوئے تھے۔ میری حیثیت کیا ہے؟ چنگاری کی طرح دم بھر کے لیے چمکنا اور بس۔

۱۴۔ جلتی ہوئی شمع نے میرے پروانے پر یورش کر دی۔ شراب نے میرے ساغر پر چھاپا مارا۔

۱۵۔ پیر رومؒ نے میری خاک کو اکسیر بنا دیا اور میرے غبار سے رنگا رنگ جلوے پیدا کر دیے۔

۱۶۔ ذرّے نے بیابان کا سر و سامان فراہم کیا تاکہ وہ سورج کی کرن سے فیض یاب ہو سکے۔

۱۷۔ میں موج ہوں اور پیر رومؒ کے سمندر میں بسیرا کر لیا ہے تاکہ مجھے چمکتا ہوا موتی مل جائے۔

۱۸۔ میں پیر رومؒ ہی کی شراب سے مست رہتا ہوں اور اسی کے اشعار پڑھ کر جیتا ہوں۔

پیر رومیؒ کا ارشاد | یارب ۔ فریاد اور دُہائی۔

پرکالہ ۔ ٹکڑا ۔ حصہ۔

کسوت ۔ لباس۔

طے ۔ لیلیٰ کے قبیلے کا نام۔

ژندہ ۔ پُرانا، کہنہ، فرسودہ، مست جیسے ژندہ بیل۔ یہ لفظ ژاے فارسی سے ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر ایڈیشن میں غلط یعنی زندہ چھپا ہے۔

۱۔ رات میرا دل فریاد پر مائل تھا۔ میری آہ و فغاں سے خاموشی کی دُنیا آباد تھی۔ یعنی ہر طرف سناٹا چھایا ہُوا تھا، اس لیے کہ سب سو رہے تھے۔ صرف میری زبان پہ یارب، یارب کی فریاد جاری تھی۔

۲۔ زمانے کے ناسازگار حالات کے باعث میں نے شکایتوں کا طوفان بپا کر رکھا تھا اور ان حالات کو سازگار بنانے کے لیے جو سامان درکار تھے، اُن سے محرومی پہ اشکبار تھا۔

۳۔ میری نگاہیں تڑپتے تڑپتے بال و پر توڑ بیٹھیں اور میں سو گیا۔

۴۔ خواب میں پیر رومؒ تشریف لائے جن کی فطرت سراپا حق تھی۔ وہی بزرگ جنھوں نے قرآن کے حقائق پہلوی میں پیش کیے۔

۵۔ فرمایا! اے عشق والوں کے دیوانے! عشق کی شراب ناب سے تو بھی ایک گھونٹ پی لے۔

۶۔ اپنے جگر میں قیامت کا ہنگامہ پیدا کر۔ صراحی سر پر مار اور نشتر سے آنکھیں پھوڑ۔

مطلب یہ کہ راحت و تن آسانی سے کنارہ کش ہو جا اور محنت و مشقت کی زندگی بسر کر۔

۷۔ ہنسی کو سیکڑوں فریادوں کا اصل و سرمایہ بنا لے۔ خون کے آنسو اتنے سرخ ہونے چاہییں گویا جگر کے ٹکڑے ٹوٹ کر نکل کر آ رہے ہیں۔

۸۔ تو کب تک کلی کی طرح چپ بیٹھا رہے گا؟ اپنی خوشبو کو پھول کی طرح ہر طرف بکھیر دے۔

۹۔ حرمل کے دانے کی طرح تیری گرہ میں بھی ایک ہنگامہ موجود ہے، بشرطیکہ تو بھی اپنا سرو سامان اٹھا کر آگ پر رکھ لے۔

۱۰۔ تیرے جسم کے ہر عضو میں بھی خاموش نالے موجود ہیں، تو بھی انھیں جرس کی طرح باہر نکال۔

۱۱۔ تو آگ ہے، زمانے کی محفل کو جگمگا دے۔ جس جلن سے تو خود جل رہا ہے، اسی سے دوسروں کو بھی جلا کر رکھ دے۔

۱۲۔ پیر مغاں کے بھید کھول کر بیان کر دے۔ شراب کی موج بن جا اور مینا کا لباس پہن لے۔

۱۳۔ تیری عقل نفع و نقصان کے چکر میں ہے، اس کے آئینے پر پتھر بن کر گر اور اسے چکنا چور کر دے۔ راز چھپا کر نہ رکھ بلکہ انھیں سب کے سامنے کھول کر بیان کر دے۔

۱۴۔ تیری حیثیت ایک نے کی ہے۔ تیرے لیے لازم ہے کہ اپنے نیستان کے متعلق سب کو پیغام سنا دے۔ محبوب کو ہمیشہ محبوب کے پیغام کی ضرورت رہتی ہے۔ تو قیس کو لیلیٰ کے قبیلے کی جانب سے لطف و محبت کا پیغام پہنچا۔

۱۵۔ آہ و فغاں میں نیا انداز اور نیا اسلوب پیدا کر۔ محفل کو ہاؤ ہو سے گرما دے۔

۱۶۔ اٹھ اور ہر کہنہ و فرسودہ جسم میں نئی روح پھونک دے اور قم کہہ کر زندوں کو مزید زندگی بخش دے۔

۱۷۔ اٹھ اور نئے راستے پر قدم رکھ۔ نئے مسلک پر کاربند ہو۔ جو جنون پہلے سے تیرے سر پہ سوار ہے، اسے اتار دے۔ یعنی پرانے مسلک سے کنارہ کش ہو جا۔

۱۸۔ تو کیوں چپ بیٹھا ہے؟ بات کہنے اور پیغام پہنچانے میں بڑی لذت ہے۔ اس کا مزہ چکھ۔ تجھے قافلے میں جرس کی حیثیت حاصل ہے۔ تیرا منصب یہی ہے کہ خود جاگ اور دوسروں کو جگا۔

یہاں تک وہ تلقین تھی جو پیر رومؒ نے خواب میں شاعر تک پہنچائی۔ اب شاعر اس تلقین کے اثرات پیش کرتا ہوا کہتا ہے:

۱۹۔ پیر روم کی اس تلقین نے مجھے حد درجہ بیتاب کر دیا اور میں بانسری کی طرح نغموں کے ہنگامے سے لبریز ہو گیا۔

۲۰ - میں اپنے ساز کے تار سے زمزمہ بن کر اٹھا اور دنیا کے کانوں کے لیے ایک بہشت آراستہ کر دی۔

مراد یہ کہ زمزمے میں اس درجہ لذت، شیرینی اور جاذبیت تھی، گویا ہر فرد کی قوتِ شنید بہشت کی بہاریں لوٹنے لگی

۲۱ - میں نے خودی کے راز سے پردہ اٹھایا اور اس کے اعجاز کھول کر بیان کر دے۔

اسرارِ خودی کا مقصد! انگارہ۔ نقش ناتمام۔ خاکہ۔

سوہان - ریتی، جس سے آلات تیز کیے جاتے ہیں۔

کیف و کم - کیسا اور کتنا۔ کیفیت اور مقدار۔ کیف و کم سے مراد اس دنیا کی تمام چیزیں اور ان کی کیفیات ہیں۔

اعصاب! عصب کی جمع۔ رگ پٹھے۔

تقویم - لغوی معنی، قائم کرنا۔ اصطلاح میں اُن اوراق کو کہتے ہیں، جن پر علم نجوم کے رو سے زمانے کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

راغ - جنگل

تبار - خاندان۔ نسل۔

عذوبت - مٹھاس - شیرینی

خُردہ گرفتن - نکتہ چینی - عیب جوئی - اعتراض کرنا۔

خُردۂ مینا - خُردہ کے معنی ہیں ٹکڑا - خردۂ مینا سے مراد شراب ہے۔

۱ - میرا وجود ایک ناتمام نقش تھا، جس کی حیثیت ایک بیرنگ خاکے کی تھی۔ نہ کوئی اُسے قبول کر سکتا تھا، نہ اس میں کوئی خوبی تھی، نہ وہ کسی کام آ سکتا تھا۔

۲ - مجھ پر عشق کی ریتی لگی اور میں نے آدمی کی صورت اختیار کر لی۔ ساتھ ہی میں دنیا کی تمام چیزوں اور اُن کی کیفیتوں سے آگاہ ہو گیا۔

۳ - میری بلند نظری اور باریک بینی اتنی بڑھ گئی کہ آسمان کے پٹھوں کی حرکت بھی میں نے دیکھ لی اور چاند کی رگوں میں مجھے خون دوڑتا ہوا نظر آیا۔

مطلب یہ کہ میں نے کائنات کے بعید ترین اجسام کی بھی خوب چھان بین کر لی۔

۴ و ۵ - میں نے راتیں انسانوں کے غم میں روتے روتے گزار دیں۔ آخر قدرت نے زندگی کے رازوں کا پردہ میرے لیے چاک کر دیا۔ ممکنات کے کارخانے سے میں نے زندگی کے قیام اور استحکام کا بھید پا لیا۔

۶ - میں نے زندگی کی تاریکی میں اسی طرح آرائش کا سامان پیدا کر دیا جس طرح چاند، رات کے لیے آرائش کا سامان بن جاتا ہے۔ واضح رہے کہ میں ملّتِ اسلامیہ کے پاؤں کی خاک ہوں۔

Patna ۱۹۳۸ پٹنہ

۷- کون سی ملت ؟ وہ جس کی شہرت سے جنگل اور باغ گونج رہے ہیں، جس کے تازہ گیت دلوں کو گرما دیتے ہیں۔

۸- وہ ملت، جس نے ذرہ بویا اور سورج حاصل کر لیا، جس کا کھلیان سیکڑوں رومیوں اور عطاروں سے بھرا پڑا ہے۔

۹- میں ایک گرم آہ ہوں اور اپنی تب و تاب کی بدولت آسمان پر جا پہنچتی ہوں۔ بلا شبہہ میں دھواں ہوں اور آہ کو دھواں ہی قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن میری اصل و نسل تو آگ ہی ہے۔

۱۰- میرے قلم نے فکر کی بلندی کے بل پر ان نو پردوں کے راز سب کے لیے کھول دیے۔ نو پردوں سے مراد اصطلاح ادب میں نو آسمان ہیں۔

۱۱- اس پردہ کشائی کا مدعا یہ ہے کہ قطرہ سمندر کے برابر پہنچ جائے۔ ذرہ بڑھتے بڑھتے صحرا بن جائے۔

۱۲- واضح رہے کہ مثنوی لکھنے کا اصل مقصد شاعری کے کمالات دکھانا نہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ عام شاعروں کی طرح بت بنا کر آراستہ کرتا جاؤں اور بت پرستی کی دعوت دیتا رہوں۔

۱۳- میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں اور فارسی میری مادری زبان نہیں۔ اس لحاظ سے میری مثال ہلال کی ہے، جس کا پیالہ خالی ہوتا ہے۔

۱۴- اے مخاطب! میرے بیان سے انداز و اسلوب کے حسن کی توقع نہ رکھ۔ میں ان خوبیوں کا حامل نہیں ہو سکتا، جو فارسی زبان میں خوانسار اور اصفہان کے شاعر پیش کر سکتے ہیں۔

خوانسار اور اصفہان ایران کے دو مشہور مقام ہیں، جہاں بہت سے شاعر پیدا ہوئے، لیکن یہاں محض مثلاً ان کا ذکر کیا گیا۔ ایران کے دوسرے مقامات بھی ان میں شامل سمجھنے چاہییں۔

۱۵- اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اردو کو شیرینی اور مٹھاس میں شکر کی حیثیت حاصل ہے، لیکن فارسی کے طرز سخن میں زیادہ مٹھاس پائی جاتی ہے۔

۱۶- میری فکر پر فارسی کی جلوہ افروزی کا جادو چل گیا اور اس جلوہ افروزی کی بدولت میرا قلم طور کے درخت کی شاخ بن گیا۔

۱۷- میرے افکار بہت بلند ہیں اور فارسی کو ان افکار کی فطرت سے بہت مناسبت ہے۔

۱۸- اے ہوشمند مخاطب! میں نے اپنی شراب کے لیے جو صراحی پسند کی، اس پر اعتراض نہ کر بلکہ اپنے دل کو شراب کی لذت سے وابستہ کر لے۔

یہاں حضرت علامہ نے "اسرار خودی" کے لیے فارسی زبان اختیار کرنے کی دو وجہیں پیش کیں۔ اول یہ کہ اردو کے مقابلے میں فارسی زیادہ میٹھی ہے، دوم یہ کہ بلند افکار کو اچھے انداز میں پیش کرنے کے لیے فارسی زیادہ موزوں ہے۔ اس لیے کہ اردو کے بجائے فارسی میں اختصار و بلاغت کا امکان زیادہ ہے، لیکن ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ مثنوی صرف پاک و ہند کی وسیع سرزمین کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے یا حقیقتاً

پورے عالم انسانیت کے لیے لکھی گئی تھی اور عالم اسلام میں فارسی زبان زیادہ وسیع حلقے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ گویا اس ذریعے سے حضرت علامہ اپنے افکار براہ راست مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ حلقے تک پہنچا سکتے تھے

ایک گزارش اور بھی یہ کہ حضرت علامہ نے از روے انکسار جو معذرت پیش کی وہ ان کی عظمت کا ایک خاص نشان ہے۔ ممکن ہے، مثنوی کے بعض اسلوب اہل ایران کے موجودہ شیوں سے پوری مطابقت نہ رکھتے ہوں، لیکن نظیری، عرفی، نظیری اور غالب جیسے جلیل القدر اساتذہ کے طرز و اسلوب میں علامہ مرحوم نے جو نئی خوبیاں اور دلکشیاں پیدا کیں اور فارسی زبان کے خزینے کو جن شہوار افکار کے گوہروں سے مالا مال کر دیا، بے تکلف کہا جا سکتا ہے، ان کی نظیر گفتار کے اسلوب پر جان چھڑکنے والے ایرانی قرنوں میں بھی پیش نہ کر سکے۔

دوسرا باب

نظام عالم کی بنیاد ـــــ خودی

تمہید ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ خودی کیا ہے۔ اس کی کیفیت مختلف صورتوں میں واضح کر چکنے کے بعد یہ واضح کیا گیا ہے کہ تخلیق و تکمیل اس کا اصل منصب ہے۔ اس غرض سے وہ میدان عمل میں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اس کائنات میں جو کچھ نظر آ رہا ہے، یہ خودی ہی کی گلکاریوں کا نتیجہ ہے۔ اس کی مختلف حیثیتیں مختلف وجود بروے کار لاتی ہیں، پھر خودی کے مختلف مظاہر پیش کیے گئے ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے ضعف و قوت کا معیار کیا ہے۔ خودی ضعیف ہو تو اس کی شکل کیا ہوتی ہے اور مستحکم ہو تو وہ کون سی شکل اختیار کرتی ہے اس سلسلے میں ضعیف اور مستحکم خودی کے مختلف مظاہر پیش کر دیے گئے ہیں تاکہ حقیقت بخوبی واضح ہو جائے۔

خودی اثبات ۔ ثابت کرنا۔ ثبوت کو پہنچانا۔ قائم رکھنا۔ نفی کے برعکس۔

خصومت ۔ دشمنی ۔ بیر ۔

نیرو ۔ طاقت ۔ قوت ۔ زور ۔ بل ۔

اسراف ۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا۔ فضول خرچی ۔

علل ۔ علت کی جمع ۔ سبب ۔

وام ۔ قرض ۔ ادھار ۔

کسوت لباس ۔ پوشاک ۔

۱۔ زندگی کا وجود خودی کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔ جو کچھ تجھے نظر آرہا ہے، یہ سب خودی کے رازوں کا کرشمہ ہے۔

۲۔ جب خودی نے اپنے آپ کو جگایا تو جس شے کو ہم عقل و فکر کے رو سے دنیا کہتے ہیں، وہ نمودار ہوگئی۔

۳۔ سینکڑوں جہان خودی کی ذات میں چھپے ہوئے ہیں۔ وجودوں کا تعین خودی پر موقوف ہے۔ جب خودی تعین کرتی ہے اور اس طرح اپنا ثبات و قیام چاہتی ہے تو غیر پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ اس طرح خودی نے دنیا میں دشمنی کا بیج بو دیا اور اپنے آپ کو اپنا غیر سمجھ لیا۔

۵۔ وہ خود ہی اپنے سے غیروں کے وجود تیار کرتی ہے تاکہ جدال و قتال اور رزم و پیکار کی لذت میں اضافہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی غیر سامنے نہ ہوگا تو مسابقت کا موقع نہ آئے گا۔ مسابقت ہوگی تو لازم ہے کہ کشمکش اور رد و کد شروع ہو جائے۔ یہی رزم و پیکار ہے۔ گویا خودی اس کشمکش کی لذت میں گرمی پیدا کرنے کے لیے خود ہی غیروں کے وجود تیار کرتی ہے۔

۶۔ پھر وہ اپنے بازو کی قوت سے غیروں کے لیے فنا کا پیغام بن جاتی ہے۔ انھیں مارتی اور مٹاتی ہے۔ اس طرح اپنی طاقت اور توانائی کا اندازہ کرتی ہے۔

۷۔ غور کیا جائے تو یہ سب کچھ خودی کی خود فریبیاں ہیں، لیکن انھیں خود فریبیوں کا نام زندگی ہے۔ پھول کی طرح خون سے وضو کرنا اس کے نزدیک جینے اور زندہ ہونے کی حقیقت ہے۔

مراد یہ ہے کہ خودی قسم قسم کی تخلیقات انجام دیتی ہے تاکہ زندگی کو تکمیل کی منزل پر پہنچا دے۔ اس سلسلے میں جد و جہد، کشمکش اور تصادم بھی پیش آتا ہے، کیونکہ خودی اس تصادم کی غرض سے اغیار پیدا کر لیتی ہے لیکن یہ بجائے خود تخلیق کے سلسلے کی لازمی چیزیں ہیں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ ان اشعار میں خودی کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اشعار بھی پیشِ نظر رکھ لینے چاہییں جو اس کتاب کے چوتھے باب یعنی "خودی اور عشق و محبت" کے زیرِ عنوان مندرج ہیں یا مثنوی کے اس باب میں آئے ہیں اور جس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خودی عشق و محبت سے استحکام پاتی ہے۔

۸۔ خودی کا یہ شیوہ ہے کہ ایک حسب منشا پھول پیدا کرنے کی تمنا میں سینکڑوں گلشنوں کا خون کر ڈالتی ہے اور ایک نغمہ ترتیب دینے کی غرض سے سینکڑوں نالہ و شیون کرتی ہے۔

۹۔ ایک آسمان کی آرائش و زیبائش کے لیے سینکڑوں نئے چاند نمودار کرتی ہے اور ایک حرف مطلب کہنے کی غرض سے سینکڑوں گفتگوئیں اور مکالمے ترتیب دیتی ہے۔

۱۰۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ کھلا ہوا اسراف اور انتہائی بیدردی ہے۔ اسراف اس لیے کہ ایک پھول کی خاطر سینکڑوں

گلشن مٹائے جاتے ہیں اور اسی طرح ایک نغمے کی خاطر سیکڑوں شیون، ایک آسمان کی آرائش کے لیے سیکڑوں ہلال اور ایک حرف کے لیے سیکڑوں مقالے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ یہ بیدردی ہے، تاہم اس کے سوا چارہ نہیں کیونکہ جمالِ حقیقی کی تخلیق و تکمیل اسی پر موقوف ہے۔ اسی طرح عالمِ انسانیت اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے جو روزِ ازل سے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔

۱۱ تا ۱۴۔ پھر اسی مضمون کی مزید توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کوہکن کے دل میں جو درد و لہریں لے رہا ہے، اس کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ شیریں کا دلکش حسن۔ یہ جو سیکڑوں ہرن ختن میں چوکڑیاں بھر رہے ہیں، ان کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ نافہ۔ پروانوں کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے جلنا لکھ دیا گیا۔ ان کے جلنے کے لیے وجہ جواز شمع کی روشنی بن گئی۔ خودی نے سیکڑوں امروز کے نقش جمائے۔ غرض یہ تھی کہ آنے والی کل کی صبح ہاتھ آ جائے۔ اس کے شعلوں نے سیکڑوں ابراہیم اپنی آغوش میں لے لیے، صرف اس لیے کہ محمد مصطفیٰ ؐ کا چراغ روشن کرنے کی یہی ایک شکل تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ جمالِ معنوی کی تکمیل کے لیے ہوتا رہا۔

۱۵ا ۱۶۔ خودی کو عمل کی غرض سے مختلف روپ دھارنے پڑتے ہیں۔ وہی کارفرما قوت ہوتی ہے (عامل)، وہی کارفرمائی کا تختۂ مشق بن جاتی ہے (معمول)، وہی سبب بن جاتی ہے اور وہی ذریعہ۔ وہ اٹھتی ہے، اٹھاتی ہے، اڑاتی ہے، چمکتی ہے، بھاگتی ہے، جلتی ہے، اور روشن کرتی ہے، مارتی ہے، مرتی ہے اور دمکتی ہے۔ یہ سب مختلف روپ ہیں، جو خودی عمل کی غرض سے دھارتی ہے۔

۱۷۔ زمانے کی فراخی خودی کی جولانیوں کا میدان ہے۔ آسمان اس کے راستے کے گرد و غبار کی ایک لہر ہے۔

۱۸۔ خودی ہی کی گلکاریوں نے زمانے کا دامن پھولوں سے بھر دیا۔ وہ سو جاتی ہے تو رات ہو جاتی ہے، جاگتی ہے تو دن نکل آتا ہے۔

۱۹۔ اس نے اپنے شعلے کو چھوٹی چھوٹی چنگاریوں میں بانٹ دیا اور عقل کو جزو پرستی کی تعلیم دی۔

۲۰۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تو اجزا پیدا کر لیے۔ ذرا اپنے آپ پر آشفتگی طاری کر لی تو صحرا نمودار ہو گیا۔

۲۱۔ پھر آشفتگی سے اس کی طبیعت اکتا گئی تو تمام اجزا نے سرے سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو گئے اور پہاڑ نمودار ہو گیا۔

۲۲۔ غرض خودی کی عادت ہی یہ ہے کہ اپنے آپ کو نمایاں کرتی رہے۔ ہر ذرے میں اسی کی قوت سوئی ہوئی ہے۔

۲۳۔ وہ خود ایک خاموش قوت ہے، لیکن عمل کے لیے حد درجہ بیقرار ہے اور عمل کی غرض سے اسبابِ عمل کی پابند ہو جاتی ہے۔

خودی کے مظاہر (۱)۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ اس کائنات کی زندگی خودی کے بل پر قائم ہے تو یہ بھی واضح

ہو گیا کہ زندگی اتنی ہی مستحکم ہوگی، جتنی خودی استوار ہوگی۔

۲۔ اس دعوے کی مثالیں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب پانی کی ایک بوند خودی کا حرف حفظ کر لیتی ہے، یعنی اپنی خودی کمال پر پہنچا دیتی ہے تو اپنے بے حقیقت وجود کو موتی بنا لیتی ہے۔

۳ تا ۴۔ شراب کی خودی کمزور ہے اور اس کی اپنی کوئی شکل نہیں۔ وہ ہر پیالے یا ظرف کا احسان گوارا کر لیتی ہے اور اسی کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ پیالے کی خودی شراب سے یقیناً زیادہ مستحکم ہے، لیکن اس نے درجۂ کمال حاصل نہیں کیا، اس لیے خود گردش نہیں کر سکتا اور اس حد تک ہمارا محتاج ہے، گویا گردش ہم سے قرض لیتا ہے۔

۵۔ پہاڑ ذرّوں میں بکھر جانا قبول کرے تو وہ پہاڑ نہیں رہے گا، صحرا بن جائے گا۔ دریاؤں میں طغیانی آئے گی تو ان کا پانی صحرا میں پھر نکلے گا، گویا صحرا دریا کی طغیانی کا شکوہ گزار رہے گا۔ وہ جب تک پہاڑ تھا، طغیانی کا ہدف بن ہی نہیں سکتا تھا۔ اس پر جو مصیبت آئی، صرف خودی کو کمزور کر لینے کی وجہ سے آئی۔ نہ اس کی خودی کمزور ہوتی، نہ وہ ذرّوں میں بکھرتا اور نہ صحرا بنتا۔

۶۔ موج جب تک سمندر کے اندر ہے اور اپنی خودی برقرار رکھتی ہے تو سمندر کے کندھے پر سوار رہتی ہے۔

۷۔ نور نے اپنی خودی سے کام لے کر حلقے کی شکل اختیار کر لی تو آنکھ بن گیا اور وہ آنکھ جلووں کی تلاش میں سرگرم ہو گئی۔

۸۔ سبزے نے اپنے اندر اُگ آنے کی قوت پیدا کر لی تو اس کی ہمّت نے باغ کا سینہ چیرا اور باہر نکل آیا۔

۹، ۱۰۔ شمع نے اپنے اجزا باہم پیوست کر لیے تو اس کی ہستی کا سر و سامان فراہم ہو گیا، لیکن جب اس نے گھلنا گوارا کر لیا اور اپنی خودی سے دور ہو گئی تو اپنی آنکھ سے آنسو بن کر ٹپک پڑی۔

۱۱، ۱۲۔ اگر نگینے کی فطرت پختہ ہوتی اور اس کی خودی درجۂ کمال سے پیچھے نہ رہتی تو اس پر نام کندہ کرنے کے لیے جو زخم لگتے ہیں، وہ نہ لگائے جا سکتے۔ وہ دوسروں کا نام اپنے آپ پر قبول کر لیتا ہے، اس وجہ سے اس کا کندھا دوسرے کے نام کی خاطر زخم کھاتا ہے۔

۱۳۔ زمین نے اپنی خودی مضبوط رکھی تو چاند زمین کے ارد گرد چکر لگانے کا پابند ہو گیا۔

۱۴۔ سورج کا وجود زمین سے زیادہ پختہ خودی کا حامل تھا، لہٰذا زمین اس کی نگاہ کے جادو سے متاثر ہو گئی اور سورج کے گرد چکر لگانے لگی۔

۱۵، ۱۶۔ چنار کے درخت کی بلندی پر نظر پڑ جائے تو حیرت سے انسان کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔ پہاڑ اس درخت کی شان و شوکت کو اپنے لیے خاص دولت سمجھتے ہیں۔ اس کے لباس کا تانا بانا آگ ہے، لیکن کبھی سوچا کہ اس کی اصل کیا ہے؟ ایک چھوٹا سا دانہ جس میں گردن اونچی رکھنے کی ہمّت ہے۔

مراد یہ ہے کہ ایک چھوٹے سے دانے کی خودی نے اتنے بڑے درخت کی شکل اختیار کی جسے ہم بھی اپنے لیے باعث زینت سمجھتے ہیں۔

۱۷۔ جب خودی زندہ رہنے کی قوت بہم پہنچا لیتی ہے تو زندگی کی ندی سے بے کراں سمندر پیدا کر لیتی ہے۔

تیسرا باب

خودی اور تخلیق مقاصد

اس باب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خودی کی زندگی مقاصد کی تخلیق و تولید پر موقوف ہے۔

مقاصد کی کارفرمائی | مرکب۔ سواری۔ گھوڑا۔ کشتی وغیرہ

پیش خیز۔ خدمت گار۔

۱۔ زندگی کا وجود مقصد پر موقوف ہے۔ زندگی کے قافلے میں مقصد کو جرس کی حیثیت حاصل ہے۔

۲۔ زندگی کیا ہے؟ یہ جستجو میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ ہر وقت نئی چیز کی تلاش میں لگی رہے۔ جب تک کوئی آرزو پیش نظر نہ ہو، تگ و دو جستجو جاری نہیں رہ سکتی، گویا زندگی کی اصل و اساس آرزو ہے۔

۳۔ تو بھی اپنے دل میں آرزو کو زندہ رکھ، ورنہ تیرا جسم حقیقی زندگی سے محروم ہو جائے گا اور اس کی حیثیت ایک مزار کی سی رہ جائے گی۔

۴۔ رنگ و بو کے اس جہان میں آرزو ہی کی وجہ سے جان ہے۔ کائنات میں جو بھی چیز ہے، اس کی فطرت آرزو کی امانت دار ہے۔

۵۔ آرزو ہی کی بدولت دل سینوں میں رقصاں رہتے ہیں۔ آرزو ہی کی روشنی سے سینے آئینے بنتے ہیں۔

۶۔ آرزو خاک میں پرواز کی قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ہم اپنی عقل کو موسیٰ فرض کر لیں تو اس موسیٰ کے لیے خضر آرزو ہے۔

۷۔ دل صرف آرزو کی حرارت سے زندگی پاتا ہے۔ جب دل زندہ ہو جاتا ہے تو حق کے سوا جو کچھ ہے، سب مٹ جاتا ہے۔

۸۔ جب دل آرزو پیدا کرنے سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کے بال و پر ٹوٹ جاتے ہیں اور اس میں پرواز کی قوت باقی نہیں رہتی۔ گویا آرزو کی تخلیق سے محروم ہو جانا ایک لحاظ سے انسان کی موت ہے۔

۹۔ آرزو ہی خودی کے سینے کو ہنگامے سے آراستہ کرتی ہے۔ اسے خودی کے دریا کی ایک بے قرار موج سمجھنا چاہیے۔

۱۰۔ آرزو ہی بلند مقصدوں کے لیے کمند ہے۔ گویا آرزو کے بغیر انسان اعلیٰ مقصدوں سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔

آرزو ہی ہے، جس کی برکت سے انسان کی تمام سرگرمیاں منظم حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر کوئی آرزو پیشِ نظر نہ ہو تو انسان کے اعمال میں کبھی ضبط و نظم پیدا نہ ہو گا۔

۱۱۔ اگر زندہ انسان تمنا اور آرزو سے محروم ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مر گیا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شعلے میں جلن باقی نہیں رہتی تو اس کی ہستی ختم ہو جاتی ہے؟

حقیقت افروز مثالیں | ۱۔ ذرا غور کرو کہ قدرت نے ہمیں جو دیکھنے والی آنکھیں عطا کی ہیں، اُن کی اصل کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہمارے اندر دیکھنے کا شوق اور دید کا ذوق پیدا ہوا۔ اُسی ذوق و شوق نے ایک خاص شکل اختیار کر لی، جسے ہم آنکھ کہتے ہیں۔

۲۔ چکور کی سب سے بڑی خوبی شوخیٔ رفتار کے سوا کیا ہے؟ یہی شوخیٔ رفتار کا جذبہ تھا، جس نے خاص وضع اختیار کی تو چکور کے پاؤں بن گیا۔ بالکل یہی کیفیت بلبل کی چونچ کی ہے۔ اس میں خوش نوائی کا ایک جذبہ تھا۔ اُسی جذبے کو کام میں لانے کی کوشش چونچ کی صورت اختیار کر گئی۔ گویا شوخیٔ رفتار نہ ہوتی تو چکور کو پاؤں نہ ملتے اور نوا پیرائی کا ذوق نہ ہوتا تو بلبل چونچ سے محروم رہتی۔

۳۔ نَے نے نیستاں سے باہر نکل کر اپنی آبادی کا سروسامان کیا تو جو نغمہ اُس کے قید جانے میں بند چلا آتا تھا، وہ آزاد ہو گیا۔

۴، ۵۔ ذرا سوچو کہ یہ نادر چیزیں تلاش کرنے اور آسمان سے تارے توڑنے والی عقل کیا ہے؟ کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا، جو سراپا اعجاز ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ زندگی نے آرزوؤں کا سرمایہ فراہم کر لیا اور عقل بھی زندگی کے بطن سے پیدا ہوئی۔

۶، ۷۔ قومی نظام، قوانین اور روایات کیا ہیں؟ کس وجہ سے نئے نئے علوم پیدا ہو رہے ہیں؟ کیا کبھی اس بھید پر غور کیا؟ یہ سب آرزوؤں کے کرشمے ہیں۔ آرزوئیں پوری طاقت و قوت سے اچھلتی ہیں، اسی اچھلنے میں ٹوٹ جاتی ہیں۔ پھر دل سے باہر نکل کر مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہیں۔

۸، ۹۔ یہ ہاتھ، دانت، دماغ، آنکھ، کان کیا ہیں؟ یہ فکر، تخیل، شعور، یاد، ہوشمندی کن چیزوں کا نام ہے؟ کیا کبھی ان ظاہری اور باطنی حواس کی اصلیت پر غور کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ جب زندگی نے اپنی سواری سعی و کوشش اور تگ و دو کے میدان میں ڈالی تو اپنی حفاظت کے لیے یہ سب آلات تیار کر لیے۔

۱۰، ۱۱۔ علم و فن کا مقصد محض آگاہی یا محض علم و فن نہیں، جیسا کہ بعض حقیقت ناشناس لوگ سمجھے بیٹھے ہیں۔ باغ لگانے کا مدعا محض یہ نہیں کہ پھول اور کلیاں حاصل ہوتی رہیں۔ علم زندگی کی حفاظت کے سامانوں اور قیام و ثبات خودی کے اسباب میں ہے۔

۱۲۔ علم اور فن زندگی کے خدمت گار اور اس کے غلام ہیں۔

۱۳۔ اے مخاطب! تو زندگی کے راز سے بیگانہ نہ رہ۔ اٹھ اور بلند مقصد کی شراب سے اپنے آپ پر مستی کی کیفیت طاری کرلے۔

۱۴۔ مقصد کیسا ہونا چاہیے جو صبح کی طرح روشن ہو۔ جو ماسوا کے لیے جلا دینے والی آگ کی حیثیت رکھتا ہو۔

۱۵۔ وہ مقصد جو عظمت و رفعت میں آسمان سے بھی بلند تر ہو۔ وہ دل کو لبھالے، دل کو چھین لے اور دل پہ قبضہ کرلے۔ گویا اُس میں وہ تمام خصوصیتیں ہونی چاہییں جو انسان پر جہد و عمل کی وارفتگی طاری کردیں۔

۱۶۔ ایسا مقصد جو قدیم باطل کو فنا کردے۔ غیر حق کے لیے اُس کے اندر فتنوں کی آگ بھڑک رہی ہو اور وہ خود سراپا قیامت ہو۔

۱۷۔ واضح رہے کہ ہم اُسی وقت تک زندہ ہیں، جب تک بہتر مقاصد پیدا کرتے رہیں۔ آرزو ہی کی کرن سے ہمیں چمک دمک نصیب ہے۔

چوتھا باب
خودی اور عشق و محبت

اس باب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خودی عشق و محبت سے استحکام پاتی ہے۔

حقیقتِ عشق | اشتعال۔ بھڑکانا۔ بھڑکنا۔ روشن کرنا۔ روشن ہونا۔

ارتقاء۔ ترقی کرنا۔ بلند ہونا۔ نشو و نما پانا۔

مضمر۔ پوشیدہ۔

شق۔ پھٹنا۔ چیرنا۔

۱۔ نور کا وہ نقطہ، جس کا نام خودی ہے، ہماری خاک کے اندر زندگی کی ایک چنگاری ہے۔ گویا ہماری زندگی خودی ہی پر منحصر ہے۔

۲۔ خودی عشق و محبت کی برکت سے زیادہ پائدار، زیادہ زندہ، زیادہ جلانے والی اور زیادہ چمکیلی بن جاتی ہے محبت کی بدولت خودی کے تمام اوصاف زیادہ پختگی اور استواری حاصل کرلیتے ہیں اور اُن کی قوت کارفرمائی بہت بڑھ جاتی ہے۔

۳۔ محبت ہی کی بدولت خودی کے جوہر اُبھرتے اور جلا پاتے ہیں۔ محبت ہی سے اُن جوہروں کی جلوہ خودی

درجہ کمال پر پہنچتی ہے۔ قدرت نے خودی کے اندر جو صلاحیتیں پوشیدہ رکھی ہیں، وہ محبت ہی کی برکت سے نشو و نما پاتی اور بلند تر ہوتی ہیں۔

۴۔ خودی کی فطرت عشق ہی سے حرارت حاصل کرتی ہے اور عشق ہی اُسے زمانہ بھر کو جگمگانے اور نور سے بھر دینے کا طریقہ سکھاتا ہے۔

۵۔ عشق کو تیغ و خنجر سے کیا ڈر ہو سکتا ہے؛ تیغ و خنجر کا وار صرف اُن چیزوں پر چل سکتا ہے جو مادّی اور جسمانی ہوں اور مٹی، پانی، ہوا اور آگ کے عناصر سے بنی ہوں۔ عشق کی اصلیت تو ان عناصر سے نہیں۔

۶۔ دنیا میں صلح و جنگ کے جو سلسلے جاری ہیں، اُن سب کی اصل و بنیاد عشق ہی ہے۔ آبِ حیات عشق ہی کی جوہر دار تلوار ہے۔
پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر صلح و جنگ کی حقیقت پر غور کرو گے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان کی اصل و اساس عشق کے سوا کچھ نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ واضح کر دیا کہ صلح و جنگ کی بنیاد عشق کے سوا کچھ نہ ہونی چاہیے۔
دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی زندگی صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے۔ جسے عشق نصیب ہو گیا سمجھ لینا چاہیے کہ اُس نے آبِ حیات پی لیا۔

۷۔ عشق کی نگاہ میں وہ قوت ہے جو پتھر پیر ڈالتی ہے۔ حق کے ساتھ عشق آخر خود حق بن جاتا ہے۔

۸۔ تو بھی عاشقی سیکھ اور کسی محبوب کا طلبگار ہو۔ تو بھی قضا و قدر سے حضرت نوحؑ کی سی آنکھ اور حضرت ایوبؑ کا سا قلب مانگ۔
دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مراد ہے کہ آنکھ حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت سے بہرہ مند ہونی چاہیے اور عشق کے واجبات وہی قلب ٹھیک ٹھیک ادا کر سکتا ہے، جس میں صبر و تحمل اعلیٰ پیمانے پر موجود ہوں۔ وہ ہر قسم کی سختیاں، ہر درجے کی مشقتیں اس طرح برداشت کرے، گویا وہ اس کی زندگی کے فرائض میں داخل تھیں۔

۹۔ اپنی خاک کی مٹھی سے کیمیا پیدا کر اور کسی کامل انسان کے آستانے پر بوسہ دے۔ گویا انسانی خاک کی مٹھی اُسی وقت اکسیر بنتی ہے، جب اُسے کسی کامل انسان سے تربیت پانے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔

۱۰۔ تو بھی پیرِ رُوم کی طرح اپنی شمع روشن کر لے اور روم کو اُسی طرح تبریز کی آگ سے جلا، جس طرح پیرِ رُوم نے اپنا باطن شمس تبریزی کی نگاہِ لطف سے سراپا سوز بنا لیا تھا۔

رسولِ اکرم صلعم	کاسب۔ کسب کرنے والا۔ کمانے والا۔

حرا۔ مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک ٹیلا عرفات کے راستے سے کسی قدر ہٹا ہوا ہے، جسے پہلے جبل حرا کہتے تھے اور اب اُس کا مشہور نام جبلِ نور ہے۔ اس ٹیلے کی عام وضع ایک بہت بڑے برج کی سی ہے اور چکر کھاتے ہوئے اس پر چڑھتے ہیں۔ اس کے اوپر جو چوٹی سے کوئی بیس پچیس فٹ نیچے تھوڑا سا حصہ قدرے ہموار ہے۔ جہاں دو بڑی سلیں اوپر سے مل کر ایک تنبوڑی کی شکل اختیار

کر گئی ہیں۔ اس حصے میں ایک آدمی کھڑا ہو کر بہ سہولت نماز ادا کر سکتا ہے۔ پچھلے حصے کی طرح سامنے کا حصہ بھی کھلا ہوا ہے، جہاں سے شہر مکۂ معظمہ اور حرم پاک صاف نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نبوت سے چند سال پیشتر اسی پہاڑ پر تشریف لے جاتے تھے اور اسی قدرتی تنبوئی میں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے، جسے عام اصطلاح میں غار کہتے ہیں۔ اسی مقام پر عبادت کرتے ہوئے جبریلؑ پہلے پہل حضورؐ کے روبرو نمودار ہوئے تھے اور نبوت کی خوش خبری پہنچائی تھی۔ یہیں قرآن مجید کا نزول شروع ہوا تھا۔ نیچے سے غار تک پہنچنے میں تقریباً پینتیس منٹ لگ جاتے ہیں۔

نوم۔ خواب۔ نیند۔

ہیجا۔ کارزار۔ جنگ۔

۱۔ اے مسلمان! تیرے دل میں بھی ایک محبوب چھپا ہوا ہے۔ اگر تو چشم بصیرت رکھتا ہے تو آ میں تجھے دکھا دوں۔

۲۔ وہ ایسا محبوب ہے کہ اس سے محبت کرنے والے لوگ حسینوں سے زیادہ اچھے، زیادہ خوش وضع، زیادہ زیبا اور زیادہ پیارے ہیں۔

۳۔ وہ ایسا محبوب ہے، جس کے عشق سے دل میں قوت و توانائی پیدا ہوتی ہے اور خاک کا درجہ بلند ہوتے ہوتے ثریا کے برابر پہنچ جاتا ہے۔

۴۔ نجد کی خاک اسی محبوب کے فیض سے جرأت و چالاک اور ہوشمند بن گئی۔ اس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ آسمانوں پر جا پہنچی۔

۵۔ اے مسلمان! کیا تو اس محبوب سے واقف ہے جو تیرے دل میں چھپا ہوا ہے؟ یاد رکھ کہ تیرا دل رسول اللہ صلعم کی قیام گاہ ہے۔ حضورؐ ہی کا اسم گرامی ہمارے لیے عزت و آبرو کا سرمایہ ہے۔

۶۔ طور کو اتنا بلند پایہ مانا جاتا ہے، لیکن انوار الٰہی کے نقطۂ نگاہ سے طور حضورؐ کے غبارِ خانہ کی ایک موج ہے کعبے کے لیے حضورؐ کا کاشانہ خود حرمت والے گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۷۔ ابد تک کی مدت ہمارے ہاں لمبائی کی انتہائی تعبیر مانی جاتی ہے، لیکن یہ مدت حضورؐ کے اوقات میں سے ایک لمحہ ہے۔ گویا ابد حضورؐ ہی کی ذات سے اپنے لیے طوالت کا سروسامان حاصل کرتا ہے۔

۸۔ حضورؐ کی سادگی اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ خواب راحت کا وقت آتا تو بوریے کو زیر بار احسان فرماتے، دوسری طرف امت کو یہ درجہ عطا ہوا کہ اس نے کسریٰ کا تاج پاؤں کے نیچے روند ڈالا۔

۹۔ حضورؐ نے حرا کے شبستان میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور اسی گوشہ نشینی میں ایک قوم پیدا کر دی۔ اس کے لیے اللہ کی بارگاہ سے ایک قانون نازل ہوا اور ایک نظام حکومت تیار ہو گیا۔

۱۰- حضورؐ نے راتیں بیداری میں گزار دیں اور نیند سے محرومی گوارا فرمائی۔ اسی کی برکت تھی کہ قوم کو بادشاہی تخت پر سونا نصیب ہوا۔

۱۱- لڑائی کے وقت حضورؐ کی تلوار لوہے کو پانی کر کے بہا دیتی تھی۔ نماز کا وقت آتا تھا تو حضورؐ کی مبارک آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔

۱۲- بارگاہِ الٰہی میں فتح کے لیے دعا فرماتے تو حضورؐ کی تلوار آمین کہتی۔ یہی تلوار تھی، جس نے بادشاہی کی نسلوں کا سلسلہ کاٹ کر رکھ دیا۔

حضورؐ دعا بھی فرماتے اور فتح و نصرت کا ہونا صرف اللہ تعالیٰ کے فضل پہ ہوتا لیکن ساتھ ہی تلوار بھی چلاتے۔ حضورؐ نے بادشاہوں کا وہ سلسلہ ختم کر دیا جو دنیا کے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے حق ناشناسی سے پھر وہی سلسلہ قائم کر لیا جس کی پاداش کسی شرح کی محتاج نہیں۔

۱۳- حضورؐ نے اس دنیا میں نئے قانون اور نئے نظام کی بنیاد رکھی۔ پہلی قوموں نے جو مسندیں بچھا رکھی تھیں ان سب کو الٹ کر رکھ دیا۔

۱۴- حضورؐ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ یعنی دینی نظام کو تمام دنیوی معاملات کی بنیاد و اساس بنایا۔

حق یہ ہے کہ مادرِ زمانہ کے بطن سے حضورؐ جیسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔

"اسرارِ خودی" پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو مختلف افراد کی طرف سے اس پر اعتراضات شروع ہو گئے تھے۔ ان میں خواجہ حسن نظامی مرحوم پیش پیش تھے۔ خود اقبالؔ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا تھا اور اخبار "وکیل" امرتسر میں ایک سے زیادہ مضمون ان کی طرف سے شائع ہوئے تھے۔ ایک مضمون میں ضمناً اس شعر کی شرح بھی لکھ دی۔ فرماتے ہیں: "میرا مذہب یہ ہے کہ اسلام نے دین و دنیا کے فرائض کو یکجا کیا ہے اور اس طرح بنی نوعِ انسان کے لیے ایک معتدل راہ قائم کی ہے۔ جہاں یہ سکھایا کہ تمہارا مقصود صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہے، وہاں یہ تعلیم بھی دی کہ لا تنس نصیبک فی الدنیا دنیا میں اپنا حصہ فراموش نہ کر۔۔۔ جب میں رسول اللہ صلعم کی نعت میں یہ کہتا ہوں۔ از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد تو میرا مطلب اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ نبی کریمؐ نے دین کی وساطت سے دنیا میں حصہ لینا سکھایا۔ خدائے تعالیٰ نے مسلم کو ہدایت کی کہ دنیا میں اپنا حصہ فراموش نہ کر پھر اس حصے کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ اسی کا نام شریعتِ اسلامیہ کا وہ حصہ ہے جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

۱۵- حضورؐ کی نگاہوں میں وہ سب لوگ ایک درجہ رکھتے تھے، جنھیں فرق و امتیاز کی خوگر دنیا نے اعلیٰ و ادنیٰ میں تقسیم کر رکھا تھا۔ حضورؐ تو غلاموں، چاکروں اور نیازمندوں کے ساتھ ایک دسترخوان پہ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے۔

مصاف - فوجی صف بندی کا مقام۔ جنگ کا میدان۔

سردار طے کی بیٹی کا واقعہ

طے۔ عرب کا ایک قبیلہ جس سے مشہور سخی حاتم کا تعلق تھا۔

۱۔ آسمان کے لیے جس وجودِ مبارک کا تخت بننا باعثِ شرف تھا، اس کے سامنے ایک لڑائی میں قبیلۂ طے کے سردار کی بیٹی قید ہو کر آئی۔

۲۔ اُس کے پاؤں میں زنجیر تھی اور اس کے لیے پردے کا کوئی سامان نہ تھا۔ شرم و حیا کے باعث اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

۳۔ رسول اللہ صلعم نے لڑکی کو بے پردہ دیکھا تو فوراً اپنی چادرِ مبارک اُس کے چہرے پر ڈال دی۔

اگرچہ خاتون کا تعلق فریقِ مخالف سے تھا اور وہ میدانِ جنگ میں گرفتار ہوئی تھی، لیکن رسول اللہ صلعم کو اس حال میں بھی اُسے سامانِ عزت و احترام سے محروم رکھنا گوارا نہ ہوا۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہی اقبالؔ کو اپنی قوم کی حالتِ بیچارگی یاد آ گئی، چنانچہ انتہائی درد و سوز کا یقین کرتے ہیں:

۴۔ ہم قبیلۂ طے کی اُس خاتون سے بدرجہا زیادہ برہنہ ہیں۔ دنیا کی قوموں کے سامنے ہم عزت و احترام کی چادر سے محروم ہو چکے ہیں۔

۵۔ بلا شبہہ قیامت کے دن ہمارا یقین و اعتماد حضورؐ ہی پر ہے، لیکن اس زندگی میں بھی ہماری پردہ داری حضورؐ ہی کی ذات سے قائم رہ سکتی ہے۔

حضور اکرمؐ اور وحدتِ ملّت

لاتثریب:۔ اس سے اشارہ سورۂ یوسفؑ کی آیت لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں) کے ٹکڑے کی طرف ہے۔ یہ ٹکڑا رسول اللہ صلعم نے فتحِ مکہ کے موقع پر تلاوت فرمایا تھا۔ قریش بے دست و پا ہو چکے تھے۔ اُن کا غرور ٹوٹ چکا تھا۔ مسلمانوں پر بیس بائیس سال کے ظلم و جور انھیں دردناک انجام کا خوف دلا رہے تھے۔ حضورؐ نے پوچھا: "آج تم لوگ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟" وہ بولے: "آپ کریم ہیں، ابنِ کریم ہیں۔" فرمایا: "میں آج وہی کہوں گا جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا:

"لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" جاؤ، تم سب آزاد ہو۔

بطحا۔ لفظی معنی سَیل کی وسیع گزرگاہ، جس میں ریت اور باریک سنگریزے ہوں۔ مکۂ مکرمہ کی وادی۔ بعض اوقات اس سے خود مکۂ معظمہ مراد لی جاتی ہے۔

مکنون۔ پوشیدہ۔

۱۔ حضور اکرمؐ کا لطف و قہر دونوں سراپا رحمت تھے۔ لطف و کرم حضورؐ کے نیازمندوں کے لیے رحمت تھا اور قہر دشمنوں کے لیے رحمت تھا اس لیے کہ اُن کی تادیب منظور تھی تاکہ وہ سیدھے راستے پر آ جائیں اور اللہ کی رحمت و برکت سے فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ حضورؐ نے دشمنوں پر بھی رحمت و شفقت کا دروازہ کھول دیا۔ مکۂ معظمہ میں بسنے والے اُن قریش کو جو بیس بائیس سال تک مسلمانوں پر گوناگوں ظلم کر چکے تھے، لاتثریب اور معافی کی بشارت دے دی۔

۳۔ حضورؐ کی رحمت نے ہمیں وطنیت کی اُس زنجیر سے آزاد کر دیا ہے، جس میں اہلِ یورپ یا اُن کی پیروی کرنے والی دوسری قومیں جکڑی ہوئی ہیں۔ ہماری حالت نگاہ کی ہے کہ اگرچہ ہم دونوں آنکھوں کا نور ہیں لیکن ایک ہیں۔

یورپی وطنیت نے انسانوں کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا اور انسانی وحدت کے لیے کام جاری رکھنے کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ اسلام پوری کائنات انسانیت کے درمیان برادری اور اخوت کے رشتے پیدا کرنا چاہتا تھا، لہٰذا یورپی قومیت کے مطابق انسانیت کی تفریق کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ تمام مسلمانوں کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کرنا انسانیت کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان روئے زمین کے جس حلقے میں پیدا ہوتا ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دینے میں توقف کرے، جیسا کہ بعض سطح بیں غلطی سے سمجھ بیٹھے ہیں۔ اقبالؒ نے آنکھوں اور نگاہ کی مثال دے کر یہ پہلو بھی واضح کر دیا کہ نگاہ دونوں آنکھوں کا نور ہوتی ہے، پھر بھی ایک رہتی ہے۔ اسی طرح ہر مسلمان گروہ اپنے اپنے حلقے کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے کر بھی عالمگیر برادری کے رشتے پائدار و استوار رکھ سکتا ہے اور رکھنے چاہییں۔

۴۔ ہم حجاز کے رہنے والے ہوں یا ہمارا تعلق چین و ایران سے ہو۔ لیکن ہم سب ایک ہی نورانی اور خنداں صبح کی شبنم ہیں۔ صبحِ خنداں رسول اللہ صلعم کی ذاتِ بابرکات ہے۔

۵۔ ہم ساقیٔ بطحا کے کیفِ چشم کے سرشار ہیں اور ہماری مثال دنیا میں شراب اور صراحی کی ہے جو ایک دوسری سے الگ نہیں ہو سکتیں۔

۶۔ حضورؐ نے اصل و نسل کا امتیاز یکسر جلا کر خاک کر دیا۔ ان چیزوں کی حیثیت باغ میں خس و خاشاک کی سی تھی۔ آپؐ نے انھیں پھونک ڈالا۔

۷۔ تم نے گلِ صد برگ کو دیکھا ہوگا۔ اگرچہ اُس کی پتّیاں بہت سی ہوتی ہیں، تاہم ہر پتّی سے ایک ہی قسم کی خوشبو نکلتی ہے۔ یہی حال ہمارا ہے۔ ہماری تعداد کتنی ہی ہو جائے، لیکن ہمارے نظام کی لڑی در اصل حضورؐ ہیں۔ حضورؐ ایک ہیں، لہٰذا ہم سب ایک ہیں۔

۸۔ ہم حضورؐ کے قلبِ مبارک میں ایک چھپا ہوا بھید تھے، جو انسانیت کی شکل میں نمود و نمائش کا خواہاں ہوا۔ حضورؐ نے کلمۂ توحید کا نعرہ لگایا اور وہ بھید کھل کر ہماری صورت میں نمایاں ہو گیا۔

<u>عشقِ رسولؐ</u> آنوآ۔ دوستی۔ محبت۔

آذار۔ ایک شمسی مہینا جو ہمارے ہاں کے دیسی مہینوں کے مطابق چیت میں ہوتا ہے۔ ایلن

پس یہ بہار کا موسم ہے۔ لہٰذا ابرِ آذار سے ابرِ بہار مراد ہے۔

۱۔ میری بانسری اگرچہ خاموش ہے، لیکن رسول اللہ صلعم کے عشق و محبت کا جوش و خروش اس میں بھرا ہُوا ہے۔ میرے پہلو میں اس عشق و محبت کے سیکڑوں نغمے تڑپ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد دنیا کے کانوں تک پہنچ جائیں۔

۲۔ میں کیا کہوں کہ محبت کیا چیز ہے۔ میری گویائی کی طاقت اُس کی حقیقی حیثیت بیان کرنے سے قاصر ہے۔ حضورؐ اس درجہ محبوب ہستی تھے کہ خشک لکڑی پر آپ کی جدائی میں گریہ طاری ہو گیا۔

اس میں ایک خاص واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے مسجدِ نبویؐ میں منبر نہ تھا، مسجد کی چھت جن ستونوں پر قائم تھی، وہ نخلِ خرما کے تنے سے بنے تھے۔ حضورؐ ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ منبر تیار ہُوا تو آپ نے اُس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا شروع کیا۔ اس اثنا میں لوگوں نے سنا کہ ستون سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ بعض راویوں نے اسے بچوں کے رونے سے، بعض نے اونٹنیوں کے بلبلانے سے تشبیہ دی۔ حضورؐ گریے کی آواز سنتے ہی منبر سے اترے۔ تسکین کی غرض سے ستون پر دستِ مبارک رکھا۔ پھر اُسے سینے سے لگایا۔ آواز بند ہو گئی۔ آپ نے فرمایا۔ ستون کا رونا اس وجہ سے تھا کہ پہلے یہ خدا کا ذکر سنا کرتا تھا۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جس وجودِ پاک کی جدائی میں خشک لکڑی رونے سے باز نہ رہ سکی، اس کے ساتھ محبت کی کیفیت میری زبان کیونکر ادا کر سکتی ہے؟[1]

۳۔ مسلمان کا وجود حضورؐ کی تجلیات کا کرشمہ ہے۔ حضورؐ کی گردِ راہ کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اُس سے قدم قدم پر طُور جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

۴۔ جس طرح عکس کا وجود آئینے پر موقوف ہے، اُسی طرح ہمارے پیکر کا وجود حضورؐ کے آئینے سے نمایاں ہُوا۔ حضورؐ کے سینۂ مبارک کا سورج چمکا تو اس سے ہماری صبح نمودار ہوئی۔

۵۔ میرے آرام و سکون کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ حضور صلعم کی محبت میں ہر آن اور ہر لمحہ تڑپتا رہوں۔ میری تڑپ کا اندازہ کرنا ہو تو یوں کر سکتے ہو کہ میری شام قیامت کی صبح سے بھی زیادہ گرم ہے۔

صبح کے مقابلے میں شام ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے، کیونکہ صبح کے بعد سورج بلند ہوتا جاتا ہے اور وہی حرارت و گرمی کا اصل سرچشمہ ہے۔ شام کو سورج غروب ہو جاتا ہے اور اس کی پیدا کی ہوئی گرمی بھی آہستہ آہستہ خنکی سے بدلتی جاتی ہے، لیکن عشق و محبت کی شام کو قیامت کی صبح سے بھی زیادہ گرم قرار دیا۔

۶۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی بہار کا بادل ہے، جس کے برس جانے سے باغ و راغ سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ ہماری حیثیت اس ابرِ بہار سے فیض حاصل کرنے والے باغ کی ہے۔ ہمارے انگور کی شاخوں اور پتوں میں جو

---

[1] اس قصے کا ذکر بخاری، ترمذی، ابنِ ماجہ، نسائی اور مسندِ احمد میں آیا ہے۔ گیارہ مختلف صحابی اس کے راوی ہیں۔

تازگی اور رونق نظر آتی ہے، وہ حضورؐ ہی کے برسائے ہوئے مینہ کی وجہ سے ہے۔

۷۔ میں نے محبت کے کھیت میں اپنی آنکھ بوئی اور اس سے نظارہ و دید کا سرمایہ حاصل کیا۔

۸۔ میرے لیے یثرب کی سرزمین دونوں جہانوں سے زیادہ پیاری ہے۔ وہ شہر تفارروح افزا اور دل میں جاودانی ٹھنڈک پیدا کرنے والا ہے۔ جہاں ہمارا محبوبؐ قیام فرما ہے۔

۹۔ میں فارسی کے مشہور شاعر ملّا جامی کے اسلوب شعر گوئی پر مٹا ہوا ہوں اور ملّا صاحب کی نظم و نثر کو اپنی پختگی کا علاج سمجھتا ہوں۔ یعنی اسی نظم و نثر کے مطالعے سے میری علمی خامی دور ہوگی۔

۱۰۔ سبحان اللہ! ملّا صاحب نے کیا معنی خیز شعر کہہ دیا ہے، گویا حضورؐ کی مدح میں موتی پرو دیے ہیں۔

۱۱۔ فرماتے ہیں: "اگر دونوں جہانوں کو ایک کتاب فرض کر لیا جائے تو اس کا مقدمہ حضورؐ کی ذات بابرکات ہے"۔ ظاہر ہے کہ مقدمہ کتاب میں سب سے پہلے آتا ہے اور اس میں کتاب کا مغز و مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ اس دنیا کی ہر شے غلام ہے اور آقائی صرف حضورؐ کے لیے زیبا ہے۔

<u>حق کے لیے ہجرت کی دعوت</u>: بسطام۔ ایران کا ایک مشہور شہر جس نے حضرت بایزیدؒ کی وجہ سے عالمگیر شہرت پائی۔

اجتناب۔ دوری۔ کنارہ کشی۔ پرہیز۔

لات و عزّیٰ۔ اسلام سے پیشتر عربوں کے دو مشہور بت تھے۔ لات کی پوجا بنو ثقیف میں ہوتی تھی اور عزّیٰ قبیلۂ غطفان کا بت تھا۔

فاران۔ پہاڑ کا نام۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ مکّۂ معظمہ کا ایک نام ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مکّۂ معظمہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ تورات میں ہے: "اللہ تعالیٰ سینا سے آیا، ساعیر سے چمکا اور فاران سے سربلند ہوا"۔ "سینا" سے مراد دعوت موسوی، "ساعیر" سے مراد دعوت عیسوی اور "فاران" سے مراد رسول اللہ صلعم کی دعوت حق ہے۔

"انی جاعل"۔ یہ اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے: "وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" (اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں) گویا "انی جاعل" سے مراد منصب خلافت پر سرفراز فرمانا ہے۔

۱۔ عشق کی شراب سے گوناگوں کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ تقلید اور پیروی بھی عشق ہی کا ایک نام ہے۔ واضح رہے کہ یہاں تقلید سے مراد فقہی تقلید نہیں، بلکہ ہو بہو محبوب کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

۲۔ بسطام کا مرد کامل یعنی حضرت بایزید بسطامی اپنے محبوب و ہادی کی پیروی میں یگانگی کے درجے تک پہنچے

ہوئے تھے۔ انھوں نے خربوزہ محض اس لیے عمر بھر نہ کھایا کہ معلوم نہ ہو سکا، رسول اکرم صلعم نے یہ پھل کھایا تھا یا نہیں اور کھایا تھا تو کس طریق پر۔ سچّی اور کامل پیروی کی یہ بڑی ایمان افروز مثال ہے ؛

۳۔ اگر تُو حضورؐ سے سچّی محبّت کا مدّعی ہے تو آپ کی پوری پیروی کر اور اس پیروی پر پختہ ہو جا، تاکہ تیری کمند تجھے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دے۔ گویا ہادی اور پیشوا کی صحیح اور کامل پیروی ہی وہ کمند ہے، جو مسلمان کو خدا تک پہنچا سکتی ہے؛

۴۔ جس طرح رسول اللہ صلعم نے غارِ حرا میں گوشہ نشینی فرمائی تھی، اُسی طرح تو بھی کچھ مدّت کے لیے دل کے غارِ حرا میں بیٹھ جا، یعنی دل کو ذکر و فکر کا شیدائی بنا لے۔ تمام ذاتی اغراض سے پاک ہو جا اور صرف خدا کو اپنا نصب العین بنا لے۔

۵۔ جب تُو اللہ تعالیٰ کی محبّت میں پختہ اور استوار ہو جائے تو اپنی ذات کی طرف گام زن ہو اور ہوا و ہوس نے جو بُت تراش کر تیرے پہلو میں کھڑے کر رکھے ہیں، اُن سب کو ریزہ ریزہ کر ڈال۔ مسلمان کی شان یہی ہے کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، جینا مرنا، عبادت اور قربانی سب خدا کے لیے ہو۔ یہی الٰہی مقاصد کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا طریقہ ہے۔ جو مسلمان خدا کے لیے وقف ہو جاتا ہے اور خدا اُس کی قوّتِ ایمان کو مضبوط و مستحکم کر دیتا ہے، وہ ہوا و ہوس کے بُت جہاں بھی دیکھے گا، اُنھیں چکنا چُور کر ڈالے گا۔

۶۔ عشق کی طاقت سے ایک لشکر تیار کر لے، جو ذاتی اغراض اور ہوا و ہوس کے خلاف جہاد میں تیرا مددگار ہے۔ اسی لشکر کے ساتھ تُو عشق کے پہاڑ پر جلوہ گر ہو اور ان جلووں سے ہر طرف حق کی روشنی پھیلا دے ؛

۷۔ تُو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کر لے گا تو کعبے کا خدا تجھ پر رحمت نازل کرے گا اور سرفرازی بخشے گا۔ ان اوصاف ہی کی بنا پر تجھے اِنِّیْ جَاعِلٌ کا عملی مرقّع بنا دے گا، یعنی خلافت کا تاج تیرے سر پر رکھ دے گا۔

پانچواں باب

خودی اور سوال

اس باب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ سوال کرنے اور مانگنے سے خودی کمزور ہو جاتی ہے۔

سوال ہی اصلی بیماری ہے | دریوزہ۔ لفظی معنی، سوال کے لیے دروازے سے لگنا۔ بھیک مانگنا۔ گدیہ۔ بھیک۔

جانگسل۔ جان کو شدید تکلیف میں ڈالنے والا۔

پشیز - دمڑی یعنی تانبے کے سکّے کا آٹھواں حصّہ ۔ بے حقیقت ۔

زنبیل - فقیروں کا تھیلا ۔

۱ - اے مسلمان! زیادہ وقت نہیں گزرا جب تو بڑے بڑے جوانمردوں اور بہادروں سے خراج وصول کرتا تھا ۔ شیروں کے پتّے بھی تیرے سامنے پانی ہو جاتے تھے ۔ اب حاجت و ضرورت مندی کی بنا پر تیری طبیعت دمڑی جیسی ہو گئی ہے ، یعنی تیرا زور ، تیری قوّت ، تیرا رعب و داب سب ختم ہو گئے اور تو حد درجہ کمزور اور بے حقیقت رہ گیا ۔

۲ - تیری بیچارگی اور بدحالی اس امر کا نتیجہ ہے کہ تیرے پاس کچھ نہیں ۔ یہی بیماری تیرے تمام دکھوں کی جڑ ہے ۔

۳ - ناداری ایسی بیماری ہے جو فکر سے بلندی پر اُڑنے والی قوّت چھین لیتی ہے اور اعلیٰ درجے کے خیال کی شمع گُل کر دیتی ہے ۔ مطلب یہ کہ نادار آدمی فکر کی بلندی اور سوچ بچار کی بے بہائی کھو بیٹھتا ہے ۔

۴ - تو زندگی کے خُم سے پھول جیسی سرخ شراب لے لے ۔ زمانے کی جیب میں تیرے حصّے کی نقدی موجود ہے ، ہاتھ بڑھا اور نکال لے ۔

مراد یہ ہے کہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا خودی میں ضعف پیدا کرتا ہے ۔ ہمّت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جدوجہد سے روزی حاصل کرے ۔ اللہ کے فضل کے ساتھ اپنی قوّتِ بازو پر اعتماد رکھے ۔

۵ - تو حضرت عمرؓ کی طرح خود اونٹ سے اُتر کر کوڑا اٹھا ۔ دوسرے کا احسان اٹھانے سے پرہیز لازم ہے ، یقیناً لازم ہے ۔

اس میں اشارہ حضرت عمرؓ کے واقعے کی طرف ہے کہ ایک مرتبہ اونٹ پر سوار جا رہے تھے ۔ کوڑا گر گیا ۔ کسی سے نہ کہا کہ کوڑا اٹھا دے ۔ اونٹ کو بٹھایا ۔ خود اُتر کر کوڑا اٹھایا اور سوار ہو کر چلے گئے ۔ گویا سب کے سامنے یہ مثال پیش کی کہ ادنیٰ سے کام کے لیے بھی کسی کا احسان گوارا نہ کرنا چاہیے ۔

۶ - تو کب تک عہدوں کی بھیک مانگتا رہے گا؟ عہدے حاصل بھی ہو جائیں تو اُن کی حیثیت کیا ہے؟ تُو نے لڑکوں کو دیکھا ہو گا کہ سرکنڈے کے گھوڑے بنا کر کھیلتے ہیں ، لیکن سرکنڈے حقیقتاً گھوڑے تو نہیں بن جاتے ۔ یہی حال اُن مناصب کا ہے جو دوسروں سے بھیک مانگ کر حاصل کیے جائیں ۔

جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی تھی ، اُن دنوں مسلمان ، انگریزوں کے ماتحت منصبوں اور خطابوں کی کشمکش میں گرفتار تھے ۔ اقبالؔ نے اس باب میں انھیں سرگرمیوں کی مذمّت کی ہے ۔

۷ - جس فطرت کی بلندی کا یہ عالم ہو کہ اُس کی نظر ہمیشہ آسمانوں پر جمی رہے ، غیروں کا احسان اٹھانے سے وہ

پست ہو جاتی ہے۔

۸۔ نادار آدمی سوال کرتا ہے، اُس کی ناداری اور بھی ذلیل ہو جاتی ہے۔ بھیک مانگنے والا بھیک مانگ کر اور بھی نادار بن جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ مانگ کر چند سکے حاصل کرے، لیکن اس کی خودداری کو شدید نقصان پہنچتا ہے اور انسانیت کا یہ سب سے بڑا جوہر دے کر چند پیسے حاصل کر لینا دولت مند نہیں، نادار ہی بننا ہے۔

۹۔ سوال کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ خودی اور خودداری کے جواجزا پختگی کے باعث باہم پیوستہ ہوتے ہیں ان میں پریشانی اور پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ سوال سے پہلے خودی کا نخلِ سینا تجلی کا مرکز بنا ہوا تھا، سوال کے بعد وہ بالکل بے نور ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ تو اپنی خاک کی مٹھی کو پراگندہ نہ کر۔ خودی اور خودداری کا تقاضا یہ ہے کہ چاند کی طرح اپنے پہلو کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر رزق کا سروسامان کرتا رہ۔

رزق کے لیے اپنا پہلو کاٹنے کی مثال میں چاند کو پیش کیا، اس لیے کہ بدر بننے کے بعد وہ برابر گھٹتا جاتا ہے اگویا پہلو کاٹ کاٹ کر اپنے لیے رزق مہیا کرتا رہتا ہے۔ نیز اس مثال کا یہ پہلو پیش نظر رہنا چاہیے کہ رزق ذاتی جد و جہد سے حاصل کیا جائے نہ کہ غیروں کے آگے ہاتھ پھیلایا جائے۔

۱۱-۱۲۔ اگرچہ تو زمانے کے ہاتھ سے تنگ ہو اور تیرے نصیبے میں کشادگی کا کوئی سامان نہ ہو۔ اگرچہ تیرا سازو سامان سَیلِ بلا کے راستے میں گرا پڑا ہو اور ہر لمحہ خطرہ ہو کہ وہ سَیل کی نذر ہو جائے گا لیکن تجھے اپنے رزق کے لیے دوسروں کی فیاضی پہ نظر نہ رکھنی چاہیے۔ اگرچہ مشرق کو نورانیت کے لحاظ سے چشمہ کہتے ہیں مگر تو مشرق کے چشمے سے پانی کا طلبگار نہ ہو۔

مشرق کے چشمے میں پانی نہیں ہوتا اور جو شخص وہاں پانی کے لیے جائے گا، ناکام رہے گا۔ رزق کے لیے دوسروں کے فیض پر نظر رکھنے کی حیثیت بھی یہی ہے۔

۱۳۔ اگر تو دوسروں کی نعمت کا امیدوار رہے گا تو قیامت کے دن جو بڑے ہی دکھ اور مصیبت کا دن ہے، رسول اکرم صلعم کے سامنے شرمندہ ہو گا۔

واضح رہے کہ رسول اکرم صلعم کو گداگری اور سوال سخت ناپسند تھا۔ فرماتے تھے:

"اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لائے اور اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے۔"

سوال پر ناپسندیدگی کے واقعات بھی روایتوں میں آئے ہیں، مثلاً ایک انصاری کے پاس صرف ایک بچھونا

اور پانی پینے کا پیالہ تھا۔ آپ نے دونوں چیزیں دو درم میں فروخت کرا دیں اور فرمایا: "ایک درم کا کھانا گھر میں دے آؤ اور ایک درم کی رسّی خرید کر جنگل میں چلے جاؤ۔ لکڑیاں لا کر بیچا کرو۔" پندرہ دن میں انصاری کے پاس دس درم جمع ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے سنا تو فرمایا: "یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرے پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے؟"

کائنات پر غور و فکر کی دعوت

۱۔ کائنات کے حال پر نظر ڈالو۔ چاند کو سورج کے دسترخوان سے روشنی کی روزی ملتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ چاند کے دل پر سورج کے احسان کا داغ لگا ہوا ہے۔

داغ سے اشارہ اُن دھبّوں کی طرف ہے جو چاند میں نظر آتے ہیں۔

۲۔ اگر زمانہ سازگار نہیں تو اللہ تعالیٰ سے ہمّت طلب کر اور زمانے سے ٹکرا جا، لیکن غیر کے سامنے ہاتھ پھیلا کر مّلتِ اسلامیہ کی آبرو زائل نہ کر۔

۳۔ جس ذاتِ گرامی نے کعبے کو بتوں کے خس و خاشاک سے پاک کیا، یعنی رسول اللہ صلعم، اُن کا ارشاد ہے کہ "جو شخص اپنے ہاتھ سے روزی کماتا ہے وہ اللہ کا پیارا ہے۔"

۴-۵۔ جو شخص غیر کے دسترخوان کا ممنون ہوتا ہے اور اس کی گردن غیر کے احسان سے جھکی ہوئی ہے، اس پر افسوس۔ اُس نے دوسرے کی مہربانی کی بجلی سے اپنے آپ کو جلا لیا اور ایک بے حقیقت شے کے لیے غیرت کا سرمایہ بیچ ڈالا۔

۶-۷۔ کتنا اچھا ہے وہ پیاسا جو دھوپ میں جل رہا ہو، لیکن خضر سے بھی پانی کا پیالہ طلب نہ کرے۔ اُس کی پیشانی سائل کی شرمندگی کے پسینے سے تر نہ ہوئی۔ اُس کی آدمیت برقرار رہی اور سوال کر کے وہ مٹّی گِل نہ بنا۔

۸-۹۔ وہ گراں قدر نوجوان آسمان کے نیچے صنوبر کی طرح سر اُٹھا کر چلتا ہے، جو خالی ہاتھ ہو تو اور بھی خوددار بن جاتا ہے۔ بیشک اُس کا نصیبا سو جائے، لیکن وہ خود زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ گدائی کے بتیلے کا سمندر پانی نہیں، آگ کا سیل ہے۔ ذاتی کوشش سے اگر اوس کے چند قطرے بھی حاصل ہوں تو وہ گدائی کے سمندر سے بہتر ہیں۔

۱۱۔ تو بلبلے کی طرح مردانہ غیرت کا پیکر بنا رہ اور سمندر میں بھی اپنے پیالے کو اُلٹے رکھ۔

آخری شعر کا مضمون "شمع اور شاعر" میں بھی پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

تو اگر خود دار ہے، منّت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

چھٹا باب

خودی اور نظامِ عالم

اس باب میں یہ امر واضح کیا گیا ہے کہ جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کی ظاہری و مخفی قوتوں کو تسخیر کر لیتی ہے۔

شیخ بوعلی قلندر کا واقعہ کواکب - کوکب کی جمع۔ ستارے۔

خصومات۔ خصومت کی جمع۔ جھگڑے۔ عداوتیں۔

حَکَم - پنچ۔ ثالث۔ منصف

بوعلی۔ شیخ شرف الدین قلندر پانی پتی، مشہور اولیاء میں سے تھے۔ کہتے ہیں، والد کا نام فخر الدین تھا اور ان کا تعلق عراق سے تھا۔ شیخ موصوف کی تاریخ ولادت کا علم نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ۱۳ رمضان ۷۲۴ھ (۴ ستمبر ۱۳۲۴ء) کو وفات پائی۔ پانی پت میں آپ کا مزار زیارت گاہِ عوام ہے۔

آپ سے شعر بھی منسوب ہیں۔ بعض مثنویاں اور کچھ غزلیں۔ ایک مجموعۂ کلام چھپ بھی چکا ہے۔ ایک مثنوی کے پہلے شعر کا حوالہ خود اقبال نے اس باب میں دیا ہے۔

مینو سواد۔ مینو بمعنی عالمِ علوی و بہشت، سواد بمعنی سیاہی و حوالی و زمین۔

کوچک ابدال۔ قلندروں کی اصطلاح میں اُس مرید کو کہتے ہیں، جو دوسروں سے عمر میں چھوٹا ہو۔

یم - دریا - سمندر۔

استکبار - اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ تکبر کرنا۔

۱- جب خودی عشق و محبت کی بدولت پختہ و پائدار ہو جاتی ہے تو اُس کی قوت زمانے کی فرمانروائی سنبھال لیتی ہے مطلب یہ کہ عشق و محبت سے خودی مستحکم ہو جائے تو زمانے کی کوئی طاقت اُس کے اختیار سے باہر نہیں رہتی۔

۲- بوڑھا آسمان ستاروں سے اپنے لیے نقش و نگار آراستہ کرتا ہے۔ یہ ستارے کیا ہیں؟ کلیاں ہیں جو خودی کی شاخ سے پھوٹ نکلی ہیں۔

۳- خودی کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور اُس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔
شعر کے پہلے مصرع میں اس آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (پھر کیا تم نے انھیں جنگ میں قتل کیا؟

نہیں، خدا نے قتل کیا ——— گویا خدا کی تائید سے سب کچھ ہوا ——— اور
اے پیغمبر! جب تم نے مٹھی بھر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی تھی، خدا نے پھینکی تھی)
دوسرے مصرع میں معجزۂ شق القمر کا ذکر ہے۔

۴۔ جب خودی عشق و محبت سے پختہ ہو جاتی ہے تو وہ دنیا بھر کے جھگڑوں میں ثالث بن جاتی ہے۔ دارا اور جمشید جیسے تمام بادشاہ اُس کی غلامی قبول کر لیتے ہیں۔

ثالثی کا منصب اُسی کے لیے زیبا ہے جو حق و صداقت کا پیکر ہو۔ عدل اُس کے ہر عمل کا معیار ہو دنیا اُس پر اعتماد کرتی ہو اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا نشانِ ایمان قرار دیں۔ بسورۂ نساء میں رسول اللہ صلعم کے لیے فرمایا گیا تھا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (پس تمہارا پروردگار اس بات پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام جھگڑوں میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو، اُس کے خلاف اپنے دل میں کسی طرح کی کھٹک محسوس نہ کریں اور وہ جو کسی بات کو پوری طرح مان لینا ہوتا ہے، ٹھیک اُسی طرح مان لیں) رسول اللہ صلعم کے اتباع میں ہر شخص کو اُس کے درجے کے مطابق ثالثی میں بھی یہ مقام حاصل ہونا چاہیے۔

۵۔ میں تمہیں شیخ بوعلی قلندرؒ کی داستان سناتا ہوں۔ ہندوستان کی سرزمین میں شیخ موصوف کا نام خوب روشن ہے۔

۶۔ اس قدیم باغ کے ترانے سنانے والے نے ہم سے گُلِ رعنا کی باتیں کہیں۔

یہ شعر خود شیخ بوعلی قلندرؒ کی ایک مثنوی کے پہلے شعر پر مبنی ہے، یعنی:

مرحبا اے بلبلِ باغِ کہن
از گلِ رعنا بگو با ما سخن

۷۔ ہندوستان کا یہ خطہ جس کی اصل آگ ہے، شیخ بوعلیؒ کے دامن کی ہوا سے واقعی بہشت کا ٹکڑا بن گیا۔

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی جنت کو آتش نژاد کیوں کہا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ملک بڑا سرسبز و شاداب اور اس کی زمین بڑی سیر حاصل تھی۔ جابجا دریا اور نہریں بہتی تھیں، لیکن لوگ مشرک اور بت پرست تھے۔ شیخ بوعلی قلندرؒ نے اپنی زندگی میں بے شمار لوگوں کو اسلام کی برکات سے روشناس کیا۔ اس طرح یہ سرزمین اصلاً بھی بہشت کا نمونہ بن گئی۔

۸۔ شیخ بوعلیؒ کا ایک چھوٹا مرید بازار کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے حضرت شیخ کی شراب محبت اتنی پی رکھی تھی کہ اس میں سرمست تھا۔ گرد و پیش کی اُسے کچھ خبر نہ تھی۔

۹۔ اسی حالت میں شہر کے حاکم کی سواری سامنے آ گئی، جس کے ساتھ غلاموں اور چوبداروں کی ایک جماعت چلی آ رہی تھی۔

۱۰۔ غلاموں اور چوبداروں میں سے جو شخص سواری کے آگے آگے چل رہا تھا اُس نے شیخ بو علیؒ کے مرید کو آواز دی کہ اے بے خبر! ایک طرف ہٹ جا۔ حاکم کی سواری کا راستہ نہ روک۔

۱۱۔ اُس فقیر کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے ذکر و فکر کے سمندر میں غوطہ لگائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اُسے پتا بھی نہ چلا کہ کون آ رہا ہے اور اُسے کیا کہا جا رہا ہے۔

۱۲۔ چوبدار حاکم کی ہمرکابی کے باعث تکبر و غرور کی شراب میں مست تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ درویش نے حکم نہیں مانا تو اپنا عصا اٹھایا اور پورے زور سے درویش کے سر پر مارا۔

۱۳۔ درویش کو راستے میں حاکم کی سواری کے باعث یہ اذیت پہنچی تو وہ رنجیدہ، ناخوش اور افسردہ دل ہو کر چلا گیا۔

شیخ کا فرمان بادشاہ کے نام

دبیر۔ لکھنے والا۔ منشی۔

اخگر۔ انگارہ۔ شعلہ

کُن فکاں۔ لفظی معنی: ہو جا، پس ہو گیا۔ اِس سے مراد دنیا ہے۔

۱۔ درویش کے لیے فریاد کی جگہ نہ تو حاکم تھا اور نہ بادشاہ۔ وہ اپنے مرشد کے پاس پہنچا اور اُسی کے حضور فریاد کی۔ ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

۲۔ جب شیخ نے سنا کہ حاکم کے چوبدار نے بے وجہ درویش کو دُکھ پہنچایا تو ایک دم جلال آ گیا اور اس طرح گفتگو سے آگ کا سیل اُبل پڑا، جس طرح بجلی پہاڑ پر گرتی ہے۔

۳،۴۔ رگِ جاں سے ایک اور آگ نکالی اور اپنے منشی سے فرمایا کہ قلم اٹھا اور فرمان لکھ۔ یہ فرمان ایک فقیر کی طرف سے بادشاہ کے نام جائے گا۔

۵۔ لکھ کہ تیرے حاکم نے میرے خادم کے سر پر ضرب لگائی ہے۔ گویا اُس نے اپنی جان کا سر و سامان آگ کی نذر کر دیا ہے۔

۶۔ اے بادشاہ! اس بدفطرت حاکم کو حکومت سے معزول کر دے۔ اگر تُو نے ایسا نہ کیا تو میں تیرا ملک کسی اور کے حوالے کر دوں گا۔

۷۔ اُس حق پرست بندۂ خدا کے فرمان نے بادشاہ کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا۔

۸۔ اُس کے رگ و پے میں رنج و الم کا طوفان امڈ آیا اور شام کے آفتاب کی طرح اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

۹۔ اس نے فوراً حکم دے دیا کہ حاکم کو سزا کے طور پر زنجیروں میں جکڑ دیا جائے اور حضرت بو علی قلندرؒ سے اس

قصور کی معافی مانگی جائے۔

۱۰، ۱۱ ۔ اب سوال پیدا ہوا کہ معافی نامہ لے کر کون حضرت قلندرؒ کی بارگاہ میں جائے۔ اس غرض سے امیر خسروؒ چنے گئے، جن کی شیریں زبانی اور رنگیں بیانی سب کے نزدیک مسلّم تھی اور جن کے نغمے اس کائنات کے ضمیر کے آئینہ دار تھے۔ جن کی فطرت چاند کی طرح روشن اور نورانی تھی۔ یہی مناسب معلوم ہوا کہ بادشاہ کی طرف سے وہ سفیر بن کر جائیں اور حضرت قلندرؒ سے معافی مانگیں۔

۱۲ ۔ امیر خسرو شیخ بو علیؒ کے پاس پہنچے تو ساز اٹھا کر بجانا شروع کیا۔ اس نوا سے شیخ کی جان کا شیشہ پگھل گیا۔ مطلب یہ کہ شیخ پہ جلال اور غیظ کی جو کیفیت طاری تھی، وہ جاتی رہی۔

۱۳ ۔ جس شوکت اور جس شکوہ کو پہاڑ کی سی پختگی اور پائداری حاصل تھی، گفتگو کے ایک نغمے سے اس میں نرمی پیدا ہو گئی۔

۱۴ ۔ دیکھو، درویشوں کے دل میں نشتر چبھونے اور ان پر زخم لگانے سے پرہیز کرو۔

ساتواں باب

مغلوب قوموں کے مخفی حیلے

جو کہانی سنائی جا رہی ہے، اس سے یہ حقیقت واضح کرنا مقصود ہے، خودی کو ختم کرنے کا مسئلہ نوعِ انسانی میں سے مغلوب قوموں نے ایجاد کیا کہ اس مخفی طریقے سے کام لے کر غالب قوموں کے اخلاق عالیہ کو کمزور کر دیں۔

تمہید کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کو ایسی چراگاہ مل گئی تھی، جہاں کسی طرح کا کھٹکا نہ تھا، چنانچہ ریوڑ بڑے اطمینان سے وہاں نسلیں بڑھاتا رہا۔ اچانک جنگل سے شیر آ پہنچے اور انھوں نے بھیڑ بکریوں کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دیا۔ ریوڑ میں سے ایک بکری خوب سمجھ بوجھ والی تھی۔ اس نے سوچا کہ وعظ نصیحت سے بھیڑ بکریوں کو شیر بنانا تو ممکن نہیں۔ کیوں یہ کوشش نہ کی جائے کہ شیر بھیڑ بکریوں کی سطح پر آ جائیں۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا بھیجا ہوا ایلچی ظاہر کیا اور شیروں کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ زور و قوت بدبختی کی نشانی ہے۔ زندگی کو پائدار بنانے کی صورت یہ ہے کہ اپنی خودی مٹا دی جائے۔ خدا کی نیک مخلوق گھاس پات اور سبزہ کھا کر گزارہ کرتی اور گوشت چھوڑ دیتی ہے، بہشت طاقتوروں کے لیے نہیں، کمزوروں کے لیے ہے۔ تمہیں

بھی حیا ہے کہ بھیڑ بکریوں کو ذبح کرنا چھوڑ دو اور اپنے آپ کو مٹانے میں لگ جاؤ۔

شیر مدّت سے جدّوجہد کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ خدا کے ایلچی کی یہ صدا اُن کے کان میں پہنچی تو تن آسانی کا ذوق اُبھر آیا۔ انھوں نے گوسفندی طریقہ اختیار کر لیا اور رفتہ رفتہ اُن کی شیری ختم ہو گئی۔

گوسفندوں پر شیروں کا حملہ

علف زار۔ چراگاہ۔

استیلا۔ غلبہ۔ تسلّط۔

کوس۔ نقّارہ۔

۱۔ کیا تُو نے سنا ہے کہ قدیم زمانے کی بات ہے جب بھیڑ بکریاں ایک چراگاہ میں رہتی تھیں؟

۲۔ وہاں سبزے اور چارے کی بہتات تھی، اس لیے اُن کی نسل خوب بڑھ رہی تھی۔ دشمن کی فکر سے وہ بالکل آزاد تھیں۔

۳۔ یہ حالت تھی کہ بھیڑ بکریوں کی تقدیر یکایک بگڑ گئی اور مصیبت کے تیروں سے اُن کے سینے زخمی ہو گئے۔

۴۔ مصیبت یہ پیش آئی کہ شیروں کا ایک گروہ جنگل سے باہر نکل کر بھیڑ بکریوں کی چراگاہ پر حملہ آور ہُوا۔

۵۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ طاقت وروں کا شیوہ ہی کمزوروں کو اپنی طرف کھینچنا اور ان پر غلبہ پانا ہے۔ فتح قوّت ہی کا ایک بھید ہے جو کھل جاتا ہے۔

۶۔ شیروں نے اپنی شاہنشاہی کی نوبت بجائی اور بھیڑ بکریوں کی آزادی چھین لی۔

۷۔ شیروں سے اس کے سوا کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ شکار میں لگے رہیں، چنانچہ انھوں نے بھیڑ بکریوں کا شکار شروع کر دیا اور پوری چراگاہ اُن مسکینوں کے لہو سے سرخ ہو گئی۔

ایک دانا بکری کی تدبیر

زیرک۔ دانا۔

گرگِ باراں دیدہ۔ تجربہ کار اور گرم و سردِ زمانہ سے واقف۔

مشہور ہے کہ بھیڑیے کا بچہ بارش سے بہت ڈرتا ہے۔ کتنا ہی بھوکا پیاسا ہو، بارش میں باہر نہیں نکلتا، لیکن اگر وہ غار سے باہر ہو اور بارش ہونے لگے تو اس کا ڈر جاتا رہتا ہے۔ اس سے گرگِ باراں دیدہ محاورہ بن گیا، یعنی ایسا بھیڑیا جس پر مینہ برس چکا ہو۔ اور اس کے دل میں کوئی خوف باقی نہ رہا ہو۔

ہژبر۔ شیر ببر۔

ساطور۔ کلائی۔

۱۔ ایک بکری بڑی دانا اور سمجھ بوجھ والی تھی۔ اُس کی عمر بھی خاصی ہو چکی تھی اور زمانے کا گرم و سرد دیکھ چکی تھی:

۲۔ قوم کو جس دردناک حالت سے سابقہ پڑ چکا تھا، اُس سے بڑا دُکھ ہوا۔ شیروں کے ظلم نے اس کا سینہ زخمی کر دیا۔

۳۔ دوسروں کی طرح اُسے بھی تقدیر پلٹ جانے کا شکوہ تھا، لیکن اُس نے معاملہ کو شکایت تک محدود نہ رکھا، بلکہ یہ بھی سوچا، اس مصیبت سے نجات پانے کی تدبیر کیا ہو سکتی ہے، گویا تدبیر سے مقصد کو تقویت پہنچانے کا انتظام کیا۔

۴۔ آدمی کمزور ہو تو تجربہ کار عقل سے کام لے کر حفاظت کے لیے حیلے تراشتا ہے۔

۵۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غلامی کی حالت میں انسان کی تدبیریں سوچنے والی قوت خوب تیز ہو جاتی ہے اور وہ اس قوت سے کام لے کر نقصان سے بچاؤ کا بندوبست سوچتا رہتا ہے۔

۶۔ جب دشمن سے بدلا لینے کا جوش بخوبی پختہ ہو جاتا ہے تو غلام کی عقل فتنہ انگیزی کے نئے نئے طریقے عمل میں لاتی رہتی ہے۔

۷۔ اس بکری نے دل میں سوچا کہ ہم جس الجھن میں پھنس گئے ہیں، اُسے سلجھا لینا بہت مشکل ہے۔ گویا ہم غموں کے جس سمندر میں گر چکے ہیں، اُس کا کوئی کنارہ دکھائی نہیں دیتا۔

۸۔ بھیڑ بکریاں زور و قوت کے بل پر شیروں سے نجات حاصل نہیں کر سکتیں۔ ہماری کلائیاں چاندی کی ہیں اور شیروں کے بازو فولادی ہیں۔ گویا ہم بہت کمزور ہیں اور شیر ہمارے مقابلے میں بہت قوی ہیں۔

۹۔ بھیڑ بکریوں کے سامنے کتنے ہی وعظ کیے جائیں، انھیں کتنی ہی نصیحتیں کی جائیں، مگر یہ ممکن نہیں کہ ان میں بھیڑیوں کی سی خصلت پیدا ہو جائے۔

۱۰۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ شیروں کو خودی سے بے پروا بنا کر بھیڑوں کے درجے پر لے آیا جائے۔

شیروں کے لیے پیغمبر کذّابٌ اشر۔ یہ سورۂ قمر کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے:
"بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ" (بلکہ وہ جھوٹا خود پسند ہے)۔

یہ الفاظ قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے لیے کہے تھے، جو اُس قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ "کذّاب" کے معنی، بہت جھوٹا اور "اشر" کے معنی خود پسند، بڑائی ہانکنے والا ہیں۔

یوم نحس مستمر یہ بھی قرآن مجید کی اُس آیت کا ٹکڑا ہے جو سورۂ قمر میں عاد کے لیے آئی ہے:
"إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ"
(ہم نے اُن پر ایک سخت منحوس دن میں بادِ تند بھیج دی)

شقی ۔ بدبخت۔
تارک اللحم ۔ گوشت ترک کر دینے والا۔
اعمیٰ ۔ اندھا۔

خُسران ۔ نقصان ۔ خسارہ ۔ گھاٹا۔

فرزانہ ۔ عقل مند۔

۱۔ اُس دانا بکری نے الہام کا دعویٰ کیا اور خون پینے والے شیروں کے لیے وعظ و نصیحت پر آمادہ ہو گئی۔

۲۔ اُس نے نعرہ لگایا: "اے جھوٹے اور خود پسند گروہ! تم سخت منحوس دن سے بالکل غافل ہو!"

۳۔ مجھے روحانی قوّت کی دولت عطا ہوئی ہے اور خدا نے مجھے شیروں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

۴۔ جن آنکھوں میں نور نہیں، جو بصیرت سے ناآشنا ہیں اور حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتیں، میں اُن کے لیے نور بن کر آئی ہوں۔ میرے پاس ایک شریعت ہے اور مجھے حکماً بھیجا گیا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

۵۔ اے شیرو! اپنے بُرے اور ناشائستہ کاموں سے توبہ کرو۔ تم اب تک اپنا نقصان کرتے رہے۔ اب فائدے کی تدبیر بھی سوچ لو۔

۶۔ دیکھو، جو شخص غضب ناک اور زور آور ہو، وہ بد بخت ہے۔ زندگی خودی کو مٹا دینے سے استوار رہتی ہے۔

۷۔ دیکھو، نیک لوگ گھاس پات کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ جو شخص گوشت کھانا چھوڑ دے، وہ خدا کا مقبول بندہ بن جاتا ہے۔

۸۔ شیرو! جن تک تمہارے دانت بڑے تیز ہیں، ہر جانور کو پھاڑ کھاتے ہو، لیکن دانتوں کی یہی تیزی تمہارے لیے ذلت و رسوائی کا سامان ہے اس سے عقل کی آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔

۹۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ بہشت صرف کمزوروں اور ناتوانوں کے لیے ہے؟ قوّت و طاقت پر بھروسا رکھنے والے سراسر گھاٹے اور خسارے میں رہتے ہیں۔ قوّت ہی خسارے کا سامان بن جاتی ہے۔

۱۰۔ تم بڑائی، برتری اور دبدبے کی تلاش میں ہو۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ تلاش سراسر برائی ہے؟ دولت مند بننے کے بجائے تنگ دست اور غریب رہنا زیادہ اچھا ہے؟

۱۱۔ دیکھو، جلا دینے والی بجلی اکیلے دانے کی گھات میں کبھی نہیں بیٹھی، لیکن جب بہت سے دانے جمع ہو کر انبار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو بجلی کے گرنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ انبار جمع نہ کیا جائے۔

۱۲۔ اگر تم عقل مند ہو تو ذرّہ ہی بنے رہو، صحرا بننے کی کوشش کبھی نہ کرو۔ ذرّہ بنے رہو گے تو سورج کی روشنی سے فیض حاصل کر سکو گے۔

۱۳۔ اے شیرو! تم اس بات پر فخر کر رہے ہو کہ بھیڑ بکریوں کو چیر پھاڑ کر کھا گئے۔ اگر بلندی کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو ذبح کرو۔

۱۴۔ دوسروں پر جبر کرنا، انھیں قہر کا تختۂ مشق بنانا، اُن سے بدلا لینا اور اِس طرح اقتدار کے منصب پر پہنچنا زندگی کو ناپائیدار بنا دیتا ہے اور اس کی بنیاد کھوکھلی کر ڈالتا ہے۔

۱۵- سبزے پر نظر ڈالو، آنے جانے والا ہر شخص اُسے روندتا رہتا ہے لیکن وہ پھر اُگ آتا ہے اور موت کی نیند آنکھوں سے دھو ڈالتا ہے، یعنی پامالی اُسے ختم نہیں کرتی بلکہ زندہ رہنے کی قوت عطا کرتی ہے۔

۱۶- اگر تم عقل مند ہو تو اپنی ہستی سے غافل ہو جاؤ۔ اگر اپنے آپ سے غافل ہونے کے لیے تیار نہیں تو سمجھ لو کہ تم دیوانے ہو اور عقل و فکر سے عاری۔

۱۷- تمھیں چاہیے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ لو، کان بند کر لو اور لبوں پر مہر لگا لو۔ اسی طرح تمھاری قوتِ فکر بلند آسمان پر پہنچے گی۔

۱۸- دُنیا کی یہ چراگاہ سراسر ناکارہ اور بے حقیقت ہے۔ یہ وہم کی پیداوار ہے۔ اس کا وجود محض قیاسی اور خیالی ہے پھر نادانو! تم اِس کے پیچھے نہ پڑو اور اِس سے تعلق نہ رکھو۔

اِس پورے وعظ میں اقبال نے اُن تمام باتوں کا نچوڑ نہایت دلآویز انداز میں پیش کر دیا، جو وقت کے عام عالموں، صوفیوں، روحانیت کے دعویداروں اور شاعروں کی زبانوں پر رہتی تھیں۔ یہ تمام باتیں قوم کو زندگی کی جدّوجہد میں ناکارہ بنا دینے والی تھیں، لہٰذا اقبال کو اس زہر کا تریاق پیش کرنے کی خاص ضرورت محسوس ہوئی اور مثنوی "اسرارِ خودی" اس تریاق کا پہلا لبریز جام تھی۔

شیروں کی تن پروری اور زوال

خیل - گروہ - قبیلہ۔

خزف - ٹھیکری - سفال۔

انحطاط - زوال - پستی۔

جس طرح بکری کے وعظ نے شیروں کو زندگی کے جذبے سے محروم کر کے زوال کی منزل میں پہنچا دیا، اُسی طرح محکوم قومیں فریب کے ہتھکنڈے استعمال کر کے غالب و طاقتور قوموں کو پستی میں پہنچا دیتی ہیں۔ وہ براہِ راست مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ دوست بدست لڑنے کی ہمت نہیں رکھتیں، لیکن اپنی غلط اور خود غرضانہ تعلیم و تلقین سے آہستہ آہستہ کامل شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ پاک و ہند کی اسلامی تاریخ کے متعدّد صفحات اس کی عبرت ناک مثالیں پیش کر رہے ہیں۔

۱- شیروں کا گروہ لگاتار جدّوجہد اور محنت و مشقّت سے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ اب اُس کی آرزو یہ تھی کہ جسموں کو آرام ملے۔ گویا اُس کا دل تن پروری پر جما ہوا تھا۔

۲- بکری نے سکون و راحت کی نیند لانے والی نصیحت سنائی تو انھیں بہت پسند آئی۔ نادانی سے اُن پر بکری کا جادو چل گیا۔

۳- شیر اب تک بھیڑ بکری کا شکار کرتے رہے تھے، اب انھوں نے خود بھیڑ بکری کا مسلک اختیار کر لیا۔

۴ - شیروں نے گھاس پات کھانا شروع کیا تو یہ غذا انھیں راس آئی اور وہ اِسی کے عادی ہو گئے ۔ رفتہ رفتہ شیری کا گراں بہا گوہر ٹھیکری بن کر رہ گیا یعنی شیری کے تمام جوہر زائل ہو گئے ۔

۵ - گھاس پات کھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دانتوں کی تیزی بھی باقی نہ رہی اور جن آنکھوں سے شعلے برستے تھے ، اُن کی ہیبت بھی کافور ہو گئی ۔

۶ - شیری کا مطلب یہ تھا کہ سینوں میں ہمّت اور حوصلے سے بھرے ہوئے دل موجود تھے ۔ آہستہ آہستہ دل سینے سے نکل گئے ۔ گویا آئینہ جوہروں سے خالی ہو گیا ۔

جس سینے میں دل نہ ہو ، یقیناً وہ ایسا آئینہ ہے جو جوہروں سے بالکل محروم ہو ۔ اردو کا کیسا اچھا شعر ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے ، دلِ زندہ تُو نہ مر جائے
کہ زندگی تو عبادت ہے تیرے جینے سے

۷ - شیر اپنی کوششوں کو انتہا پر پہنچا دینے کے جوش سے بھرے ہوئے تھے ، جس نے اُن پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری کر رکھی تھی ۔ وہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور دل میں عمل کے لیے جو جذبۂ اضطراب بیتاب تھا ، وہ باقی نہ رہا ۔

۸ - اقتدار ، عزم اور استقلال رخصت ہوئے ۔ اعتبار ، عزّت اور اقبال جاتے رہے ۔

۹ - وہ فولادی پنجے جن سے سب پر لرزہ طاری تھا ، بالکل بے زور رہ گئے ۔ دل مر گئے تو جسموں نے قبروں کی صورت اختیار کر لی ۔

۱۰ - جسموں کی قوّت گھٹ گئی ۔ جانوں کا خوف بڑھ گیا ۔ اِس خوف نے ہمّت اور دلیری کو بھی ختم کر دیا ۔

۱۱ - بے ہمتی آئی تو سینکڑوں بیماریاں پیدا ہو گئیں ، مثلاً ناکارگی ، بیدلی اور پستِ فطرتی ۔

۱۲ - شیر بیدار اور جفاکش تھا ۔ بھیڑ کے جادو نے اُسے سُلا دیا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کی قوت میں زوال آ گیا ۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اُس نے زوال کی حالت کو تہذیب کا نام دے دیا ۔

آٹھواں باب

افلاطون اور مسلکِ گوسفندی

اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حکیم افلاطون یونانی، جس کے افکار سے مسلمان
قوموں کے تصوف و ادبیات نے بہت زیادہ اثر قبول کیا، مسلکِ گوسفندی پر گامزن
رہا ہے اور اس کے خیالات سے بچا رہنا لازم ہے۔

افلاطون کی خیالی دنیا | راہب۔ عیسائیوں کے تارک الدنیا درویش کو کہتے ہیں، جسے زہد و عبادت کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔

رخش۔ سُرخ و سفید گھوڑا۔ رستم کے گھوڑے کو اس لیے رخش کہتے تھے کہ اُس کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔ اب یہ لفظ بلا امتیاز رنگ عام گھوڑے کے لیے مستعمل ہے۔

کم فگندن۔ عاجز و درماندہ رہ جانا۔

تحلیل۔ اجزاء کا الگ الگ ہونا۔ گھُل جانا۔

سراب۔ دھوپ میں صحرائی ریت کی چمک، جس پر دیکھنے والے کو پانی کا دھوکا ہوتا ہے۔

اعیان۔ عین کی جمع۔ یہ لفظ اُن صُورِ علمیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا خارجی وجود کوئی نہ ہو۔

نامشہود۔ نظر نہ آنے والا۔

سُکر۔ نشہ۔

مسموم۔ زہر دیا گیا۔ زہریلا۔

شرح کے آغاز سے پیشتر یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ یہاں افلاطون کے فلسفے پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ اقبالؔ نے اسلامی تصوف و ادبیات پر اُس فلسفے کے جو مضر اثرات بیان کیے ہیں، وہ اصل فلسفے سے آگاہی کے بغیر بھی صاف سمجھ میں آتے ہیں، یعنی اقبالؔ ادبیات میں سے ہر اُس شے کو خارج کر دینا چاہتے تھے جس کا مطالعہ قوم کے ذوقِ عمل اور اس کی استعداد جدّ و جہد پر بُرا اثر ڈالے۔ افلاطون کا فلسفہ اس وجہ سے بُرا قرار پایا کہ اُس نے عالمِ اسباب سے دھیان کو جبہ ہٹائی، حالانکہ عالمِ اسباب ہی انسان کے لیے درجۂ کمال حاصل کرنے کا اصل میدان ہے۔ اگر اسی کو نظر انداز کر دیا جائے تو مطلب یہ ہوا کہ زندگی اکارت گئی۔

۱- یونان کا مشہور حکیم افلاطون قدیم زمانے کا تارک الدنیا درویش، اپنے عہد کے گوسفندوں میں تھا۔

۲- اُس کا گھوڑا فلسفے اور معقولات کے اندھیرے میں گم ہوگیا۔ عالمِ موجودات کے کوہستان میں چلنے سے عاجز ہوگیا، یعنی اُس نے فکر و خیال کی دنیا میں اس طرح غوطہ لگایا کہ گرد و پیش کی دنیا سے اُسے کوئی واسطہ نہ رہا۔

۳- جن چیزوں کا علم حواس کے ذریعے سے نہیں ہوسکتا، اُن کا جادو افلاطون پر ایسا چلا کہ وہ ہاتھ، آنکھ اور کان کا اعتبار ہی کھو بیٹھا۔

۴- اُس نے کہا کہ زندگی کا راز مر جانے میں چھپا ہوا ہے۔ چراغ بجھا دیا جائے تو اس میں سے سیکڑوں جلوے پیدا ہو جاتے ہیں۔ گویا اُس نے فنا کی تعلیم دی اور کہا کہ یہ دنیا سراسر فریبِ نظر ہے۔

۵- وہ ہمارے خیالات پر چھایا ہوا ہے، حالانکہ جو شراب اُس کے پیالے میں ہے، وہ نیند لانے والی اور دنیا کو چھین لینے والی ہے۔

"ہمارے خیالات پر چھایا ہوا ہے" سے مراد یہ ہے کہ ہمارے صوفی، شاعر، حکیم اور علماء اُسی سے عقلی روشنی حاصل کرتے ہیں۔

۶- وہ آدمی کے لباس میں گوسفند ہے۔ صوفی اُس کے خیالات و افکار پر مٹے ہوئے ہیں۔

۷- افلاطون نے اپنی عقل آسمان پر پہنچا دی اور اس دُنیا کو، جو عالمِ اسباب ہے، افسانہ بتایا۔

۸- اُس کا کام یہ ہے کہ زندگی کے اجزاء کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے مٹا دے۔ اگر زندگی کو بانکا سرو قرار دیا جائے تو افلاطون اُسے کاٹ دینے کے درپے ہے۔

<u>خواب آور نشہ</u> ۱- اُس کی حکمت نے موجود کو ناموجود اور ہست کو نیست کہا۔ کیسی عجیب عقل تھی جس نے نقصان کو نفع قرار دیا۔

۲- اُس کی فطرت سوگئی۔ پھر ایک خواب پیدا کیا۔ اُس کے ہوش کی آنکھ ایک سراب عالمِ وجود میں لے آئی۔

۳- افلاطون میں عمل کا ذوق بالکل نہ تھا اور اُس کی جان عدمِ محض پر مٹی ہوئی تھی۔

۴- اُس نے عالمِ موجودات کے ہنگامے سے انکار کر دیا اور وہ اعیان، وہ صُورِ علمیہ پیدا کیے جنھیں خارج سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو نظر نہ آتے تھے۔

۵- جس شخص میں زندگی کی روح موجود ہو۔ اُسے یہ دُنیا اچھی لگتی ہے کیونکہ یہاں عمل کے زیادہ سے زیادہ موقعے موجود ہیں، البتہ جس کا دل مر چکا ہو اور اس میں زندگی کی کوئی رمق نظر نہ آئے، اُسے صُورِ علمیہ کی دنیا پسند آئے گی۔

۶- افلاطون کے ہرن کو خرام کے لطف سے کوئی حصہ نہ ملا اور اُس کے چکور پر رفتار کی لذّت حرام ہوگئی۔

مراد یہ کہ ہرن کا کمال چوکڑی بھرنا اور چکور کا کمال وقار و ناز کے طریق پر چلنا ہے۔ اگر یہ خصوصیتیں ہی

غائب ہو جائیں کہ ان کا ہونا، نہ ہونا برابر ہو گیا۔

۷۔ شبنم کی خوبی اُڑنا اور پرندے کی خوبی گانا ہے۔ افلاطون کی شبنم پروانے سے بے نصیب تھی اور اس کے پرندے کے سینے میں نغمہ آرائی کا دم ہی نہ تھا۔

۸۔ اُس کے دانے میں اُگنے کا ذوق ناپید ہے اور اس کا پروانہ تڑپ سے ناآشنا ہے۔

۹۔ اسے جدّ و جہد سے نفرت تھی۔ دنیا کو ترک کیے بیٹھا تھا۔ اس کی ہاؤ ہو میں زندگی بسر کرنے کی ہمت نہ تھی، لہٰذا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گیا اور اپنی پیدا کی ہوئی خیالی دنیا میں جا بیٹھا۔

۱۰۔ اُس نے اپنا دل ایک بجھے ہوئے شعلے سے وابستہ کر لیا اور ایسی دنیا کا خاکہ تیار کرتا رہا جو افیون کھا کر مدہوش تھی۔

۱۱۔ اُس نے پر کھولے اور آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ پھر نیچے اُتر کر آشیانے میں واپس نہ پہنچا۔

۱۲۔ اُس کا خیال آسمان کے خُم میں گم ہو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے پاس تلچھٹ ہے یا وہ خُم کے سر پر رکھی ہوئی اینٹ پہ بیٹھا ہے

۱۳۔ اُس نے قوموں کو ایسا نشہ پلایا کہ اُن کے جسم میں زہر سرایت کر گیا، چنانچہ جن قوموں نے افلاطون کا فلسفہ اختیار کیا، وہ سو گئیں اور ذوقِ عمل سے محروم رہیں۔

نواں باب

حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیات

آرزو اور حُسن

۱۔ انسان کا خون آرزو کے داغ سے گرم ہوتا ہے اور یہ مٹی آرزو کا چراغ روشن ہونے سے آگ بن جاتی ہے۔

۲۔ تمنّا و آرزو ہی کی بدولت زندگی کا پیالہ شراب سے بھرتا ہے، زندگی میں جوش، سرگرمی اور مستعدی پیدا ہوتی ہے اور اُس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

۳۔ زندگی کا مقصود و مدعا اِس کے سوا کیا ہے کہ کائنات کی قوتوں پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ عالمِ انسانیت کے لیے فائدوں اور سہولتوں کے دروازے کھولے جائیں۔ جو دل آرزو سے معمور نہ ہو، وہ اتنے بڑے کارنامے کیونکر انجام دے سکتا ہے؟ گویا آرزو ایک منتر ہے جس سے کام لے کر انسان تمام قوتوں کو مسخر کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

۴۔ زندگی شکار کھیلتی ہے اور آرزو جال مہیا کرتی ہے۔ حُسن کی طرف سے عشق کو آرزو کے سوا کیا پیغام ملتا ہے؟ مطلب یہ کہ دل میں حُسن کی آرزو پیدا ہوتی ہے اور اُس کے لیے میدانِ طلب میں بھی دامنِ تنگ رہ جاتا ہے۔

۵، ۶۔ زندگی کے نغمے میں آرزو کی بدولت زیر و بم پیدا ہوتا ہے۔ کیا کبھی سوچا کہ آرزو لمحہ بہ لمحہ کیوں ابھرتی ہے؟ سبب یہ ہے کہ جو چیز حسین، زیبا اور دل پسند نظر آئے، اُسے رہبر بنا کر ہم طلب کے میدان میں دوڑنے لگتے ہیں، یعنی اچھی چیزوں کی تلاش ہمارے اندر عمل کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔

۷۔ حسین و زیبا چیز کا نقش ہمارے دل پر جم جاتا ہے، اس سے آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں۔ گویا کوئی حسین و زیبا شے دل کو اپنی طرف نہ کھینچے تو اس کے لیے ہمارے دل میں آرزو کیوں پیدا ہو؟ آرزو پیدا نہ ہو تو اُسے حاصل کرنے کی تڑپ کیوں ہمیں بیقرار کرے؟ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں عمل کا ہنگامہ صرف آرزو کی بدولت گرم ہے، خواہ وہ آرزو کسی واقعی حسین شے کے لیے ہو یا کسی ایسی شے کے لیے، جسے کسی گروہ نے غلطی اور نادانی سے حسین قرار دے لیا ہو۔

۸۔ حُسن ہی سے آرزو کی بہار پیدا ہوتی ہے۔ اُسی کے جلوے کی آغوش میں آرزو پرورش پاتی ہے

شاعر کا حقیقی فریضہ

غازہ۔ گلگونہ۔ اُبٹنا۔

ظلمات۔ ظلمت کی جمع۔ تاریکیاں۔ اندھیرے۔ ضرورتِ شعری کی بنا پر فارسی اور اردو میں لام کو ساکن باندھنا بھی جائز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں مراد اُس تاریکی سے ہے جس کے اندر حسبِ روایت آبِ حیات موجود تھا۔ سکندر حضرت خضرؑ کو رہنما بنا کر وہاں پہنچا لیکن اسے پینا نصیب نہ ہوا۔

گراں سیر۔ سست چلنے والا۔

قوس۔ علم ہندسہ کی رُو سے دائرے کا وہ حصہ جو وتر اور محیط کے درمیان ہو یعنی کوئی حصہ۔

خود حساب۔ اپنی قدر و قیمت کی جانچ خود کرنے والا۔

۱۔ شاعر کا سینہ حُسن کی تجلّیوں سے معمور ہوتا ہے۔ یہی وہ سینا پہاڑ ہے جس سے حُسن کے جلوے ابھرتے رہتے ہیں۔

۲۔ شاعر کی نظر کسی اچھی چیز پر پڑ جائے تو اس کی اچھائی بڑھ جاتی ہے۔ فطرت پر اُس کا منتر پھونکا جائے تو اس میں بدرجہا زیادہ محبوبیت آ جاتی ہے۔

۳۔ شاعر ہی کے نغموں سے بلبل نغمے سیکھتی ہے۔ شاعر ہی کے گلگونے سے پھول کا چہرہ تابناک ہو جاتا ہے۔

۴۔ شاعر کے سوز سے پروانوں کے دل میں سوز پیدا ہوتا ہے۔ عشق کی داستانیں شاعر ہی کی وجہ سے رنگین ہوتی ہیں۔

۵۔ سمندر اور خشکی شاعر کی آب و گِل میں چھپے ہوتے ہیں اور اس کا دل سیکڑوں نئے جہانوں کا امانتدار ہوتا ہے۔

۶۔ اُس کے دماغ میں لالہ کے ایسے پھول ہوتے ہیں، جو ابھی تک زمین سے باہر نہیں نکلے۔ وہ ایسے نغموں اور آہوں سے بھرا ہوتا ہے، جو کسی کان تک نہیں پہنچے۔

مطلب یہ کہ اگر شاعر اپنے اصل منصب کو سمجھتا ہے تو وہ ایسے حقائق بیان کرے گا، جو

پہلے سُنے اور دیکھے نہیں گئے۔

۷ - اُس کے خیالات بلندی میں چاند اور ستاروں سے پہلو مارتے ہیں۔ بُری چیز اُس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ وہ ہمیشہ اچھی، عمدہ اور مفید چیزیں پیدا کرتا ہے۔

۸ - وہ خضر ہے اور اس کی تاریکی میں آبِ حیات موجزن ہے۔ اُس کے آنسوؤں سے کائنات کی رگوں میں زندگی کی نئی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔

۹ - ہم چلنے میں سُست ہیں، محنت و مشقت سے جی چُراتے ہیں، نفع نقصان کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں اور منزلِ مقصود سے دُور راستے میں گرے پڑے ہیں۔

۱۰، ۱۱ - ایسے حالات میں شاعر بلبل بن کر نغمے گائے گا۔ اور ہمیں پھر تگ و دو پر آمادہ کرنے کے لیے تدبیریں اختیار کرے گا تاکہ ہمیں زندگی کے فردوس تک پہنچا دے اور ہماری قوم پیدا و ثمرہ بن جائے یعنی ہم ناقص نہ رہیں، کامل بن جائیں۔

۱۲ - قافلے شاعر ہی کی آوازِ جرس پر چلتے ہیں اور جس طرف اُس کی صدا لے چلتی ہے، اُسی طرف رواں رہتے ہیں۔

۱۳ - وہ ہمارے باغ میں نسیم بن کر چلتا ہے اور آہستہ آہستہ لالہ و گل میں بکھر نکلتا ہے۔

۱۴ - اُس کے جادو سے زندگی کے زور و قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی قدر و قیمت کا جائزہ لیتی ہے اور اس میں تگ و دو کی بیتابی پیدا ہوتی ہے۔

۱۵ - شاعر پکار کر دنیا کو دسترخوان پر بٹھا دیتا ہے اور اس کے دل میں بلندی اور ہمت کی جو حرارت بھری ہوتی ہے اُسے ہوا کی طرح عام کر دیتا ہے۔

حیات سوزِ شاعری | وابوسیدن - رُوگرداں ہونا۔ مُنہ پھیر لینا۔

چرۂ شاہین - چست و چالاک۔ بہادر۔

تذرو - اصل میں تذرو ذال سے ہے اگرچہ بالعموم دال سے لکھتے ہیں۔ یہ ایک صحرائی مرغ ہے جو استرآباد میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسے چکور سمجھنا صحیح نہیں۔

بناتِ آشیانِ یم - سمندر کی پریاں جنھیں عربی میں بنات البحر اور انگریزی میں سائیرنز کہتے ہیں۔ قدیم زمانے کے ملاحوں کا کہنا ہے کہ اُن کا نصف جسم انسان کا سا ہوتا ہے اور نصف مچھلی کا۔ وہ نہایت عمدہ نغمے گاتی ہیں۔ اُن کی آواز سے مسحور ہو کر جہاز راں بے راہ ہو جاتے ہیں اور جہاز ڈوب جاتے ہیں۔ پرانے زمانے کے افسانوں میں سے یہ بھی ایک افسانہ ہے۔

قعر - گہرائی۔

وایہ - خواہش - آرزو۔

تف دار - عیب دار -

۱ - اُس قوم پر افسوس ہے جو موت میں حصّہ دار بنتی ہے اور اس کا شاعر زندگی کی لذّت سے روگرداں ہو جاتا ہے ؛

۲ - اس کا آئینہ بُرائی کو اچھائی اور عیب کو حسن بنا کر پیش کرتا ہے ، وہ جو گوارا اور مرغوب شے پلاتا ہے ، اس سے پینے والے کے جگر میں سیکڑوں نشتر اُتر جاتے ہیں ؛

۳ - وہ پھول کو چوم لے تو اُس کی تازگی زائل ہو جائے اور بلبل کے دل میں پرواز کی لذّت باقی نہ رہے ؛

۴ - اُس کے خیالات و افکار کی افیون سے قوم کے رگ و پے پر سستی طاری ہو جاتی ہے اور وہ جو پیغام دیتا ہے اُس سے زندگی کی روح فنا ہو جاتی ہے۔

۵ - اگر قوم کو سرو فرض کریں تو اُس کی شعر گوئی اس سرو سے بلندی اور پھیلاؤ کا ذوق چھین لیتی ہے -

چست و چالاک شاہین ایسے حوصلہ فرسا شعر سُنے تو اُس کے خون کی حرارت جم جائے اور وہ شاہین نہ رہے ، بلکہ ایک عام صحرائی پرندہ بن جائے - یعنی ایسی شاعری بہادروں اور جوانمردوں کا خون سرد کر دیتی ہے -

۶ ، ۷ - وہ اُن بحری پریوں میں سے ہے ، جن کا نصف جسم انسان کا اور نصف مچھلی کا ہوتا ہے - وہ اپنے نغموں سے ملاحوں پر جادو کر دیتی ہیں اور جہاز کو سمندر کی گہرائی میں ڈبو دیتی ہیں -

۸ - ایسے شاعر کی نوائیں قوم کے دل سے ثبات و استقامت کا جوہر چُرا لے جاتی ہیں - بیشک اُس کے پاس جادو ہو گا لیکن ایسا جادو جس سے موت کو لوگ زندگی قرار دینے لگتے ہیں -

۹ - یہ شاعر قوم کی جان سے زندگی کی خواہش نکال دیتا ہے ، گویا قوم کی کان سے گراں بہا یاقوت لے جاتا ہے ؛

۱۰ - جب نقصان فائدے کا لباس پہن لیتا ہے تو ہر اچھائی بُرائی بن جاتی ہے ؛

۱۱ - یہ شاعر قوم کو وسوسوں کے سمندر میں ڈال دیتا ہے اور عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے ؛

۱۲ - تباہ حال لوگ ایسے شاعر کے کلام سے اور تباہ حال ہو جاتے ہیں اور جب اِس قسم کی شاعری کا جام گردش میں آتا ہے تو انجمن کی رہی سہی رونق بھی جاتی رہتی ہے ؛

۱۳ - ایسے شاعر کے بادل میں بجلیوں کی ندی ہو ہی نہیں سکتی - جسے اُس کا باغ سمجھا جاتا ہے ، وہ دراصل رنگ و بو کا ایک دھوکا ہوتا ہے ؛

۱۴ - وہ جس شے کو شاعری کا آرٹ اور فن قرار دیتا ہے ؛ اُسے اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اس کے سمندر سے جو بھی موتی نکلے گا ، وہ عیب سے خالی نہ ہو گا ؛

آرٹ یا فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو - جو آرٹ اصلیت و صداقت سے خالی ہوتا ہے وہ نہ خود قائم رہ سکتا ہے اور نہ اس سے کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے ؛

۰۵ ۵۰
برکت علی

۱۵- ایسا شاعر سونے کو بیداری پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی شعر گوئی ہے، جس نے ہمیں ہمت وحمیت کی حرارت سے بے بہرہ کردیا۔

۱۶- شاعری کے اِس جیس کا گاناحسن گر دلوں میں زہر سرایت کر گیا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ پھولوں کے اِس انبار کے نیچے سانپ سویا ہوا تھا۔ جو بھی اُن پھولوں تک پہنچا، وہ ڈسا گیا۔

۱۷- ایسے شاعر کے خم، صراحی اور پیالے سے دور رہو۔ اگرچہ اُس کی شراب دیکھنے میں آئینے کی طرح صاف وشفاف ہو، مگر اُس سے بچے رہو، ہر گز نہ چھوؤ۔

ہماری شاعری کا سرمایہ تمثال۔ تصویر۔ پیکر۔ عکس۔

بہزاد۔ مشہور مصوّر جس کا اصل نام کمال الدین تھا۔

لگد کوب۔ مار پیٹ۔ پامالی۔

لابہ۔ خوشامد۔

۱- قوم ایسے ہی شاعروں کی شراب پی کر گری پڑی ہے اور ان کی صراحیوں کی آب وتاب کو صبح قرار دیتی ہے۔

۲- ان کے نغموں سے دلوں کا جوش وخروش ختم ہو گیا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ کان کے راستے سے زہر قاتل اندر پہنچ گیا۔

۳- اے قوم! تو نے جو روش اختیار کی ہے، وہ تجھے پستی کی طرف لے جانے والی ہے۔ تیرے ساز کا تار نوا پیدا کرنے کے قابل ہی نہ رہا۔

۴- تو جسمانی آسائش میں پڑ کر اس درجہ تباہ ہو گئی کہ دنیا میں مسلمانی کے لیے تجھے باعثِ ننگ سمجھا جاتا ہے۔

۵- تیرے ضعف کا یہ حال ہے کہ پھول کی رگ سے تجھے باندھ سکتے ہیں اور نسیم کا ایک معمولی سا جھونکا بھی آئے تو تجھے زار و نزار کر دیتا ہے۔

۶- فریاد عشق کی شان ہے اور فریاد دراصل شاعر کے لیے زیبا ہے جو قوم کو عمل کی دعوت دیتا ہے اور اُس کی کوتاہیوں، کمزوریوں اور بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ تیرے شاعر کی طرف سے فریاد کی جو صدا اٹھی؛ اُس نے عشق کو ذلیل ورسوا کر دیا اور تیرے بہزاد نے عشق کی جو تصویر کھینچی، وہ حد درجہ بھونڈی اور مکروہ تھی۔

۷- تیرے دکھ اور رنج کو دیکھ کر تیرے شاعر کا چہرہ بھی زرد ہو گیا۔ تیری سردی نے اُس کی آگ کو بھی جلن سے محروم کر دیا؛ حالانکہ شاعر کا کام اس کے برعکس ہے۔ وہ قوم کے دکھ درد کو دیکھ کر اُسے دور ہونے کے لیے بیتاب ہو جاتا ہے اور اپنی حمیت کی آگ سے بے عمل اور بے حوصلہ قوم کو گرم جوشی کا پیکر بنا دیتا ہے۔

۸- تیری خستہ جانی کے باعث وہ بھی خستہ جان ہو گیا۔ تیری کمزوریوں نے اُسے بھی کمزور کر دیا۔

۹- وہ بچوں کی طرح روتا ہے اور اس کے پیالے میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ اُس کے گھر کا سروسامان کیا ہے؟ صرف ایک آہ کی تکلیف وازیت۔

۱۰۔ وہ میخانوں کے دروازوں پر بھیک مانگنے میں مست و سرشار ہے اور اُس کے گھر میں روشنی ہوتی ہے تو روزن کے راستے سے چوری چھپے آتی ہے۔

۱۱۔ اُس کا مزاج ناساز ہے، دل مُرجھایا ہُوا ہے اور دکھی نظر آتا ہے، حد یہ کہ خانۂ محبوب کے پاسبان نے اُسے مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔

۱۲۔ غموں سے گھُلتے گھُلتے وہ سرکنڈے کی طرح ہو گیا ہے اور اُس کے لبوں پر آسمان کی گردش کے خلاف سیکڑوں شکایتوں کی صف بندھی ہوئی ہے۔

۱۳۔ اُس کے آئینۂ فطرت کا جوہر یا تو خوشامد ہے یا کینہ اور کمزوری اس کی قدیم رفیق چلی آتی ہے۔

۱۴۔ اُس کا نصیبا بگڑا ہُوا ہے۔ وہ عاجز و درماندہ ہے۔ اُس کی فطرت پست ہے۔ وہ نالائق ہے۔ اُس کے دل میں کوئی امید باقی نہیں رہی اور کوئی مراد بر آتی دکھائی نہیں دیتی۔

شعر ۹ سے ۱۴ تک جو کیفیتیں پیش کی گئی ہیں، یہ ہماری دورِ زوال کی شاعری کے خاص افکار ہیں، یعنی بچّوں کی طرح رونا، آہیں بھرنا، شراب خانوں سے بھیک مانگ کر پینا، غموں کی تاریکی کے باعث روشنی سے محروم رہنا، پاسبانوں سے ذلّت اٹھانا، آسمان کی شکایتیں کرنا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ جن ادبیات کا سرمایہ یہ ہوگا وہ قوم کو پستی کی انتہائی گہرائیوں ہی میں لے جائیں گی۔ عزم، ہمّت اور جانفشانی کی ہر متاع فنا کر ڈالیں گی۔

۱۵۔ ایسے شاعروں کی آہ و فغاں ملّت کی زندگی کا سرمایہ کھا گئی اور پڑوسی کی آنکھ نیند کی لذّت سے محروم ہو گئی۔

۱۶۔ اُس عشق پر افسوس، جس کی آگ بجھ گئی ہو۔ وہ کعبے میں پیدا ہُوا اور بُت خانے میں جا کر مر گیا، یعنی وہ توحید کا پیغام لے کر اٹھا تھا، دنیا کو عزّت و احترام کی زندگی کے طریقے سکھانا اُس کا فریضہ قرار پایا تھا، لیکن وہ بُت خانے میں پہنچا تو بُتوں کے لیے موت کا پیام بننے کے بجائے خود ہی مر گیا؛ اس لیے کہ اُس نے اللہ کی رضا نہیں بلکہ غیر اللہ کو اپنا مقصود بنا لیا۔

شاعر کا اصل کام | دُرخش ۔ بجلی ۔ روشنی ۔ فروغ ۔
تُندر ۔ بجلی کی کڑک ۔

صبح حجاز و شام کُرد ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک سادہ لوح کُرد بعض عالموں یا عارفوں کے پاس پہنچا اور عرض کیا کہ تصوّف کے بارے میں رہنمائی فرمائیے۔ انھوں نے کُرد کی سادہ لوحی دیکھ کر اصل سوال کو مذاق سمجھا اور کہا کہ اپنے پاؤں رسّے سے باندھ کر چھت سے اُلٹے لٹک جانا اور فلاں ورد پڑھتے رہنا؛ تصوّف کے تمام حقائق روشن ہو جائیں گے۔ کُرد نے گھر پہنچتے ہی اس تدبیر پر عمل کیا۔ خدا نے خلوص کی برکت سے اُسے ایک ہی رات میں ولایت کے درجے پر پہنچا دیا۔ اُس نے اپنی کیفیت سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا کہ "امسیت کردیا و اصبحت عربیاً" میں شام کو کُرد تھا، صبح اٹھا تو عرب بن گیا۔

یعنی جو قلب شام کو دین کے معارف سے خالی تھا، وہ صبح کے وقت ان سے لبریز ہو گیا۔

اقبال نے شعر میں "صبح عرب" کے بجائے "صبح حجاز" کی ترکیب استعمال کی ہے، جس کی ملاحت زیادہ واضح ہے۔

کرپاس۔ یہ ہندی لفظ ہے، جسے بالعموم "کپاس" کہا جاتا ہے۔ عربوں نے تعریب میں "پ" کو "ب" سے بدلا اور "ک" کو مکسور بنا لیا۔ اس سے مراد ہے، روئی کا موٹا جھوٹا کپڑا، جس میں ملایمت نہیں ہوتی۔

ہُما۔ ایک روایتی پرندہ، جس کا سایہ بہت مبارک سمجھا جاتا ہے اور وہ ہڈیاں کھاتا ہے۔

یُمن۔ برکت علی

کُنام۔ درندوں کے رہنے سہنے کی جگہ۔ صحرائی پرندوں کا گھونسلا۔

۱۔ اے شاعر! تیری جیب میں شعر کی جو متاع موجود ہے، اُسے زندگی کی کسوٹی پر لگا۔ اُس کی اصل شان یہی ہے کہ قوم میں زندگی کی روح پیدا کرے۔

۲۔ شاعر کی فکرِ روشن قوم کے لیے عمل کی رہنما بن جاتی ہے۔ اُسے بجلی کی چمک قرار دینا چاہیے، جو کڑک اور گرج سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔

مراد ظاہر یہ ہے کہ شاعر کی فکرِ روشن بجلی کی طرح چمکتی ہے، اُس سے قوم میں عمل کی روح بیدار ہوتی ہے۔ عمل کو بجلی کی کڑک اور گرج سمجھنا چاہیے۔

۳۔ ادبیات میں ایسے افکار و خیالات کی ضرورت ہے، جن سے حسنِ عمل کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ اس سلسلے میں عربوں کی شاعری کو نمونہ بنانا چاہیے، جس کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور واقعیت ہے۔ بناوٹ کی اس میں جھلک تک نہیں پائی جاتی۔ گویا ہمارے شاعروں کو عربی شاعری کی طرف لوٹنا چاہیے۔

۴۔ لازم یہی ہے کہ دل عرب کی محبوبہ کے حوالے کیا جائے تاکہ کُرد کی شام سے حجاز کی صبح نمودار ہو۔ یعنی تمام غیر اسلامی خصوصیات مٹ جائیں اور اسلامی اوصاف جلا پائیں۔

۶،۵۔ اے شاعر! تُو نے عجم کے باغ سے پھول چنے۔ ہندوستان اور ایران کی نو بہار دیکھی۔ اب تھوڑی دیر کے لیے صحرا کی گرمی کا لطف بھی اٹھا اور کھجور کی مئے کہنہ نوش کر۔

۷۔ تُو اپنا سر صحرا کی گرم بغل میں دے دے اور جسم کو تھوڑی دیر کے لیے وہاں کی جلا دینے والی ہوا کے حوالے کر دے۔

۸۔ تُو مدت تک ریشمی لباس کی لذت میں مست رہا، اب کپاس کے موٹے جھوٹے کپڑے کا بھی عادی ہو جا۔

۱۰،۹۔ تُو صدیوں تک گلِ لالہ کے فرش پر رقص کرتا رہا اور پھول کی طرح شبنم سے منہ دھوتا رہا۔ اب جھلس دینے والی ریت پر بھی گرم رفتار ہو اور زمزم کے چشمے میں غوطہ لگا۔

ظاہر ہے کہ ان تمام اشعار میں عجمیت کو چھوڑ کر عربیت کا انداز اختیار کر لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

۱۱۔ تو بلبل کی طرح کب تک آہ و فریاد کرتا رہے گا۔ اور باغوں میں کب تک گھونسلا بناتے رہے گا؟

۱۲۔ ہما کسی جال میں نہیں پھنستا۔ تیرے جال میں وہ برکت ہے کہ اس میں پھنسنا ہما کے لیے بھی باعث شرف ہے تو کسی اونچے پہاڑ پر گھونسلا بنا،

۱۳۔ وہ گھونسلا اتنا بلند ہونا چاہیے کہ بجلی اور کڑک اس کی آغوش میں آ جائیں۔ چست و چالاک بازوں کے گھونسلے سے بھی بہت اونچا ہونا چاہیے ؂

۱۴۔ تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرے گا تو اس وقت زندگی کی جد و جہد کے قابل ہوگا۔ اس وقت تیرے جسم اور جان میں آتش حیات کی حرارت پیدا ہوگی ؂

دسواں باب

تربیتِ خودی کی منزلیں

اس باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تربیتِ خودی کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل کا نام اطاعت؛ دوسری کا نام ضبطِ نفس اور تیسری کا نام نیابت الٰہی ہے :-

تمہید اصل بیان شروع کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کے مطالب اختصار سے واضح کر دیے جائیں تاکہ انھیں ذہن نشین کرنے میں سہولت رہے۔ اقبال نے تینوں منزلوں کے لیے اونٹ کی مثال سامنے رکھی ہے۔ پہلی منزل یعنی اطاعت سے مقصود یہ ہے کہ اس آئین، دستور اور شریعت کی پابندی کی جائے جو خدا کی مقرر کی ہوئی ہے۔ یعنی خدا نے جن کاموں کا حکم دیا ہے، انھیں کیا جائے۔ اور جن سے روکا ہے، ان سے بچا جائے۔ اونٹ خدمت، محنت، صبر اور استقلال کا پیکر ہے اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اونٹ کی طرح خدا کے حکموں کا پابند بن جائے۔ ہر قسم کی محنت و مشقت اٹھائے۔ ان حکموں کی پابندی میں کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، مگر انسان کے صبر و استقلال میں فرق نہ آنا چاہیے۔

دوسری منزل ضبطِ نفس کی ہے۔ اس میں بھی اونٹ ہی کی مثال سامنے رہی ہے۔ فرماتے ہیں، اونٹ خود پرور، خود پرست اور خود سر ہے۔ بالکل یہی کیفیت نفسِ انسانی کی ہے۔ جب انسان ضبطِ نفس میں درجۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے یعنی اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے تو حرف کے بجائے گہر بن جاتا ہے۔ جو انسان نفس کو قابو میں نہیں لا سکتا اور اس کا محکوم بن جاتا ہے، وہ یقیناً اغراض کا بندہ

بنا رہے گا۔ اور یہ حالت اُسے دوسروں کا محکوم بنائے رکھے گی۔ انسان کی فطرت میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں۔ ایک محبت، دوسری خوف؛ مثلاً مال کی محبت، جان کی محبت، وطن کی محبت، اہل و عیال کی محبت، خویش و اقربا کی محبت، دنیا کا خوف، آخرت کا خوف، جان کا خوف، مختلف مصیبتوں اور پریشانیوں کا خوف۔ نفس پر قابو پا لیا جائے تو محبت اور خوف دونوں کا مرجع صرف خدا کی ذات رہ جاتی ہے، باقی تمام محبتیں اور تمام خوف باطل ہو جاتے ہیں۔ جو شخص کلمۂ توحید کا عصا ہاتھ میں رکھتا ہے، وہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ خوفِ غیر اللہ کے سب طلسم درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ وہی شخص ہے، جس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، جینا مرنا صرف خدا کے لیے ہو جاتا ہے۔ وہ ایک خدا کے سامنے جھکتا ہے۔ اور کسی کے سامنے اُس کی گردن خم نہیں ہوتی۔ اسی سلسلے میں اقبال نے ارکانِ اسلام کی حقیقی حیثیت واضح کی ہے۔

اطاعت اور ضبطِ نفس کی منزلیں کامیابی سے طے کر چکنے کے بعد انسان تیسری منزل میں داخل ہوتا ہے جس میں اُسے نیابت و خلافتِ الٰہی کا منصب مل جاتا ہے اور اس ملک کا تاجدار بن جاتا ہے، جسے کبھی زوال نہیں آتا۔ یہاں پہنچ کر اقبال نے خدا کے خلیفہ یا نائب کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں، وہ دراصل رسول اکرم صلعم کے اوصاف ہی کا پرتو ہیں۔ اسی ضمن میں اُس مبارک وجود کے ظہور کی آرزو کی ہے؛ جو روایات کے مطابق آئے گا تو دنیا کو عدل و راحت سے بھر دے گا۔

پہلی منزل؛ اطاعت | زورق۔ چھوٹی کشتی۔

حسن المآب۔ یہ سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○

(انسان کے لیے مرد و عورت کے رشتے میں، اولاد میں، سونے چاندی کے ذخیروں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشی میں اور کھیتی باڑی میں دل کا اٹکاؤ اور خوش نمائی رکھ دی گئی ہے لیکن یہ جو کچھ ہے، دنیوی زندگی کا فائدہ اٹھانا ہے اور بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے) اصل ٹکڑے کے معنی ہیں "اس کے پاس بہتر ٹھکانا ہے"

طغیان۔ حد سے گزرنا۔ سرکشی۔

۱۔ اونٹ کا شیوہ ہی یہ ہے کہ محنت و مشقت اٹھائے اور خدمت انجام دے۔ صبر و استقلال ہی اس کا کام ہے۔

اُسے بوجھ اُٹھا کر جن منزلوں میں چلنا پڑتا ہے، اُن میں ایسے ہی اوصاف درکار ہیں، مثلاً صحرائی علاقہ، جہاں سینکڑوں میل تک یا تو ریت ہوتی ہے یا خشک و بے آب پہاڑیاں اور سنگریزے۔ نہ درخت ملتے ہیں نہ سایہ، نہ سبزہ اور نہ پانی۔ اونٹ کئی کئی دن چارے اور پانی کے بغیر گزار لیتا ہے۔ ایسی زندگی محنت و مشقت اور صبر و استقلال کی خاص صلاحیتوں کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی؛

۲۔ قدرت نے اونٹ کے پاؤں ایسے بنا دیے ہیں کہ وہ چلتا ہے تو آواز نہیں آتی کیونکہ پاؤں چوڑے ہوتے ہیں اور اُنھیں آہستگی سے زمین پر رکھنے کا عادی ہے۔ قافلوں کے لیے صحرا میں اونٹ کی حیثیت وہی ہے جو سمندر میں جہاز اور کشتی کی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اونٹ کو صحرا کا جہاز کہتے ہیں۔

۳۔ ہر صحرا میں آمد و رفت اونٹ ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ حق یہ ہے کہ کوئی صحرا کوئی بیابان ایسا نہیں جس کے کسی حصے میں اونٹ کے نقشِ پا نہ ہوں۔ وہ بہت کم کھاتا ہے، بہت کم سوتا ہے اور محنت و مشقت اُس کا کام ہے؛

۴۔ پیٹھ پر کجاوے کا بوجھ اُٹھا کر ایسے انداز میں چلتا ہے گویا مست و سرشار ہے اور رقص کرتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے؛

۵۔ وہ رفتار کے نشے میں محو ہو کر چلتا ہے اور سفر کی حالت میں اپنے سوار کے مقابلے میں زیادہ صبر کا ثبوت دیتا ہے۔

اونٹ کے چلنے میں ایک خاص کیفیت ہوتی ہے اور اُس وقت وہ مہار سے بھی بے پروا ہو جاتا ہے۔ شتر سوار کو سفر میں صبر سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ ایک تو صحرا کی منزل بڑی دشوار ہوتی ہے، دوسرے اونٹ دوسری سواریوں کے مقابلے میں آہستہ چلتا ہے، مگر خود اونٹ سفر میں سوار سے بھی زیادہ صبر کا ثبوت دیتا ہے؛

۶۔ اے انسان! تُو بھی اُن فرضوں کا بوجھ اُٹھانے سے سرتابی نہ کر، جو خدا نے تیرے ذمے لگا دیے ہیں۔ اسی طرح تُو اس بہترین ٹھکانے پر پہنچ جائے گا جو خدا کے پاس ہے؛

۷۔ اے غفلت کے ماتے! تُو شریعت کی فرمانبرداری میں سرگرم رہ۔ یاد رکھ کہ جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے؛

جبر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے خدا نے جو ضابطے اور قاعدے مقرر کر دیے ہیں، اُن کا پابند رہے اور اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے۔ بظاہر یہ جبر ہے یعنی انسان کو مجبور کیا گیا ہے، لیکن اسی سے حقیقی آزادی اور خود مختاری پیدا ہوتی ہے۔

شاید سرسری نظر میں یہ عجیب معلوم ہو لیکن ذرا غور کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے معمولی سا آدمی کوئی حکم لے کر آتا ہے تو اسے حکومت ہی کا حکم سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کے حکموں کو پورا کرنے اور اس کی رضا پر چلنے والا بھی جو کچھ کرے گا، خدا ہی کی طرف سے کرے گا۔ یہی سچی حریت اور سچا اختیار ہے، جو پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ مشہور حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ بندہ نفلوں کے ذریعے سے قرب حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ خدا اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ جب میں بندے

سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اُس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔ اُس کی زبان بن جاتا ہوں، جس سے وہ بولتا ہے۔ یہ وہی اختیار و آزادی ہے، جو پابندی سے حاصل ہوتی ہے۔ بالکل یہی مضمون مولانا رُوم نے حسب ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

من بہ جاناں زندہ ام، از جاں نیم	من ز جاں بگزشتم و جانانیم
چشم و گوش و دست و پایم او گرفت	من بدر رفتم، سرایم او گرفت
ایں بصر دیں سمع از آلاتِ اوست	بلکہ ذراتِ تنم مرآتِ اوست
نغمہ از نائیست نے از نے بداں	مستی از ساقیست نے از مے بداں

قرآن مجید کا ارشاد ہے، قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔
(اے پیغمبر! کہہ دو) اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو چاہیے کہ میری پیروی کیا کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا) رسول اللہ صلعم کی پیروی یعنی شریعت کی پابندی بندے کو اللہ کی محبت سے سرفرازی بخشتی ہے۔ جس سے اللہ محبت کرے، اس کی آزادی اور اختیار میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ یہ آزادی پابندی سے پیدا ہوتی ہے۔

۸۔ سچے احکام کی پابندی ایسی شے ہے، جو نکمے اور بے حقیقت آدمی کو بھی واقعی انسان بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس سرکشی اور نافرمانی کا یہ حال ہے کہ اگر آگ بھی ہو تو وہ بھڑک بھڑک کر راکھ بن جائے گی اور اُس کی حیثیت خس کی سی رہ جائے گی۔

اب اقبال مظاہرِ قدرت میں سے مختلف چیزیں بطور مثال پیش کرتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ خاص آئین کی پابندی نے اُن میں کیا جوہر پیدا کر دیے۔

۹۔ جو شخص چاند تاروں کو تسخیر کرتا ہے، وہ بھی اپنے آپ کو ایک ضابطے، ایک آئین اور ایک مجموعۂ احکام کا پابند بنا لیتا ہے۔

۱۰۔ ہوا پھول کے قید خانے میں بند ہو کر خوشبو بن جاتی ہے۔ بُو ہرن کی ناف میں کچھ دیر بند رہ کر نافے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ پابندی کی مثالیں ہیں۔ خوشبو اصلاً ہوا کے سوا کچھ نہیں۔ شگوفے کے اندر بند رہ کر اس میں ایسی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے کہ بار بار سونگھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہی کیفیت نافۂ آہو کی ہے۔

۱۱۔ آسمان کی طرف دیکھو، ستارے منزلِ مقصود کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ انھوں نے بھی ایک آئین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رکھا ہے۔

۱۲۔ سبزے پر نظر ڈالو، یہ زمین سے اُگتا ہے تو نمو کے قاعدے کا پابند ہو کر اُگتا ہے، لیکن جب اس قاعدے

کو چھوڑ دیا ہے تو پاؤں کے نیچے روندا جاتا ہے ؛

۱۳- گُلِ لالہ کا آئین یہ ہے کہ ہر لحظہ سرخ رہے اور دیکھنے والے کو جلتا ہوا نظر آئے - اُس کا خون ہر لحظہ رگوں میں اچھلتا رہتا ہے -

۱۴- بہُت سے قطرے ایک خاص قاعدے کے مطابق باہم مل جاتے ہیں تو دریا بن جاتے ہیں- اسی طرح بہت سے ذرّوں کے اکٹھا ہو جانے سے صحرا نمودار ہوتا ہے یعنی قطروں اور ذرّوں میں مل جانے کا قانون کارفرما ہوتا تو نہ دریا وجود میں آتے نہ صحرا ؛

یہ تمام مثالیں آئین کی پابندی کے سلسلے میں پیش کی گئیں - بلاشبہ یہ شاعرانہ استدلال ہے، لیکن اس کے مؤثر و دل نشیں ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے اور شاعر کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ مخاطبوں تک پہنچانا چاہتا ہے، اُسے زیادہ سے زیادہ محبوب و جمیل انداز میں دلوں کے اندر اتار دے

۱۵- ہر شے کی ہستی ایک آئین اور ایک ضابطے کی پابندی ہی سے پختہ ہے - پھر تو نے اس پابندی اور فرمانبرداری کو کیوں پسِ پُشت ڈال رکھا ہے ؟

۱۶- تو نے اپنے آپ کو اُس شریعت کے ضابطوں سے آزاد کر رکھا ہے، جو اس کائنات کی سب سے پُرانی شریعت ہے ، تجھے چاہیے کہ پھر چاندی کی اُسی زنجیر کو پاؤں کی زینت بنا لے ۔

زنجیر اس لیے کہا کہ اُس میں پابندی اور فرمانبرداری ہے اور کوئی ضابطہ ایسا نہیں جس کی برکتیں پابندی کے بغیر نمایاں ہو سکیں - چاندی کی زنجیر اس لیے کہا کہ اس پابندی کا حقیقی مقصود آزار پہنچانا یا بے دست و پا کرنا نہیں بلکہ اُسے ترقی، برتری اور سربلندی کی دلیل بنانا ہے - اُس میں تکلیف نہیں، شفقت و تربیت کا پہلو ہے ۔

۱۷- یہ شکایت نہ کر کہ شریعت کی پابندی مشکل ہے کیونکہ جو پابندیاں اس میں مقرّر ہو گئیں، وہ انسان ہی کی بہتری کے لیے ہیں - پھر یہ تمام پابندیاں رسول اکرم صلعم کے ذریعے سے مقرّر ہوئیں - تیرا فرض ہے کہ اُن کا پورا خیال رکھے خوشدلی سے اُن پر عمل پیرا رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اُس دائرے سے باہر نہ ہو -

دوسری منزل، ضبطِ نفس | زمام - باگ - عنان -

امتزاج - ملاوٹ - آمیزش ۔

باد و طین - پانی اور مٹی - آب و گِل -

فحشا - بدکاری - بے حیائی -

منکر - برائی - ناشائستگی - خلافِ شرع -

مرعوب۔ رعب میں آیا ہوا۔ ڈرا ہوا۔

ساطور۔ چھرا۔

یکی۔ ایک ہونا۔ تنہا ہونا۔

حجِ اصغر۔ لغوی معنی چھوٹا حج۔ اصطلاح میں عمرہ کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں حج حجِ اکبر ہے، جیسا کہ سورۂ توبہ کی تیسری آیت سے واضح ہے۔

قاتلِ فحشا و منکر۔ اس شعر میں سورۂ عنکبوت کی مندرجۂ ذیل آیت پیش نظر رکھنی چاہیے:
وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (اور نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کر، تحقیق نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)

بغی۔ ظلم۔ سرکشی۔

جوع۔ بھوک۔

عطش۔ پیاس۔

حتیٰ تنفقوا۔ اشارہ ہے چوتھے پارے کی پہلی آیت کی طرف:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

(یاد رکھو نیکی کا درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے، جب تک تم میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ مال و دولت میں سے جو کچھ محبوب رکھتے ہو، اُسے راہِ حق میں خرچ کرو)

۱۔ تیرا نفس اونٹ کی طرح اپنے آپ کو پالنے والا ہے۔ ساتھ ہی وہ خود پرست بھی ہے یعنی اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتا۔ اپنے آپ پر کسی کا اختیار روا نہیں رکھتا اور سرکش بھی ہے۔

۲۔ نفس کی یہ تمام بری خصلتیں واضح کر دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! تو اپنے اندر مردانگی پیدا کر اور نفس کی باگ تھام لے، اُس پر قابو پا لے تاکہ تیرا ٹھیکرا گوہر بن جائے اور تیرا وجود بے حقیقی کی پستی سے اٹھ کر بلند حیثیت اختیار کر لے۔

۳۔ دیکھ، یہ حقیقت فراموش نہ کر کہ جو شخص اپنے نفس پر قابو نہیں پاتا اور اسے تابع فرمان نہیں رکھتا، وہ دوسروں کا فرمانبردار بن جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص نفس کو قابو میں نہیں رکھے گا، وہ ہر قسم کی خواہشات کا غلام بن جائے گا اور ہر اُس شخص کی غلامی قبول کر لے گا، جس سے اغراض پوری ہونے کی امید بندھ سکے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے نفس کو قابو میں رکھے گا، وہ کسی دوسرے کا محتاج نہ ہوگا۔

۴ - تیری تعمیر مٹی سے ہوئی ہے یعنی تو آب و گل سے بنا ہے۔ اس تعمیر میں محبت اور خوف دو چیزوں کو ملا دیا گیا ہے۔

۵ - خوف کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تیرے دل میں دنیا کا خوف ہے۔ آخرت کا خوف ہے، جان کا خوف ہے۔ زمین اور آسمان سے جو آفتیں نازل ہوتی رہتی ہیں، ان کا خوف ہے۔

۶ - اسی طرح محبت کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثلاً انسان کے دل میں مال اور دولت کی محبت ہوتی ہے۔ وطن کی محبت ہوتی ہے۔ بال بچوں، عزیزوں اور قریبیوں کی محبت ہوتی ہے۔

محبت اور خوف کے یہ تمام وسیلے انسان کے لیے نفس پرستی کا موجب بن جاتے ہیں اور اپنے آپ پر قابو پانے میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

۷ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی اور مٹی کا باہم مل جانا ہی تن پروری کا سامان ہے یعنی آب و گل سے جو وجود تیار ہوتا ہے، اُس میں اپنے آپ کو پالنے کے رجحانات موجود رہتے ہیں۔ وہ برائیوں اور بدکاریوں کا شکار بن سکتا ہے۔

۸ - فرماتے ہیں: تیرے ہاتھ میں کلمۂ توحید کا عصا ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے عصا نے فرعونی جادوگروں کے طلسم توڑ ڈالے تھے، اُسی طرح عصائے توحید خوف کے ہر طلسم کو پارہ پارہ کر ڈالے گا۔

۹ - جس وجود میں حق جان کی حیثیت اختیار کرے، اُس کی گردن کبھی باطل کے سامنے نہیں جھک سکتی۔

۱۰ - اُس کے سینے میں خوف کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی، یعنی خوف داخل ہی نہیں ہو سکتا اور اُس کا دل خدا کے سوا کسی ہستی سے ہرگز ڈر ہی نہیں سکتا۔

۱۱ - جس شخص نے توحید کی سرزمین میں قیام اختیار کر لیا، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بال بچوں کی بندش سے بالکل آزاد ہو گیا۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ بیوی بچوں کو چھوڑ دیتا ہے یا اقربا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ دنیا کا کوئی رشتہ اُس کے نزدیک حق سے زیادہ پیارا نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر رشتے کے تقاضے اُسی طرح پورے کرتا ہے، جس طرح خدا کا حکم ہے۔ سچے توحید پرست کے لیے جہاں عالم اسباب میں بال بچوں اور دوسرے رشتوں کی نگہداشت ضروری ہے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر حق کے لیے اپنی یا ان رشتوں کی قربانی ناگزیر ہو جائے تو ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہ کرے۔ گویا بال بچوں کے رشتے اور دوسرے رشتوں کی ایک حد مقرر ہے، اُس میں کمی بیشی نہ ہونی چاہیے۔ زن و اولاد کی بندش سے فراغت کا صرف یہ مطلب ہے:

۱۲ - وہ خدا کے سوا ہر طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور قربانی کا موقع آ جانے پر حضرت ابراہیمؑ کی طرح جگر بند کے حلق پر چھرا رکھ دینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتا۔

۱۳ - اگرچہ وہ اکیلا ہو اور کوئی اُس کا یار و مددگار نہ ہو، تاہم اُس کی مثال یہ ہوتی ہے، جیسے لاؤ لشکر کا مالک ہے۔ ایسا

کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ وہ جان کو ہوا سے زیادہ ارزاں سمجھتا ہے اور جو شخص جان سے بے پروا ہو، اس کی بے پناہ قوت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ روئے زمین پر ہوا سے زیادہ ارزاں کوئی شے نہیں۔ اس کائنات کا ہر وجود اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

۱۴۔ اب ارکانِ اسلام کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر ہم توحید کو سیپی فرض کرلیں تو اس سیپی میں نماز کو موتی سمجھنا چاہیے۔ مسلمان کے دل کے لیے نماز کو عمرے کا درجہ حاصل ہے، گویا مسلمان ادائے نماز کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جاتا ہے تو اس کے دل کی یہ کیفیت ہوتی ہے یا ہونی چاہیے، جیسے خانۂ خدا میں عمرہ ادا کر رہا ہے۔

عبادات میں نماز سب سے پہلے آتی ہے۔ عمل کے لحاظ سے یہ کفر اور اسلام کے درمیان حدِ فاصل ہے اسی لیے بعض روایتوں میں اسے مومن کی معراج قرار دیا گیا ہے۔

۱۵۔ نماز مسلمان کے ہاتھ میں ایک تلوار کی مانند ہے۔ اس تلوار سے کام لے کر مسلمان برائیوں، بے حیائیوں، سرکشیوں اور ظلم و زیادتی کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت سے واضح ہے، نماز مسلمان میں ایک خاص صلاحیت پیدا کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے وہ خود بھی برائیوں سے دور رہتا ہے، دوسروں کو بھی دور رہنے میں مدد دیتا ہے۔ جو قوم نماز کی پابند ہو گی، وہ اس کی برکتوں سے فائدہ اٹھائے گی۔ اور اس میں برائیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ جہاں یہ برکتیں پیدا نہ ہوں، سمجھ لینا چاہیے کہ نماز ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کی گئی۔

۱۶۔ نماز کے بعد روزہ آتا ہے۔ فرماتے ہیں: روزے میں انسان کو ایک خاص وقت کے لیے کھانے پینے سے رک جانا پڑتا ہے، گویا روزہ بھوک اور پیاس پر شب خون مارتا ہے۔ انسان کے وجود میں تن پروری کو وہی حیثیت حاصل ہے جو خیبر میں یہود کے قلعوں کو حاصل تھی۔ روزہ اس خیبر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے یعنی تن پروری بالکل باقی نہیں رہتی۔

ظاہر ہے کہ زندگی میں انسان کو ہر قسم کی حالتیں پیش آ جاتی ہیں۔ سفر میں وقت پر کھانا نہیں ملتا، طرح طرح کی گوناگوں تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر انسان میں بھوک اور پیاس کو صبر سے برداشت کر لینے کی ہمت پیدا ہو جائے تو اسے کسی بھی منزل پر تکلیف اٹھانی نہ پڑے گی۔ روزہ مسلمانوں میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی مصیبت زدہ لوگوں کے لیے دل میں ہمدردی کا جذبہ ابھارتا ہے۔

۱۷۔ حج مومنوں کی فطرت کو منور کر دیتا ہے۔ انھیں گھر بار چھوڑنے کی تعلیم دیتا ہے اور وطن کی محبت دل سے نکال دیتا ہے۔

حج ہر مسلمان پر فرض ہے، جس کے پاس خانۂ کعبہ تک آنے جانے کا خرچ موجود ہو۔ مسلمان گھر بار چھوڑ کر حج کے لیے اس سرزمین میں پہنچ جاتا ہے جہاں اسلام کا چشمہ اُبلا اور جہاں وہ پاک گھر موجود ہے، جو خدا کی عبادت کے لیے سب سے پہلے تعمیر ہوا۔ گویا حج مسلمانوں کو پہلے یہ سبق دیتا ہے

کہ حق کے لیے گھر بار چھوڑنے میں تامل نہ ہونا چاہیے اور اس عارضی ترک سے مسلمانوں کے دل میں ہجرت کا ذوق بھی پیدا ہوتا ہے اور وطن کی محبت بھی ایک خاص ضابطے کے اندر آجاتی ہے۔ فطرت میں جلا پیدا ہونے کا مطلب یہی ہے کہ مسلمان خدا کے لیے ہجرت کی روح سے معمور رہے اور وطن کی محبت ایسی شکل اختیار نہ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے باز رہ جائے۔ یہ حج کی عام خصوصیتیں ہوئیں۔ مزید فرماتے ہیں:

۱۸۔ حج ایک ایسی عبادت ہے، جو مسلمانوں کی جمعیت مستحکم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ملت کو ایک کتاب فرض کریں تو حج اُس کتاب کے اوراق کو یکجا رکھنے کے لیے ایک شیرازے اور بندش کا کام دیتا ہے:

ظاہر ہے کہ حج کے موقع پر دنیا کے ہر حصے سے مسلمان مکۂ معظمہ پہنچتے ہیں۔ گویا یہ مسلمانوں کے بین الملّی اجتماع کی ایک خاص تقریب ہے جو مقررہ وقت پر سال بہ سال انجام پاتی رہتی ہے:

۱۹۔ توحید، نماز، روزے اور حج کے بعد اسلام کا صرف ایک رکن رہ گیا اور وہ زکوٰۃ ہے۔ فرماتے ہیں:

زکوٰۃ مسلمان کے دل سے اوّل دولت کی محبت فنا کرتی ہے، دوم اُسے یہ درس دیتی ہے کہ سب مسلمان برابر ہیں۔ ان میں کوئی اونچ نیچ اور کوئی فرق نہیں:

۲۰۔ ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ اُس وقت تک نیکی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے، جب تک مال و دولت میں سے جو کچھ محبوب ہے اُسے خرچ نہ کر ڈالیں۔ زکوٰۃ اس حکم سے ہمارے دل میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ دولت بڑھاتی ہے، مگر دولت کی محبت گھٹاتی ہے۔ دولت اس طرح بڑھاتی ہے کہ اوّل مال کا خرچ کرنا اُس کی برکت میں اضافہ کرتا ہے، دوسرے قوم کے اُن افراد کی جائز ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، جو بعض اتفاقات کی بنا پر پس ماندہ رہ جاتے ہیں۔ اس طرح قوم کی عام خوش حالی بڑھتی ہے اور ظاہر ہے کہ مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اُس کی محبت کم ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ دولت کی افزائش بُری نہیں، صرف اُس کی محبت بُری ہے۔

۲۱۔ ارکانِ اسلام کی اس مختصر مگر جامع وضاحت کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ تمام ارکانِ مسلمان کی پختگی اور استحکام کے ذریعے ہیں۔ اگر تو اِن ارکان پر مضبوطی سے قائم ہے اور اسلام پر کاربندی میں استوار ہے تو سمجھ لے کہ تو خود بھی پختہ اور استوار ہے:

۲۲۔ تو "یا قوی" کا ورد جاری رکھ اور صاحب قوت بن جا۔ اسی طرح اپنے جسم اور اپنے نفس پر قابو پائے گا۔ اس کی حیثیت خاک کے اونٹ کی سی ہے۔ جو اس پر سوار ہو جائے گا، وہی مالک و مختار بن جائے گا۔ جس طرف چاہے گا، چلائے گا:

"قوی" اللہ تعالیٰ کا ایک اسم ہے۔ اس کا ورد اس لیے تجویز کیا کہ ہر اسم کی ایک معنوی

خصوصیت ہے اور قوت پیدا کرنے کے لیے "یا قوی" کے ورد کی مناسبت بالکل واضح ہے :

تیسری منزل، نیابت الٰہی | لا یبلیٰ ۔ سورۂ طٰہٰ کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ حضرت آدمؑ کو بتا دیا گیا تھا کہ شیطان دشمن ہے، اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس کے باوجود جب شیطان نے یہ کہا:

یٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۔

(اے آدمی! میں تمھیں ہمیشگی کے درخت کا نشان دے دوں اور ایسی بادشاہی کا جسے کبھی زوال نہ ہو

ملک لا یبلیٰ کے معنی ہیں ایسا ملک جسے کبھی زوال نہ ہو۔ زمانے کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہنے والا ملک

اسم اعظم۔ لغوی معنی، سب سے بڑا نام۔ یہ اللہ کے کسی نام کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن کسی ایک نام پر اتفاق نہیں۔ بعض کہتے ہیں اللہ، بعض رحمٰن و رحیم، بعض الحیّ القیّوم وغیرہ۔ مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ کا ایسا نام، جس کی برکت سے دنیا کے سب کام ہو جاتے ہیں۔

قائم بامر اللہ۔ لغوی معنی، اللہ کے حکم سے قائم۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے، ایسا شخص جو اللہ کے احکام جاری کرے اور ان کی حفاظت کا فرض انجام دے۔

شیب۔ بڑھاپا۔

بشیر۔ نیکیوں کے لیے نیک جزاء کی بشارت دینے والا، خوشخبری سنانے والا۔

نذیر۔ برائیوں کے لیے عذاب و سزا سے ڈرانے والا۔

علم الاسماء۔ حضرت آدمؑ کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (اور آدمؑ نے تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لیے) یہاں شاعر کا مقصود یہ ہے کہ اسماء الٰہی کی تعلیم سے جو بھی مقصد و مدعا تھا، نائب برحق دنیا میں اسے پورا کرتا ہے :

سبحان الذی اسریٰ۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِىْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ (پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی، جس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی اور اس لیے سیر کرائی کہ ہم اپنی نشانیاں اسے دکھا دیں)

یہ رسول اللہ صلعم کی حیات مبارک کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے، جسے واقعۂ معراج بھی کہا جاتا ہے، نشانیوں سے مراد یہاں دلائل حقیقت کا عینی مشاہدہ ہے اور اس واقعے کو

وحی کی تکمیل سمجھا جاتا ہے۔

توام - جڑواں - جب دو چیزیں بالکل ہمسر ہوں تو ان کے لیے بھی توام مستعمل ہے۔

سمند - بادامی رنگ کا گھوڑا - گھوڑا۔

توجیہ - وجہ بیان کرنا۔

تجدید - تازہ کرنا - از سر نو کرنا۔

مکنون - پوشیدہ - چھپا ہوا۔

۱ - اگر تو نفس کے اونٹ کو قابو میں لے آئے اور اس پر پورا تسلط حاصل کرے تو تو دنیا پر حکم چلائے گا اور سلیمانؑ کا تاج تیرے سر کی زینت بنے گا۔

۲ - جب تک یہ جہان باقی ہے، تو اس کی آرائش کا سامان بنا رہے گا یعنی ایسی مملکت کا تاجدار بن جائے گا، جس پر کبھی زوال نہ آئے

۳ - تو دنیا میں خدا کا خلیفہ اور نائب بن جائے گا۔ خدا کی خلافت کا منصب بہت ہی اچھا منصب ہے۔ جسے یہ حاصل ہو جائے، وہ عناصر پر حکم چلاتا ہے اور عناصر پر حکم چلانا کتنا اچھا ہے۔

۴ - خدا کے خلیفہ اور نائب کو دنیا کے تعلق میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے، جو جسم کے تعلق میں جان کی ہے۔ جس طرح بدن کی تمام خوبیاں جان کی وجہ سے ہیں۔ اسی طرح اس جہان کو نائب حق خوبیوں کے بہشت زار بنا دیتا ہے۔ اس کا وجود اسم اعظم کا سایہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے کام اسی کی توجہ سے انجام پاتے ہیں اور وہ تمام مشکلات کو ختم کرتا جاتا ہے۔

۵ - نائب حق جزو و کل کے تمام بھید جانتا ہے۔ وہ دنیا میں اللہ کے حکم سے قائم ہے اور اللہ کے حکم جاری کرنا اس کا اصل کام ہے۔

۶ - وہ دنیا کی وسعت میں خیمہ لگا لیتا ہے تو پرانی بساط و رسم برہم کر دیتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ پرانا دور ختم اور نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔

۷ - نائب حق کی فطرت برکتوں اور اچھائیوں کے منصوبوں سے بھری ہوتی ہے اور وہ منصوبے اس امر کے متقاضی ہوتے ہیں کہ عملی صورت اختیار کریں۔ اس غرض سے نائب حق ایک نئی دنیا پیدا کر لیتا ہے۔

مطلب یہ نہیں کہ مادی دنیا بدل جاتی ہے بلکہ اس کا نظم ونسق، طور طریقے، اخلاق و مذہب غرض ہر شے ایک نئی صورت اختیار کر لیتی ہے تاکہ خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

۸ - جزو و کل کے اس جہان کی طرح، جس میں ہم رہتے ہیں، سیکڑوں جہان نائب حق کی فطرت میں موجود ہوتے ہیں اور اس کے خیالات و افکار کی کیاریوں سے پھولوں کی طرح اُگتے رہتے ہیں۔

۹ - نائبِ حق ہر خام فطرت کو پختہ اور پائدار بنا دیتا ہے ۔ جس طرح رسول اللہ صلعم نے حرم سے بُت نکلوا دیے تھے، اسی طرح نائبِ حق ہمجنسوں کی فطرت سے ہوا و ہوس کے بت نکال دیتا ہے۔ یہی اُن کی فطرت کو پختہ کرنے کا طریقہ ہے۔

غور فرمائیے کہ رسول اللہ صلعم کے ظہور سے پیشتر کعبہ بُتوں سے بھر گیا تھا گویا جو مرکز پوری دنیا کے لیے توحید کا رہبر تھا وہ اپنی حد تک بھی اصل منصب کھو بیٹھا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے کعبے کو بتوں سے پاک کیا تو اس کا اصل منصب بحال ہو گیا۔ نائبِ حق کی شان بھی یہی ہے کہ انسانی فطرت کو اغراض سے پاک کر کے اصل منصب پر لگا دے، جو اللہ کی رضا کے مطابق چلنے کے سوا کچھ نہیں۔

۱۰ - دل کے ساز پہلے سے موجود ہوتے ہیں، لیکن ان کے تاروں سے نغمے اسی وقت نکلتے ہیں، جب نائبِ حق کی مضرب ان پر لگتی ہے۔ گویا انسان کے اندر خدا نے جتنی صلاحیتیں رکھی ہیں، ان سے صحیح کام صرف نائبِ حق لیتا ہے۔ وہ ایسا وجود ہے جس کا جاگنا اور سونا دونوں اللہ کے لیے ہوتے ہیں۔ جاگتا اس لیے ہے کہ خدا کا حکم بجا لائے اور سب کو راہِ حق پر لگائے۔ سوتا اس لیے ہے کہ اس کا جسم فطری تقاضے کے مطابق آرام لے تاکہ وہ زیادہ مستعدی اور جانفشانی سے رضائے باری تعالیٰ کا فرض پورا کرے۔

۱۱ - نائبِ حق بڑھاپے کو جوانی کی لے سکھا دیتا ہے اور ہر چیز کو جوانی کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

۱۲ - نائبِ حق انسانوں کو نیک کاموں کے لیے نیک جزا کی خوشخبری سناتا ہے اور برے کاموں کے برے نتیجے سے ڈراتا بھی رہتا ہے۔ وہ سپاہی بھی ہوتا ہے۔ . . . سپہ سالار بھی اور امیر بھی۔

۱۳ - نائبِ حق اُس تعلیم کا مقصود و مدعا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے خدا نے حضرت آدمؑ کو فرشتوں پر برتری عطا کر دی تھی اور نائبِ حق اُس قدسی سیر کا راز ہوتا ہے جو خدا نے رسول پاکؐ کو دلائل حقیقت کے عینی مشاہدے کے لیے کرائی تھی۔

۱۴ - نائبِ حق کو علم حق کے ساتھ قوت و طاقت بھی عطا ہوتی ہے گویا اس کا علم اور قدرتِ کامل دونوں جڑواں ہوتے ہیں یعنی باہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ انھیں جو معجزے عطا کیے تھے، ان میں سے دو خاص پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یدِ بیضا یعنی روشن ہاتھ جسے اقبال نے دستِ سفید قرار دیا ہے، دوسرا عصا یعنی وہ لاٹھی جس نے فرعونی ساحروں کے تمام طلسم باطل کر ڈالے تھے۔ یدِ بیضا سے بہ ظاہر مراد روشن شریعت ہے اور عصا سے مراد وہ قوت ہے جو شریعت کی محافظ ہوتی ہے۔ اسی لیے اقبال نے نائبِ حق

کے علم اور قوت کو جڑ ڈال قرار دیا۔

۱۵۔ نائبِ حق زمانے کے گھوڑے پر جم کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی باگ تھامتا ہے تو یہ گھوڑا خوب تیز چلنے لگتا ہے۔

ظاہر ہے کہ زمانے کے گھوڑے پر شہسواری اسی مبارک وجود کے لیے زیبا ہے جو علم و قدرت میں کامل ہو اور جس کے پاس روشن شریعت کے ساتھ زبردست قوت ہو۔

سورۂ حدید میں فرمایا ہے

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں لوگوں کے لیے سخت دہشت بھی ہے اور کثیر فائدے بھی۔ دہشت اُن کے لیے جو راہِ عدل سے ہٹنے کی کوشش کریں، فائدے اُن کے لیے جو کتاب اور میزان کے مطابق عمل پیرا رہیں۔

۱۶۔ نائبِ حق کی ہیبت دریائے نیل کو خشک کر دیتی ہے اور اسرائیل کو مصر سے باہر لے جاتی ہے تاکہ وہ فرعون کی غلامی سے نجات پائیں۔

اس شعر میں بھی حضرت موسیٰؑ ہی کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق معلوم ہے کہ فرعون جیسے قاہر و جابر بادشاہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بنی اسرائیل کو غلامی کی مصیبت سے نجات دلا دی۔

یہاں یہ بھی بیان کر دینا چاہیے کہ مستند تاریخی روایات کے مطابق مصر سے ہجرت کے وقت بنی اسرائیل کو دریائے نیل عبور نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ اس دریا کے مشرق میں آباد تھے۔ جس پانی سے وہ خدا کی خاص حفاظت میں صحیح سلامت گزرے اور پانی نے دو ٹکڑے ہو کر ان کے لیے راستہ پیدا کر دیا، وہ بحیرۂ قلزم کا شمالی گوشہ تھا۔ البتہ بعض مفسرین نے نیل سے بھی گزرنے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ بنی اسرائیل نیل سے گزرے یا بحیرۂ قلزم سے۔ حضرت موسیٰؑ کے عصا اور دعا سے دریا کا کچھ حصہ تھوڑی دیر کے لیے خشک ہوا تھا یا سمندر کا۔ مراد یہ ہے کہ بڑی سے بڑی مشکل نائبِ حق کو ہراساں نہیں کر سکتی۔ کوئی باطل قوت اُسے دبا نہیں سکتی۔ وہ مشکلات کے بڑے سے بڑے طوفانوں میں بھی اپنے لیے راستہ پیدا کر لیتا ہے اور حضرت موسیٰؑ کی مثال ہر لحاظ سے یہاں موزوں ہے:

۱۷۔ نائبِ حق کی زبان سے قُم کی صدا بلند ہوتی ہے تو مری ہوئی جانیں جسموں کی قبروں میں اس طرح جی اٹھتی ہیں، جس طرح صنوبر کے درخت باغوں میں اُگتے ہیں۔

۱۸۔ نائبِ حق ہی ہے جو بتاتا ہے کہ اس دنیا کا حقیقی مقصد و مدعا کیا ہے۔ وہی ہے جس کے جلال و عظمت پر دنیا کی نجات موقوف ہے

۱۹۔ اسی کے سایے کی حفاظت میں ذرّے کو سورج سے شناسائی پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اپنا سرمایۂ زندگی میں شامل کر دیتا ہے تو اُس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔

۲۰۔ وہ زورِ عمل کے اعجاز سے ہر شے میں زندگی کی قوت بھر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے عمل کے طور طریقے سراسر نئے ہو جاتے ہیں۔

۲۱۔ جہاں نائبِ حق پاؤں رکھتے، وہاں سے جلوے اُٹھتے ہیں اور سیکڑوں کلیم اُس کے سینا تک پہنچنے کے لیے بیتاب نظر آتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں کلیم اور سینا بطورِ استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ انوارِ الٰہی سے مستفیض اور کلامِ الٰہی سے مشرف ہونے کے لیے سینا پہاڑ پر پہنچے تھے، جہاں انھیں نبوت کا منصب عطا ہوا۔ نائبِ حق کے ساتھ بے شمار افراد ہو جاتے ہیں جو اُس کے ہر حکم کی پیروی دلی خلوص اور تڑپ سے کرتے ہیں۔ شاعر نے اس صورتِ حال کی تعبیر یوں کی کہ نائبِ حق کی ہدایت کو اگر کوہِ سینا فرض کیا جائے تو ہزاروں کلیم اس کی طرف بیتابانہ دوڑے جاتے ہیں اور اسی کے نقشِ قدم پر چلنے سے ہدایت کی روشنی ملتی ہے۔

۲۲۔ نائبِ حق زندگی کی تفسیر نئے سرے سے کر دیتا ہے اور اس خواب کی تعبیر کا نیا ڈھنگ پیدا کر لیتا ہے۔

۲۳۔ اُس کی پوشیدہ ہستی زندگی کا راز ہوتی ہے۔ اس ساز میں وہ ایسا نغمہ ہوتا ہے جو پہلے کبھی نہ سنا گیا ہو۔

۲۴۔ فطرت ہر لحظہ مضمون باندھنے میں لگی رہتی ہے۔ جب وہ کاوش کرتے کرتے گھُل گھُل کر لہو بن جاتی ہے تو نائبِ حق کی ذات کے دو مصرعے موزون ہوتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ نائبِ حق کا پیدا ہونا آسان نہیں: یہاں خواجہ سنائیؒ کا یہ مشہور شعر پیشِ نظر رکھ لینا چاہیے:

دور ہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

نائبِ حق کے لیے التجا | اشہب۔ ہر وہ چیز جس میں سفیدی سیاہی پر غالب ہو۔ سبزہ رنگ۔

گھوڑا یعنی خنگ۔

قانون۔ ایک قسم کا ساز۔

مزرع۔ کھیت۔ کھیتی باڑی کی جگہ۔

برنا۔ جوان۔

۱۔ اقبال فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موعود نائبِ حق ہماری ملّت میں سے پیدا ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ ہماری خاک کا سر آسمان پہ جا پہنچا کیونکہ وہ شہسوار جو خدا کا خلیفہ اور نائب ہوگا، اسی غبار سے نکلے گا یعنی ہم میں سے پیدا ہوگا۔

یہاں شعر کے دو نکتوں کی طرف سرسری اشارہ مناسب ہے۔ اوّل یہ کہ شہسوار گھوڑا دوڑاتا ہے تو گرد و غبار اڑتا ہے، گویا شہسوار کے ساتھ گرد و غبار لازم ہے۔ دوم یہاں "غبار" اس لیے موزوں ہے کہ پہلے مصرع میں "مشتِ خاک" موجود ہے۔

۲۔ ہماری آج کی راکھ میں وہ شعلہ سویا ہوا ہے، جو کل چمکے گا تو دنیا کے لیے روشنی کا سامان بہم پہنچا دے گا۔

مراد یہ ہے کہ اگرچہ آج ہم بالکل راکھ بن چکے ہیں اور ہم میں چلن، تپش اور حرارت بالکل معلوم نہیں ہوتی، لیکن ہم سے چونکہ نائبِ حق کا وعدہ ہو چکا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو شعلہ کل پورے عالم کو منور کرے گا، وہ ہماری آج کی خاکستر میں سویا ہوا ہے۔

۳۔ اگرچہ آج ہم ایک ننھی سی کلی ہیں لیکن اس کے دامن میں پورا باغ موجود ہے اور ہماری آنکھ آنے والی صبح کے نور سے روشن ہے۔

۴۔ نائبِ حق سے التجا کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے زمانے کے سبزہ رنگ گھوڑے کے شہسوار! اے آنے والی دنیا کی تقدیر کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے والے! اب آجا اور ہمیں انتظار میں نہ رکھ۔ تو دنیا کی آنکھ کا نور ہے، نمودار ہو جا۔

۵۔ یہ دنیا تباہ حال ہے۔ اس کے ہنگامے میں رونق پیدا کر دے اور ہماری آنکھوں میں بس جا۔

۶۔ قوموں نے ہر طرف باطل کا شور برپا کر رکھا ہے، تو اپنے ترانے کو کانوں کے لیے بہشت بنا دے اور قوموں کے شور کو خاموش کر دے۔

۷۔ اٹھ اور اخوت کا ساز چھیڑ۔ پھر سب میں محبت کی شراب کے پیالے تقسیم کر دے۔

۸۔ پھر دنیا میں صلح و امن کا دور آراستہ کر دے۔ جو آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں انھیں صلح کا پیغام دے دے۔

ان تین شعروں میں عمومیت بھی ہے اور خصوصیت بھی۔ خصوصیت یہ کہ جس زمانے میں

یہ شعر لکھے گئے تھے، پہلی عالمی جنگ بڑی خوفناک حالت میں جاری تھی اور اقبال اُس کُشت و خوں کو عالمِ انسانیّت کے لیے بہت بڑی مصیبت سمجھتے تھے۔

۹۔ اگر نوعِ انسانی کو کھیت فرض کر لیا جائے تو اے نائبِ حق! اُس کا حاصل تُو ہے۔ زندگی کے قافلے کی منزلِ مقصود بھی تیرے سوا کچھ نہیں۔

۱۰۔ خزاں کے ظلم سے درختوں کے پتّے جھڑ گئے ہیں، تو پھر بہار بن کر ہمارے باغ میں سے گزر۔

۱۱۔ ہمارے بچّے، جوان اور بوڑھے نذرِ عقیدت پیش کرنے کے لیے بیقرار ہیں، مگر اُن کی پیشانیاں اپنی موجودہ حالت پر شرمسار ہیں؛ تُو اُن شرمسار پیشانیوں کی نذرِ عقیدت قبول کر۔

۱۲۔ ہمارے لیے سرفرازی کا سامان یہ ہے کہ تُو ہم میں سے پیدا ہوگا۔ ہم اس انتظار میں ہیں کہ تُو نمودار ہو۔ بس اس امید پر ہم نے اُن مصیبتوں کو بھی گوارا سمجھ لیا جو آج ہمیں دنیا میں گھیرے ہوئے ہیں۔

گیارھواں باب

اسماءِ حضرت علیؓ

اسماءِ علی مرتضیٰؓ کے اسرار کی شرح

تمہید: جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اس باب میں حضرت علیؓ کے بعض اسماء کی شرح لکھی گئی ہے؛ جو اقبال کو تعلیمِ خودی کے سلسلے میں واضح طور پر موزوں معلوم ہوئے؛ چنانچہ سب سے پہلے اُن اسماء کے وہ اسرار بیان کیے گئے ہیں، جو اقبال کے خیال میں آئے۔ ممکن ہے اان کے لیے کوئی سند پیش کی جا سکے اور یقیناً بعض کے لیے کوئی سند موجود نہیں، تاہم وہ اسرار فلسفۂ خودی کے اعتبار سے بہت مناسب معلوم ہوتے ہیں اور اگر کوئی شخص اس تعبیر کو ہر لحاظ سے صحیح سمجھے تو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کیونکہ اس تعبیر کے خلاف کوئی مستند چیز موجود نہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اقبال نے حضرت علیؓ کے بعض اسماء یا القاب کے لیے شیعہ حضرات کی روایات بھی سامنے رکھ لیں۔ غالباً ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہوگا کہ مناقب کے سلسلے میں ہر چھوٹی بڑی چیز کی تحقیق اور چھان بین ضروری نہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ کسی دینی اصل سے تصادم کی نوبت نہ آئے۔ لہٰذا اُن مناقب پر کسی ایک فرقے کے نقطۂ نگاہ سے غور کرنا مناسب نہ ہوگا۔ شیعوں اور سُنّیوں میں جو روایتیں

بالعموم مسلّم مانی جاتی ہیں، اقبال نے ان میں سے جن جن کو پیش نظر مطالب کے لحاظ سے ضروری سمجھا ہے لیا۔

باقی رہے مطالب باب تو ان کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ ابتدا میں حضرت علیؓ کے مناقب بیان ہوئے ہیں اور ان کے بعض اسماء و القاب کی شرح کی گئی ہے۔ پھر اسی شرح کی روشنی میں مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے اندر قوت پیدا کریں کیونکہ نئے جہان کی تعمیر پایۂ تکمیل پر پہنچاتی ہے۔ جو مشکلات سدِ راہ ہوں، ان پر قابو پائیں۔ ناتوانی کو زندگی کا رہزن سمجھیں۔ یہ مختلف اخلاقی بھیس بدل کر انسانوں کو مسحور کرتی ہے اس سے آگاہ رہیں اور قوت حاصل کریں، جو صداقت کی ہمسر ہے۔ قوت ایسی چیز ہے جو باطل میں بھی حق کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ مسلمان کے سامنے اس دنیا میں بہت بڑا کام ہے۔ قدرت نے انسان کو جس امانت کا حامل بنایا تھا، اس کے واجبات ادا کرنے کے لیے بڑی جدّ و جہد کی ضرورت ہے، لہٰذا چاہیے کہ وہ زندگی کے بھیدوں سے آگاہ ہو اور غیر اللہ سے بالکل آنکھیں بند کر لے:

حضرت علیؓ کے مناقب | خیاباں۔ کیاری۔ چمن۔ پھلواڑی

بوتراب۔ مخففِ ابوتراب۔ لغوی معنی مٹی کا باپ۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم مسجد میں تشریف لائے تو حضرت علیؓ فرش پر سوئے ہوئے تھے اور آپ کا جسم فرش کے گرد و غبار سے بھرا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے یہ کیفیت دیکھ کر فرمایا: "اے ابوتراب اٹھ!" عربی کا قاعدہ ہے کہ کسی شخص میں وقتی طور پر جو کیفیت نمایاں ہوتی ہے، اسے "ابو" کے ساتھ نسبت دے دیتے ہیں۔ مٹی سے بھرے ہوئے جسم کے لیے "ابوتراب" کا خطاب بہت ہی موزوں اور لبریزِ محبت و شفقت تھا:

یداللہ۔ خدا کا ہاتھ۔

اُمّ الکتاب۔ سورۂ فاتحہ۔ قرآن مجید۔

۱۔ حضرت علیؓ پہلے مسلمان تھے اور مردانِ حق کے سردار تھے اور عشق کے لیے آپ کی ذات ایمان کا سرمایہ تھی۔

یہ مسلّم ہے کہ نوجوانوں میں سے ایمان لانے میں سبقت کا شرف حضرت علیؓ کو حاصل تھا اور اس حقیقت میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ شجاعت و مردانگی میں حضرت موصوف اپنی مثال آپ تھے، اسی لیے شیرِ مرداں کے لقب سے مشہور ہوئے۔ عشق سے مراد عشقِ حق ہے اور اس حقیقت سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ عشقِ حق کے لیے ایک ایسی مثال تھے، جسے دیکھ کر روحِ ایمان تازہ ہو:

۲۔ مجھے ان کے خاندان سے محبت ہے۔ یہی محبت میری زندگی کا سرمایہ ہے اور اسی کی برکت سے میں دنیا میں گوہر کی طرح چمک رہا ہوں:

۳- میں نرگس ہوں یعنی سراپا آنکھ ہوں اور نظارے کے لیے جستجو میں ہوں اور حضرت علیؓ کے چمن کی کیاری میں خوشبو کی طرح ادھر اُدھر اُڑا پھرتا ہوں۔

۴- میری مٹی سے اگر زمزم اُبل رہا ہے تو یہ حضرت علیؓ ہی کی برکت ہے۔ اگر میرے انگور کی بیل سے شراب ٹپک رہی ہے تو یہ بھی انھیں کی نوازش کا کرشمہ ہے۔

۵- میں مٹی ہوں، مگر حضرت علیؓ کی محبت نے مجھے آئینے کی طرح روشن اور شفاف بنا دیا ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ میرے سینے سے جو نوا اٹھ رہی ہے، وہ بھی جسم کی صفائی اور آئینہ وشی کے باعث صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

۶- حضرت علیؓ کی ذات گرامی کا وہ درجہ تھا کہ رسول اللہ صلعم ان کا چہرہ دیکھ کر فال لیا کرتے تھے۔ ہماری ملت کو جو شان و شوکت حاصل ہوئی، وہ انھیں سے لی گئی تھی۔

۷- حضرت علیؓ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اُس سے دین اسلام کو قوت حاصل ہوئی۔ دنیا کو انھیں کے خاندان سے قانون، آئین اور دستور ملا۔

۸- اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؐ نے حضرت علیؓ کو ابوتراب نام دیا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپ کو ید اللہ یعنی اپنا ہاتھ قرار دیا۔

دوسرا مصرع شیعی روایات پر مبنی ہے۔ اس کی یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ خالصۃً اللہ کے لیے جو کام کیا جائے، اس کا انتساب اللہ کی قوت سے بالکل حق بجانب ہے۔

شرح اسم ابوتراب | کرّاری- بار بار حملہ کرنا۔ کرّار حضرت علیؓ کا لقب تھا کیونکہ وہ میدان جنگ میں بار بار حملہ کرتے تھے۔

قسیم- تقسیم کرنے والا۔ بانٹنے والا۔

۱- جو شخص زندگی کے بھید جانتا ہے، اسے علم ہے کہ حضرت علیؓ کے ناموں میں کیا کیا اسرار ہیں، مثلاً سب سے پہلے بوتراب کو لیجیے اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

۲،۳،۴- وہ بے نور مٹی جس کا نام جسم ہے، عقل اس کے ظلم سے آہ و فریاد کر رہی ہے جس فکر کی پرواز آسمان تک ہے، اس جسم نے اسے جکڑ کر زمین ناپنے کا گز بنا رکھا ہے۔ آنکھیں اسی کی وجہ سے اندھی اور کان اسی کی وجہ سے بہرے ہو گئے۔

مراد یہ کہ مادیت نے حواس میں وہ جوہر باقی نہیں چھوڑا جو سب کچھ دیکھ سکتے، سن سکتے اور محسوس کر سکتے۔ اس جسم نے ہوس کی دو دھاری تلوار اٹھا رکھی ہے اور یہ ایسا خوفناک رہزن ہے جس کی وجہ سے راستہ چلنے والوں کے دل ٹوٹ گئے۔

۵- خدا کے شیر یعنی حضرت علیؓ نے اس مٹی کو، جس کا نام جسم ہے، تسخیر کر لیا۔ یہ مٹی بالکل بے نور تھی، لیکن اسے اکسیر بنا دیا۔

۶۔ حضرت علی مرتضیٰؓ وہ وجود مبارک ہیں جن کی تلوار سے حق و صداقت دنیا میں روشن ہوئے۔ انھوں نے جسم کی ولایت فتح کرلی، اسی وجہ سے ابوتراب لقب پایا۔

یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقبالؒ نے بوتراب سے وہ شخصیت مراد لی ہے جس نے اپنے جسم پر قابو پالیا، اسے مسخر کرلیا اور حق کا تابع بنا دیا۔ اس طرح ہوا و ہوس کی پیروی کی گنجائش نہ رہی اور وجود مبارک کلاً حق کے لیے وقف ہوگیا۔

۷۔ حضرت علیؓ کا ایک لقب کرّار بھی تھا۔ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے اندر کرّاری کے جوہر پیدا نہ کرے، یعنی اس کے عزم میں استواری اور عمل میں استقلال و استقامت کمال پر نہ پہنچ جائے، اُس وقت تک سلطنتیں فتح نہیں کر سکتا، یہی کرّاری اُس کی خودداری کی دلیل ہے اور خودداری ہی کی برکت سے اُس کے گوہر کی آبرو قائم ہے۔

۸۔ جو وجود اس دنیا میں اپنے جسم اور ہوا و ہوس پر قابو پالیتا ہے اور اس طرح بوتراب کے لقب کا حق دار بن جاتا ہے، وہ چاہے تو مغرب سے سورج کو لوٹا سکتا ہے۔

دوسرے مصرع میں رجعتِ خورشید کی طرف اشارہ ہے اور معلوم ہے کہ حضرت علیؓ سے ایسی کرامت منسوب کی جاتی ہے۔

۹۔ جس نے اپنے جسم کے گھوڑے پر زین کس لیا، وہ نگین کی طرح سلطنت کی انگشتری میں پیوست ہوگیا یعنی سلطنت کا مالک بن گیا۔

۱۰۔ خیبر کی شان و شوکت اِس دنیا میں اُس کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے۔ اگلی دنیا میں اللہ تعالیٰ اسے حوضِ کوثر کا ساقی بنا دیتا ہے تاکہ خیر کثیر کے اس سرچشمے سے پیالے بھر بھر کر لوگوں کو پلاتا چلا جائے۔

۱۱۔ وہ اپنی ذات کو پہچانتا ہے، اس لیے خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ خدا کا ہاتھ بن جانے سے اسے شہنشاہی مل جاتی ہے۔

۱۲۔ اس کی ذات علوم کے شہر کا دروازہ بن جاتی ہے۔ حجاز، چین، روم سب اس کے زیر فرمان آجاتے ہیں۔

اس شعر کے پہلے مصرع میں اُس مشہور روایت کی طرف اشارہ ہے کہ انا مدینۃ العلم و علی بابہا۔ یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔ کہا جاتا ہے، یہ حدیث ہے لیکن محققین اسے تسلیم نہیں کرتے۔

۱۳۔ مردانگی اور حق پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے جسم پر حکمران بنے یعنی اسے قابو میں لائے۔ اس کے بغیر وہ اپنے انگور کی بیل سے مصفّا اور روشن شراب نہیں پی سکتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس میں جو جوہر ودیعت کیے ہیں، ان کی برکتوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

دعوتِ عمل | پروانگی ۔ پروانے کا طریقہ، راستہ، مسلک، مشرب۔

اب ۔ ابو کا مخفف ۔ باپ۔

ناہنجار ۔ ہنجار کے معنی راستہ، طرز، روش۔ ناہنجار بے راہ، جس کا کوئی راستہ نہ ہو۔ کج رو۔

خلّاق ۔ پیدا کرنے والا۔ بہ صیغۂ مبالغہ۔

نامساعد ۔ ناموافق ۔ ناسازگار۔

۱ ۔ جل کر خاک ہو جانا پروانے کا طریقہ ہے۔ خاک کا باپ بن یعنی اسے فتح کر، اس پر قابو پا ۔ مردانگی کا شیوہ یہی ہے۔

۲ ۔ تیرا بدن پھول کی طرح نرم و نازک ہے۔ یہ نرمی اور نزاکت تیرے کس کام آئے گی؟ اپنے اندر سختی پیدا کر کے پتھر کی شکل اختیار کر تاکہ تو دیوارِ چمن کی بنیاد بن سکے یعنی پورے باغ کی حفاظت کا فرض انجام دے سکے:

۳ ۔ اپنی مٹی سے ایک نیا آدم پیدا کر۔ پھر اُس آدم کے لیے ایک نئے جہان کی بنیاد رکھ:

۴ ۔ اگر تُو خود دیوار و در نہ بنائے گا اور اپنی مٹی سے مفید تعمیر کا کام نہ لے گا تو ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا آ کر تیری بیکار پڑی ہوئی مٹی سے اپنی تعمیر کے لیے اینٹیں بنانے لگے گا۔

۵، ۶، ۷ ۔ بے شبہہ تُو بے راہ اور کج رو آسمان کے جور و ستم سے تنگ ہے اور تیرا پیالہ پتھر کے ظلم کا فریادی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ تو کب تک نالہ و فریاد اور ماتم کرتا رہے گا؟ کب تک شب و روز سینہ پیٹتا جائے گا؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ زندگی کا مضمون عمل میں چھپا ہوا ہے یعنی زندگی عمل، جدّ و جہد اور سعی و کوشش پر موقوف ہے۔ زندگی کا قانون یہ ہے کہ انسان میں نئی چیزیں پیدا کرنے کا ذوق ہر وقت مصروفِ کار رہے:

۸ ۔ اٹھ اور نیا جہان پیدا کر لے۔ آگ آغوش میں لے لے اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح نعرۂ حق لگا:

۹ ۔ جو دنیا ناسازگار اور ناموافق ہے، اُس سے موافقت پیدا کرنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ انسان میدان میں ہار قبول کرے۔

۱۰ ۔ جو خود دار انسان عمل میں یگانہ اور استوار ہو، زمانہ خود اس کے مزاج سے موافقت پیدا کرنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے:

۱۱ ۔ اگر زمانہ موافقت پر آمادہ نہ ہو تو خود دار اور پختہ کار آدمی آسمان سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے:

۱۲ ۔ اس لڑائی میں وہ کیا کرتا ہے؟ جو نظام اُس کے سامنے ہوتا ہے، اُسے بیخ و بُن سے اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ پھر مختلف ٹکڑوں، ریزوں اور ذرّوں کو نئے سرے سے آراستہ کرتا ہے اور انھیں نئی ترکیب دے دیتا ہے۔

۱۳ ۔ بے ہمّت لوگ زمانے کی گردش کا شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ مردِ خود دار گردش کو درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ نیلے آسمان ہی کو باقی نہیں چھوڑتا جس سے گردش پیدا ہوتی ہے:

۱۴ ۔ وہ اپنے زورِ عمل سے ایک نیا زمانہ وجود میں لے آتا ہے جو اُس سے پوری موافقت کے لیے تیار ہو۔

۱۵- مرد خود دار کا اصولِ عمل کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ اگر دنیا میں جوانمردوں کی طرح زندہ نہیں رہ سکتے تو جوانمردوں کی طرح جان دے دینے ہی کو زندگی سمجھنا چاہیے۔

۱۶- جس وجود کے پہلو میں قلب سلیم ہو، وہ بڑی بڑی مہموں پر خوش ہوتا ہے کیونکہ اُسے اپنا زور آزمانے کا موقع ملتا ہے

۱۷- حق یہ ہے کہ مشکلات کے تلاطم اور مہمات کے ہجوم ہی میں زندگی بسر کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ہی زندگی کے لیے دل میں تڑپ ہونی چاہیے۔ حضرت ابراہیمؑ کی مثال سامنے لاؤ۔ انھوں نے شعلوں سے پھول چنے انھیں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔

۱۸- عام لوگ مشکلات سے گھبراتے ہیں، لیکن جو لوگ میدان کے مرد ہیں، وہ مشکلات کو پیار کرتے ہیں کیونکہ مشکلات ہی میں ان کے زور و قوت کی ممکنات عمل میں نمایاں ہوتی ہیں۔

۱۹- جو لوگ ہمت سے عاری ہیں، ان کے پاس کینے کے سوا کوئی ہتھیار نہیں۔ ان کی زندگی کا دستور یہی ہے:

قوت اور ناتوانی | مذلت - ذلت - رسوائی۔

مکارم - مکرمت کی جمع - نوازشیں - مہربانیاں۔

ذمائم - ذمیمہ کی جمع - برائیاں

حربا - گرگٹ جو ہر گھڑی رنگ بدلتا رہتا ہے۔

بُطلان - باطل ہونا - ضائع ہونا۔

آدابِ امانت - اشارہ سورۂ احزاب کی اس آیت کی طرف ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا۔

(ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کی۔ پس اس کے اٹھانے سے انھوں نے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے اٹھا لیا، البتہ وہ بڑا ظالم، جاہل تھا۔

ایک گروہ کی رائے ہے کہ امانت سے مقصود خدا کے مقررہ قانون کی پابندی ہے آسمانوں زمین، پہاڑوں نے اس مقررہ قانون سے سرتابی نہ کی اور ایسے کرتے ہوئے انھیں ڈر لگا۔ انسان نے خدا کے مقررہ قانون کا خیال نہ رکھا اور اس سے منحرف بھی ہوتا رہا؛ لہٰذا وہ ظالم و جاہل تھا۔

۱- زندگی ایک بڑی قوت ہے اور اس کا سرچشمہ یہ ہے کہ انسان میں غلبہ پانے اور برتر ہونے کا ذوق ہو۔

یعنی جب تک دل میں بڑے کارنامے انجام دینے اور ہر مشکل سے پنجہ آزما ہونے کی تڑپ موجود نہ ہوگی قوت کہاں سے آئے گی؟ قوت ہوگی تو اس کی بیداری کا ذریعہ کیا ہوگا؟

۲- بے محل معافی اور چشم پوشی سے زندگی کا خون ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور اس سے زندگی کے شعر میں سکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔

۳- جو فرد ذلت کی گہرائی میں پڑا رہتا ہے، وہ اپنی کمزوری اور ناتوانی کو صبر و قناعت کا نام دے دیتا ہے۔

۴- حالانکہ کمزوری اور ناتوانی زندگی کے راستے کی قزاق اور رہزن ہے اور اس کے بطن سے ڈر اور جھوٹ پیدا ہوتے ہیں۔

مطلب یہ کہ جو وجود کمزور ہوگا، وہ سب سے ڈرے گا اور جب اسے کوئی نازک موقع پیش آئے گا تو جھوٹ بول کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

۵- کمزوری اور ناتوانی کا باطن اچھائیوں سے بالکل خالی ہوتا ہے اور اس کے دودھ سے برائیاں پرورش پاکر موٹی ہوتی ہیں۔

۶- اے عقلِ سلیم رکھنے والے! خبردار رہ۔ ناتوانی اور کمزوری دشمن ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ گھات میں بیٹھ کر زک پہنچاتی ہے

۷- اگر تو عقل مند ہے تو اس کا فریب کبھی نہ کھا۔ یہ گرگٹ کی طرح ہر گھڑی رنگ بدلتی رہتی ہے۔

۸- اہلِ نظر نے کمزوری اور ناتوانی کی اصل صورت نہیں دیکھی۔ اس کے چہرے پر رنگ رنگ کے پردے ڈال دیے۔

۹- کبھی تو وہ رحم اور نرمی کی نقاب اوڑھتی ہے اور کبھی اپنے آپ کو انکسار کی چادر میں لپیٹ لیتی ہے۔

۱۰- کبھی مجبوری کے پردے میں چھپ جاتی ہے، کبھی معذوری کی اوٹ میں کھڑی ہو جاتی ہے۔

۱۱- پھر تن آسانی اور آرام و راحت کی شکل اختیار کرکے قوت والے وجود کے ہاتھ سے دل چھین لیتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں رحم، نرمی، عاجزی، مجبوری، معذوری اور تن آسانی یہ سب کمزوری کے پردے ہیں۔ قوت ایسی کسی چیز کی روادار نہیں ہو سکتی۔ ناتوانی کے بطن سے ڈر اور جھوٹ پیدا ہوتے ہیں۔

۱۲- لیکن قوت اور توانائی سچائی کی جڑواں ہے۔ اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو یہی جمشید کا پیالہ ہے۔

۱۳- اگر زندگی کو کھیت فرض کر لیا جائے تو اس کی پیداوار قوت ہے۔ حق و باطل دونوں کی رمز کی شرح قوت کے سوا کچھ نہیں۔

مطلب یہ کہ باطل کو جو شے مستحکم اور پائدار کرتی ہے، وہ قوت کے سوا کچھ نہیں۔ اگر قوت نہ ہو تو چند لمحوں کے لیے بھی وہ باقی نہ رہ سکے۔ اسی طرح حق بھی قوت کے بغیر نہ آگے بڑھ سکتا ہے، نہ پھیل سکتا ہے، نہ اس کا وقار قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس کے قوانین نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ حق قوت کے بغیر بھی دلکش اور دلپذیر ہوتا ہے اور اس سے مخلوق کو مادی اور روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ باطل ان تمام جوہروں سے عاری ہوتا ہے اور اسے صرف قوت قائم رکھتی ہے۔

۱۴- اگر کوئی مدعی قوت کا مالک ہو تو جو دعویٰ اُس کی زبان پر آ جائے، اُس کے لیے کسی دلیل یا ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ محض اس کے طاقتور ہونے کی بنا پر دعویٰ مان لیا جاتا ہے۔

اس کی مثالیں زندگی کے ہر دائرے میں ملتی ہیں۔ سامراج کی پوری سرگزشت اسی کا عملی مرقع ہے۔

طاقتوروں نے جو کچھ چاہا، کمزوروں سے منوایا اور کبھی پروا نہ کی کہ ان کا اقدام جائز ہے یا ناجائز۔

۱۵- باطل کے پاس قوت ہو تو وہ اپنے اندر ویسی ہی شان پیدا کر لیتا ہے، جیسی حق کو بغیر قوت کے حاصل ہوتی ہے۔ حق اس کے سامنے ناطاقتی کے باعث ٹھہر نہیں سکتا، لہٰذا باطل سمجھ لیتا ہے کہ چلا جانا ہی اس کے ناحق ہونے کی دلیل ہے اور حق میں ہوں۔

۱۶- باطل قوت کے بل پر جب حکم دے دیتا ہے تو اس کے حکم کے مطابق زہر کوثر بن جاتا ہے۔ وہ خیر کو شر، کو بدی قرار دے دیتا ہے تو سب اُسے بدی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کی مثالیں بھی ہمیں ہر روز ملتی ہیں اور شیخ سعدی کا یہ مشہور شعر تو دہرائے جانے کا محتاج نہیں کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

یعنی اگر بادشاہ دن کو رات کہہ دے تو فوراً پکار اُٹھو کہ ہاں صاحب بجا فرمایا وہ دیکھیے چاند نکل آیا اور ثریا کا جھرمٹ بھی نمودار ہو گیا۔ گویا صاحب قوت کی ہر غلط چیز کو درست قرار دینا بھی اہل حکمت و موعظت کے نزدیک عین مقتضائے مصلحت تھا۔

۱۷- لیکن یہ سب چیزیں غلط ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اے انسان! تُو نے جو بارِ امانت اٹھا رکھا ہے، اسے منزل پر پہنچانے کے قاعدے اور ضابطے ہیں، ان سے بے خبر نہ ہو۔ ان کے لیے صحیح صلاحیت پیدا کر۔ وہ اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اپنی ذات کو دونوں جہانوں سے بہتر سمجھ، یعنی تو اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کیں، تجھے اُن سے بلند تر درجہ عطا کیا۔ اس حقیقت سے غافل نہ ہو۔

۱۸- زندگی کے اسرار سے واقفیت حاصل کر۔ ان کا تقاضا یہی ہے کہ خدا کے سوا جو کچھ ہے، اس سے ظالم و جاہل ہو جا اور اپنے آپ کو صرف خدا کے کاموں کے لیے وقف کر دے۔

۱۹- اے عقلمند! اپنی آنکھ، کان اور لب کھول۔ ان سے صحیح کام لے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں جو صلاحیتیں رکھی ہیں، ان سے فائدہ اُٹھا۔ اگر اس کے باوجود تجھ پر سچائی کا راستہ آشکارا نہ ہو تو میری اس نصیحت کی ہنسی اڑا دینا۔

مراد یہ ہے کہ حصولِ علم کا ذریعہ یا تو بصارت ہے یا سماعت۔ اس کے بعد اس علم کو دنیا تک پہنچانے کے لیے گفتار کی ضرورت ہے جو لب کشائی پر موقوف ہے۔ یہی راہِ حق ہے۔

بارھواں باب

شیخ ہجویرہ اور نوجوانِ مرو

(مرو کے ایک نوجوان کی حکایت جو حضرت علی ہجویریؒ کے پاس آیا اور دشمنوں کے ظلم و جور کا فریادی ہوا)

شیخ علی ہجویری | اقبالؔ خودی کے متعلق جو حقائق بیان کر چکے ہیں، اب مختلف حکایتوں کے ذریعے سے ان کی مزید توضیح و تشریح کرتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

شرحِ راز از داستانہا می کنم
غنچہ از زورِ نفس وا می کنم

ان میں سے پہلی حکایت یہی ہے:

ہجویرہ۔ غزنی کا ایک محلہ تھا۔ سیّد علی معروف بہ داتا گنج بخشؒ اسی محلے میں رہتے تھے۔ وہیں سے نکل کر تبلیغِ اسلام کی غرض سے لاہور تشریف لے آئے۔ انھیں سیّد ہجویر یا شیخ ہجویر بھی کہا جاتا ہے۔

مرقد۔ لغوی معنی سونے کی جگہ۔ مجازاً آخری آرام گاہ۔ قبر۔

پیرِ سنجر۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔ یہاں یہ عرض کر دینا چاہیے کہ خواجہ مغفور اس علاقے کے رہنے والے تھے، جسے عرب سجستان کہتے تھے۔ وہاں کے باشندے سجزی (س۔ ج۔ ز۔ ی) کہلاتے تھے۔ عام خیال یہ ہے کہ لوگوں نے سجزی کو غلطی سے سنجری پڑھ لیا، جیسا کہ مشہور شاعر خواجہ حسن سجزی کے تعلق میں پیش آیا۔ بعض اصحاب کے نزدیک سنجر ایک مقام تھا جس سے حضرت خواجہ معین الدین کو تعلق تھا۔

طیّار۔ اڑنے والا، بہ صیغۂ مبالغہ یعنی بہت تیز رفتار۔

۱۔ ہجویرہ کے سیّد یعنی حضرت داتا گنج بخشؒ قوموں اور جمعیتوں کے مخدوم ہیں۔ اُن کے مزار کو بہت بلند رتبہ حاصل ہے۔ خواجہ معین الدینؒ اجمیری جیسے جلیل القدر بزرگ نے اس مزار پہ چلّہ کشی کی۔

۲۔ وہ پہاڑی علاقے کے رہنے والے تھے، لیکن اُس تعلق کا رشتہ بے تکلف توڑ کر اس میدانی ملک میں آ گئے اور یہاں سجدے کا بیج بویا یعنی اسلام کی تبلیغ کی۔ لوگوں کو راہِ حق دکھائی اور انھیں خدائے واحد کی عبادت کا خوگر بنایا۔

۳۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی برکت سے ہمارے ہاں وہی دور تازہ ہو گیا جو حضرت فاروقِ اعظمؓ کے عہد میں اُس وقت

کی اسلامی دنیا میں موجود تھا اور ان کے ارشادات سے دینِ حق کا شہرہ عام ہوگیا۔

۴۔ حضرت موصوف قرآن مجید کی عزت و حرمت کے نگہبان تھے۔ ان کی خدا پرست نگاہیں جہاں جہاں پڑیں، باطل کے گھروندے ویران ہوتے گئے۔

۵۔ پنجاب کی سرزمین ان کے دم سے زندہ ہوگئی۔ ہماری صبح کی پیشانی کو ان کے آفتاب کی جلوہ گری نے چمکا دیا۔

مراد یہ ہے کہ وہ تشریف لائے۔ یہاں اسلامی تبلیغ و تربیت کا انتظام فرمایا اور لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ پنجاب کی زندگی کا نظارہ تھا۔ اس وقت اسلام نیا نیا یہاں پہنچا تھا۔ گویا اُس کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ اس صبح کے لیے روشنی کا انتظام حضرت داتا گنج بخشؒ ہی کے آفتاب ہدایت نے کیا۔

۶۔ وہ خود حق اور دینِ حق کے عاشق تھے۔ ساتھ ہی اس عشق کے نہایت تیز رفتار قاصد تھے۔ اُن کی روشن پیشانی سے عشق کے بھید دنیا کے سامنے بے نقاب ہوئے۔

مراد یہ ہے کہ وہ خود بھی بہت بڑے بزرگ و ولی تھے اور اسی ولایت و بزرگی کا پیغام اُن کی برکت سے جگہ جگہ پہنچا۔ اس طرح عشقِ حق کے چشمے جا بجا ابلنے لگے۔

۷۔ میں حضرت ممدوح کے کمال کی ایک داستان سناتا ہوں اور باغ کو کلی کے اندر چھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت کے پورے کمالات بیان نہیں ہو سکتے۔ اگر انھیں ایک بہت بڑا باغ فرض کر لیا جائے تو میں جو کچھ سنا رہا ہوں، یہ اُس باغ کی ایک کلی ہے، جو پورے باغ کی بہار اور رنگ و بو کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔

نوجوان مروی کی درخواست | مرو۔ ترکستان کا مشہور شہر۔
محصور۔ گھرا ہوا۔

۱۔ مرو سے ایک نوجوان لاہور آیا، جس کا قد سروِ سہی کی طرح بلند تھا۔

۲۔ وہ خاص غرض سے سیدِ ہجویر یعنی حضرت داتا گنج بخشؒ کی خدمت میں پہنچا، جن کی بارگاہ بہت اونچی ہے۔ غرض یہ تھی کہ اُس کے دل و دماغ پر جو تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں، انھیں حضرت کے سورج کی روشنی زائل کر دے۔

۳۔ حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت! میں دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا ہوں۔ میری مثال وہی ہے، جیسے پتھروں کے حلقے میں صراحی رکھ دی جائے، جو ہلکی سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

۴۔ اے آسمان جیسے رتبے والے سیدا! مجھے یہ سکھا دیجیے کہ دشمنوں کے درمیان کامیاب زندگی بسر کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

شیخ کے ارشادات ۱۔ داتا گنج بخشؒ حقیقت شناس بزرگ تھے اور ان کی ذات میں جلال و جمال دونوں جمع ہو گئے تھے۔

یعنی ایسے اوصاف بھی تھے، جن میں دبدبہ، رعب، ہیبت اور غلبہ نمایاں تھا اور ایسے اوصاف بھی تھے، جن میں محبت، لطف و مروت، نرمی اور ملایمت نمایاں تھی۔ اہلِ حق کی شان یہی ہوتی ہے۔ وہ دعوتِ حق میں سراپا جمال ہوتے ہیں، لیکن جب حق کی مزاحمت کے باعث مقابلے کی نوبت آجائے تو سراپا جلال بن جاتے ہیں۔

۲۔ حضرت نے فرمایا: اے نوجوان! تُو زندگی کے بھید سے آگاہ نہیں۔ تُو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا آغاز کیا ہے اور انجام کیا؟

۳۔ تُو غیروں کا وسوسہ دل سے نکال دے۔ غیروں کا خوف اسی وقت دل میں راہ پاتا ہے جب انسان کی فطری قوت سوئی ہوئی ہو۔ وہ قوت جاگ اُٹھے تو کسی کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟ تجھے اللہ تعالیٰ نے جو فطری قوت عطا کی تھی، وہ سو گئی ہے۔ تُو اسے بیدار کر اور خود بیدار ہو۔

۴۔ دیکھو، جب پتھر اپنے آپ کو شیشہ سمجھ لیتا ہے تو شیشہ بن جاتا ہے اور اس کے لیے ٹوٹ پھوٹ کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہتا۔

۵۔ اگر مسافر اپنے آپ کو کمزور اور بے طاقت سمجھے تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ رہزن اُس کی جان لے کر رہے گا۔

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ بے سرو سامان آدمی اُٹھے اور عزم و ہمت کی برکت سے انھوں نے ایسے کارنامے انجام دیے جن سے ایوانِ تاریخ ہمیشہ گونجتا رہے گا اور ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں کہ بڑے بڑے لاؤ لشکر اور ساز و سامان والے بظاہر کم لشکر والوں کے مقابلے میں بھی کچھ نہ کر سکے۔ ان مثالوں سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو کمزور سمجھ لیں، وہ نامراد رہتے ہیں اور جو عزم و ہمت کو مدار کار بنا لیں، وہ کامرانی کے حق کو سینے سے لگا کر رہتے ہیں۔

۶۔ تُو کب تک اپنے آپ کو پانی، مٹی اور آب و گل کا پیکر سمجھتا رہے گا؟ اُٹھ اور اپنی مٹی سے طور کا شعلہ پیدا کر۔

مطلب یہ ہے کہ آب و گل کا پیکر سب کو ملا ہے، لیکن جو اہلِ عزم و ہمت تھے، انھوں نے اسی مٹی سے وہ آگ پیدا کی جو ان کے تمام مخالفوں کو بھسم کر گئی۔ مٹی سے شعلۂ طور پیدا کرنے کے معنی یہی ہیں کہ عزم و ہمت کا صحیح ولولہ پیدا کیا جائے۔

۷۔ عزیزوں سے خفا رہنے کی وجہ کون سی ہے اور دشمنوں کی شکایتیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہیں؟

۸۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر حقیقتِ حال پر نظر ہو تو دشمن بھی تیرا دوست ہے کیونکہ اس کا وجود تیرے بازار کے لیے رونق اور گرمی کا سرچشمہ ہے۔

مراد یہ ہے کہ دشمن نہ ہو تو انسان کو ذہنی قوتوں کے اندازے اور آزمائش کا موقع نہیں ملتا اور وہ قوتیں عمل میں نہیں آتیں، اس لیے افسردہ ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے دشمن کو دوست قرار دیا کہ وہ قوت کی آزمائش کے موقعے بہم پہنچاتا ہے۔ اس طرح عمل میں گرمی اور ہنگامہ پیدا ہو جاتا ہے۔

دعوتِ خودی | ۱۔ خواجہ خضرؑ کے ارشادات ختم ہوئے اور شاعر نے اپنی دعوت کا سلسلہ شروع کر دیا فرماتے ہیں:

جو شخص خودی کے مقامات سے آگاہ ہے اور ان کی حقیقت سمجھتا ہے، اُس کا نقطۂ نگاہ دوسروں سے بالکل مختلف ہوگا۔ مثلاً اگر اسے طاقتور دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو اسے اپنے لیے اللہ کا فضل قرار دے گا۔

۲۔ دشمن انسان کی کھیتی کے لیے بادل کا حکم رکھتا ہے، جس پر کھیت کی آبیاری موقوف ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دشمن سے مقابلہ آ پڑے تو انسان کی تمام سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو جوہر اس کی فطرت میں رکھے ہیں وہ تمام بروئے کار آ جاتے ہیں۔

یہ حقیقت محتاجِ تشریح نہیں کہ بادل برستا ہے تو زمین کی پوری قوتِ نمو سبزے کی شکل میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی کیفیت دشمن کی ہے کہ اس کا عزمِ مقابلہ انسان کی تمام قوتوں کو حرکت و عمل میں لے آتا ہے۔

۳۔ اگر ہمت پختہ اور استوار ہو تو راستے میں جو پتھر رکاوٹ بن جاتا ہے وہ بھی پانی بن کر بہہ نکلے گا۔ پہاڑوں سے اترنے والے سیل کی مثال سامنے لاؤ۔ اسے راستے کی پستی یا بلندی کب روک سکتی ہے؟ اس کا جوش اور زور ہر رکاوٹ کو پامال کرتا ہوا نکل جاتا ہے۔

۴۔ راستے میں جو پتھر رکاوٹ بن جاتا ہے، وہ اصل میں عزم و ہمت کی تلوار کے لیے سان کا کام دیتا ہے، جس سے تلوار کی دھار اَور تیز ہو جاتی ہے۔ انسان جو منزل طے کر لیتا ہے، وہ اصل میں عزم کی آزمائش ہوتی ہے۔

۵۔ حیوانوں کی طرح کھا پی کر سو رہنے سے کیا فائدہ؟ اگر تُو اپنے آپ کو مضبوط و مستحکم نہیں بنا سکا تو تیرے وجود سے کیا حاصل ہے؟ اس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہے۔

۶۔ اگر تُو اپنے آپ کو خودی کی بدولت مضبوط و استوار کرے گا تو تجھ میں بے پناہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ چاہے گا تو اس دنیا کو بھی تہ و بالا کر ڈالے گا۔

۷۔ اگر تجھے فنا ہو جانا یا مٹ جانا پسند ہے تو اپنی خودی سے بے تعلق ہو جا اور اگر تُو زندگی چاہتا ہے تو اپنی خودی کی آبادی کا سر و سامان کر، گویا فنا و بقا خود تجھ پر موقوف ہے۔

۸۔ کیا تُو جانتا ہے کہ مر جانے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ انسان خودی سے غافل ہو جائے۔ تو کیا سمجھتا ہے؟ یہ کہ مرنا بدن سے جان کے الگ ہو جانے کا نام ہے؟ اصل مرگ یہ ہے کہ انسان خودی سے بیگانہ ہو جائے۔

۹۔ حضرت یوسفؑ کی مثال سامنے لا اور خودی کو جائے قیام بنا لے۔ اس طرح تُو قید خانے سے اٹھ کر تختِ شاہی پر پہنچ جائے گا۔

حضرت یوسفؑ کو بھائیوں نے ایک خاص منصوبے کے تحت گھر سے نکال کر کنوئیں میں ڈال دیا۔

پھر ایک قافلے کے ہاتھ فروخت کر دیا جو تجارتی سامان مصر لے جا رہا تھا۔ گویا گھر سے علٰحدگی کی زندگی ایسے حالات میں شروع ہوئی کہ وہ والدِ ماجد تک کوئی پیغام بھی نہ پہنچا سکے۔ مصر میں پہنچتے ہی انھیں حسنِ عمل اور خوش سیرتی کی بنا پر عزت کا اونچا مقام مل گیا۔ پھر عزیزِ مصر کی بیوی نے ایک خوفناک آزمائش پیدا کر دی۔ حضرت یوسفؑ اس سے بھی کامیاب نکل گئے اور قید خانہ قبول کر لیا۔ مگر اپنی سیرت کے اُجلے دامن پر خفیف سا دھبّا بھی گوارا نہ کیا۔ قید خانے میں پہنچ کر بھی دعوتِ حق کا فرض انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ بادشاہ نے خود انھیں قید سے نکال کر ملکی انتظام کا ذمہ دار بنا دیا۔ یہ حُسنِ عمل، یہ فرشتہ سیرتی اور اخلاق و کردار کی یہ پاکیزگی اقبالؔ کی اصطلاح میں خودی تھی، جس میں اُن کی فطرت کے تمام درخشاں جواہر نمایاں ہوئے اور اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اقبال و اقتدار کے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔

۱۰۔ تُو خودی میں غوطہ لگا اور صاحبِ عزم و ہمّت بن جا۔ تیری ہر قوت حق کے لیے وقف ہونی چاہیے۔ زندگی کے بھید خود بخود تجھ پر آشکارا ہو جائیں گے۔

۱۱۔ میرے سینے میں جو راز ہے، اس کی شرح کہانیوں کے ذریعے سے کروں گا، یعنی پھونکوں کے دم سے کلی کو پھول بناؤں گا۔

کلی کے کھلنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ نسیم کا جھونکا آئے اور وہ کھل جائے۔ دوسری یہ کہ انسان پھونکیں مارے اور اس کی پنکھڑیاں الگ الگ ہو جائیں۔ اس طرح اُس کا منہ کھل جائے گا۔ فرماتے ہیں کہ میں دوسری صورت سے کام لے رہا ہوں۔

۱۲۔ یہاں مولانا رومؒ کا مشہور شعر نقل کر دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ دلبروں کے بھید دوسروں کی کہانیوں کے ذریعے سے بیان کیے جائیں تو بہت دلکش و دلآویز بن جاتے ہیں۔

تیرھواں باب

پیاسے پرندے کی حکایت

اس پرندے کی کہانی، جسے پیاس نے بیقرار کر رکھا تھا۔

پرندہ اور الماس | مایہ اندوز — سرمایہ جمع کرنے والا۔

۱۔ ایک پرندہ پیاس سے اتنا بیقرار ہو رہا تھا کہ سانس اُس کے سینے میں دھوئیں کی لہر بن گیا تھا۔

مراد یہ ہے کہ پیاس نے پرندے کے سینے میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ اس بنا پر سانس کو دھوئیں کی موج کہا۔

۲۔ اس نے باغ میں الماس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا۔ پیاس نے ایسی کیفیت طاری کر رکھی تھی کہ وہ ٹکڑا اسے پانی کا قطرہ نظر آیا۔

۳۔ جو ٹکڑا سورج کی کرنوں سے جگمگا رہا تھا، احمق پرندے نے ایسے دھوکا کھایا کہ پتھر کے اُس ریزے کو پانی کا قطرہ سمجھ لیا۔

۴۔ پرندے نے الماس کے ٹکڑے پر چونچ ماری، لیکن اس کا حلق تر نہ ہُوا۔ ظاہر ہے کہ وہ الماس سے نمی کیونکر حاصل کر سکتا تھا۔

۵۔ الماس نے کہا، اے ہوَس کے قیدی! کتنی احمقانہ حرکت ہے کہ مجھے چونچ کی تیزی کا نشانہ بنا لیا!

۶۔ میں پانی کا قطرہ نہیں۔ دوسروں کے حلق تر کرنا میرا کام نہیں۔ میں اس لیے زندہ نہیں کہ دوسرے مجھے ہضم کر جائیں۔

۷۔ مجھے دُکھ دینے کا قصد کرتا ہے؟ کیا تو پاگل ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے والی زندگی کیسی ہوتی ہے؟

۸۔ مجھ میں جو آب و تاب اور چمک دمک ہے، وہ تو پرندوں کی چونچیں توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اگر آدمی مجھے کھا جائے تو اس کا گوہرِ جان ریزہ ریزہ ہو جائے گا یعنی وہ مر جائے گا۔

پرندہ اور شبنم | ۱۔ الماس سے پرندے کا دلی مقصد حاصل نہ ہُوا۔ اور اُسے چمکنے والے ٹکڑے سے منہ پھیر لینے پر مجبور ہُوا۔

۲۔ اُس کا سینہ حسرت سے بھر گیا اور گیتوں نے اس کے گلے میں فریاد کی صورت اختیار کر لی۔

۳۔ پھولوں کی ایک شاخ پر شبنم کا قطرہ بلبل کے آنسو کی طرح دمک رہا تھا۔

۴۔ اُس کی چمک دمک سورج کی کرنوں کے باعث تھی، چنانچہ وہ سورج کا شکریہ ادا کرنے میں محو تھا۔

ساتھ ہی سورج کے خوف سے اُس کا بدن کانپ رہا تھا۔

۵۔ سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک تارا تھا، جس کی فطرت ہی نقل و حرکت تھی۔ آسمان پر پیدا ہُوا اور اپنی نمود کی لذت میں دم بھر کے لیے ٹھہر گیا۔

۶۔ اُس نے پھولوں اور کلیوں سے سینکڑوں فریب کھائے زندگی سے اُسے کوئی حصہ نہ ملا۔

۷۔ اُس کی صورت ایسی تھی، جیسے دل ہارے ہوئے عاشق کا آنسو ہو۔ آنسو بھی ایسا جو آنکھ سے نکل کر مژہ پر پہنچ چکا ہو اور ٹپکنے ہی والا ہو۔

۸۔ پیاس سے بیتاب پرندہ پھول کی شاخ کے نیچے پہنچ گیا۔ شبنم کا قطرہ اس کے حلق میں ٹپک پڑا۔

سبق | ایجاب۔ اِثبات۔

۱۔ پیاسے پرندے کی حکایت بیان کرنے کے بعد اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ اے مخاطب! اگر تُو دشمن کے ہاتھ سے بچ نکلنا چاہتا ہے تو میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تُو پانی کا قطرہ ہے یا الماس کا ٹکڑا؟

۲۔ پرندہ پیاس کی شدت سے گھُلا جا رہا تھا۔ اُس نے دوسرے کی زندگی کو اپنے بچاؤ کا ذریعہ بنا لیا۔

۳۔ پانی کا قطرہ نہ تو جسم کا سخت تھا اور نہ اُس کی فطرت الماس کی سی تھی۔ الماس میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں، قطرہ دونوں سے خالی تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قطرہ ختم ہو گیا اور الماس کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔

۴۔ شاعر کہتا ہے۔ تُو بھی اپنی خوشی سے دم بھر کے لیے غافل نہ ہو۔ الماس کا ٹکڑا بن شبنم کا قطرہ نہ بن۔

۵۔ پہاڑ کی طرح فطرت کو پختہ بنا لے۔ سینکڑوں بادل آغوش میں لے لے، جن سے دریا برستے ہیں؛

۶۔ اپنے آپ کو پختہ اور مضبوط کر اور اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جا۔ تُو پارا ہے، اسے جما کر چاندی بن جا۔

۷۔ خودی کے تار سے نغمہ پیدا کر اور خودی کے بھید سب پر آشکارا کر دے۔

چودھواں باب

الماس اور کوئلے کی حکایت

تمہید حکایت کا مفاد یہ ہے کہ کوئلے نے الماس سے کہا: "ہم دونوں کان میں اکٹھے رہتے ہیں۔ ہماری اصل بھی ایک ہی ہے، لیکن میں بے حقیقتی کے رنج سہتا ہوں اور تو بادشاہوں کے تاج کی زینت بنتا ہے۔ مجھ سے لوگ انگیٹھیاں دہکاتے ہیں، بالآخر راکھ ہو جاتا ہوں۔ تو اتنا روشن ہے کہ تیرے ہر پہلو سے جلوے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ اس اختلافِ حال کا سبب کیا ہے؟ الماس نے جواب دیا: صرف پختگی اور پائداری اس کا سبب ہے۔ معمولی مٹی اپنے اندر پختگی پیدا کر لیتی ہے تو انگشتری کا نگینہ بن جاتی ہے۔ میں بھی پختگی ہی سے روشن ہوا۔ تو اس لیے ذلت و خواری میں پڑا کہ خام تھا، اس وجہ سے جل گیا کہ تیرا جسم نرم تھا۔ دنیا اسی سے نور حاصل کرتی ہے، جو پختہ اور پائدار ہو۔"

کوئلے کی زار نالی زغال۔ کوئلہ۔

مجمر۔ انگیٹھی۔

۱ - اقبال فرماتے ہیں کہ میں پھر حقیقت کا ایک دروازہ کھول رہا ہوں یعنی ایک اور کہانی سناتا ہوں، جس سے پیشِ نظر مطالب کی تشریح بہ خوبی ہو جائے گی۔

۲ - کوئلہ کان میں بیٹھے بیٹھے الماس سے مخاطب ہوا کہ اے الماس! تو ایسے جلووں کو دامن میں سمیٹے بیٹھا ہے، جن پہ کبھی زوال نہیں آتا یعنی جن کی آب و تاب برابر باقی رہتی ہے۔

۳ - میں اور تو دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں، ہمارا رہنا سہنا بھی ایک ہی وضع کا ہے اور دونوں کے وجود کی اصل بھی ایک ہی ہے۔

۴ - میں تو کان میں پڑا پڑا اپنی ناکارگی اور بے حقیقتی کے رنج و غم میں مر رہا ہوں، تو بادشاہوں کے تاج کی زینت بن جاتا ہے۔

غور کرنا چاہیے کہ دونوں کی اصل ایک ہے، رہنا سہنا ایک سا ہے، رہنے کی جگہ ایک ہے لیکن صرف معنویت نے ان میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔ ایک ذلت کی ٹھوکریں کھاتا رہا، دوسرے نے عزت کا تاج پایا۔

۵ - کوئلہ کہتا ہے، میری شکل صورت اتنی بری ہے کہ مجھے مٹی سے بھی کمتر سمجھا جاتا ہے۔ تیرے حسن و جمال کا یہ عالم ہے کہ اسے دیکھ کر آئینے کا دل حسد سے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

دوسرے مصرع میں حسن بیان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آئینے کو الماس ہی کے ریزے سے کہا جاتا ہے۔

۶۔ میں خود تاریک ہوں۔ انگیٹھی میں پہنچتا ہوں تو اس کے لیے روشنی کا سامان بن جاتا ہوں مگویا میرے کمال کا جوہر صرف یہ ہے کہ راکھ ہو جاؤں۔

۷۔ ہر شخص پاؤں میرے سر پہ رکھ کر مجھے توڑتا اور ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، پھر میری ہستی کے سروسامان میں چنگاری ڈال دیتا ہے۔

اس سلسلے میں کوئلے کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے، وہ خاص توجہ کی محتاج ہے اور یہ شاعری کی جزئیات نگاری کی معجز نما دستاویز ہے۔ یہ کیفیت ہر شخص کے سامنے ہونی چاہیے کہ کوئلے کو انگیٹھی میں ڈالنے سے پہلے پاؤں سے کچل کر ذرا چھوٹے ٹکڑے کیے جاتے ہیں، پھر انگیٹھی دہکائی جاتی ہے۔ مختصر سی بحر میں ان جزئیات کو بیان کرنا اور شاعرانہ محاسن کا ہر پہلو قائم رکھنا آسان نہیں۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

۸۔ حق یہ ہے کہ میری کیفیت تو آنسو بہائے جانے کے قابل ہے۔ کبھی تُو نے غور کیا کہ میرے وجود کی حقیقت کیا ہے؟

۹۔ دھوئیں کی ایک لہر ہے، جس کے تمام اجزا باہم مل گئے ہیں اور ایک اُڑتی سی چنگاری اس پر پڑ جائے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ اب مقابلے میں تجھے دیکھا جائے تو تیرا چہرہ ستاروں کی طرح دمکتا ہے۔ تیری سرشت بھی اُسی طرح درخشاں ہے اور تیرے ہر پہلو سے جلووں کی لہریں اُٹھتی ہیں۔

۱۱۔ تُو کبھی بادشاہوں کی آنکھ کا نور بن جاتا ہے اور کبھی خنجر کے دستے کے لیے زیب و زینت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ بتا، میری اور تیری حالت میں اتنا تفاوت کیوں ہُوا؟

الماس کا جواب | **پیرامون** ۔ گردوپیش۔

۱۔ الماس نے کوئلے کی باتیں سنیں تو کہا: "اے میرے نکتہ بیں ساتھی! جس کی نظر گہری حقیقتوں پہ ہے، دیکھ کہ مٹی اپنے اندر پختگی اور استواری پیدا کر لیتی ہے تو انگشتری کا نگینہ بن جاتی ہے۔"

۲۔ وہ مٹی گردوپیش سے برابر ٹکراتی رہی اور اس ٹکراؤ سے پتھر کی طرح مستحکم ہو گئی۔

مراد یہ ہے کہ پختگی، پائداری اور استواری ہی ہر وجود کی شان ہے۔ نگینے کی اصل کیا ہے؟ وہی عام مٹی، لیکن پختگی کے باعث اسے اعلیٰ درجے کی عزت مل جاتی ہے۔ جو وجود اپنے اندر پختگی پیدا نہیں کرے گا، وہ یقیناً پامال ہو گا اور ناکارہ رہ جائے گا، جیسے کوئلہ۔

۳۔ الماس نے کہا کہ میرا وجود بھی پختگی ہی کے باعث سراپا نور ہُوا اور میرا سینہ جلووں سے لبریز ہو گیا۔

۴۔ تُو اس لیے ذلیل ہُوا کہ تیرا وجود خام اور ناپختہ رہ گیا اور اسی لیے جل اٹھا کہ تیرا بدن نرم اور ملائم تھا۔

سبق: مستنیر ۔ روشنی حاصل کرنے والا ۔ روشن۔

صلابت ۔ سختی ۔ پختگی ۔

کوئلے اور الماس کا مکالمہ ختم ہوا تو شاعر نے اپنی دعوت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ فرماتے ہیں:۔

۱ ۔ اے مخاطب! تو خوف، غم اور وسوسوں سے بالکل آزاد ہو جا۔ پتھر کی طرح اپنے اندر پختگی پیدا کر لے اور الماس بن جا۔

۲ ۔ جو وجود سخت کوش اور سخت گیر ہو یعنی زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت کے لیے تیار رہو اور اپنی پختگی کی بنا پر کسی کی گرفت میں نہ آئے، اسی سے دونوں جہان روشنی کے طلبگار ہوتے ہیں۔

۳ ،۴ ۔ غور کرو، اس مقدس پتھر کی اصل کیا ہے جو سنگِ اسود کے نام سے شہرۂ آفاق ہے اور حرم پاک کے پردے سے سر باہر نکالے ہوئے ہے۔ اس نے اپنے اندر پختگی پیدا کی تو اس کا رتبہ کوہِ طور سے بھی اونچا ہو گیا۔ صدیاں گزر گئیں، کالے گورے سب اسے بوسہ دیتے چلے آ رہے ہیں۔

واضح رہے کہ سنگِ اسود طواف کے آغاز اور اختتام کا نشان ہے۔ حرم پاک کا ہر حصہ غلاف سے چھپا رہتا ہے لیکن جس کونے میں حجرِ اسود نصب ہے، وہاں غلاف کا تھوڑا سا حصہ اوپر اٹھا دیا گیا ہے تاکہ طواف کرنے والوں کو حجرِ اسود نظر آئے۔ طواف کے سات شوط (پھیرا) ہیں۔ ہر شوط پورا ہونے پر طواف کرنے والا حجرِ اسود کو بوسہ دیتا ہے، البتہ ہجوم زیادہ ہونے کے باعث وہاں تک پہنچ نہ سکے تو دور ہی سے احترام کا اشارہ کر دیتا ہے۔

۵ ۔ سختی اور پختگی ہی سے زندگی کی عزت و آبرو ہے۔ جو ناپختہ ہو گا، وہ ناکارہ بھی ہو گا اور کمزور بھی۔

پندرھواں باب

شیخ و برہمن اور گنگا و ہمالہ

اس باب میں پہلے شیخ و برہمن کی حکایت بیان کی گئی ہے، پھر دریائے گنگا اور کوہستان ہمالہ کی باہمی بات چیت سنائی گئی ہے۔ دونوں میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ملی زندگی کا تسلسل خاص ملی روایات کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہنے پر موقوف ہے۔

تمہید: پہلی حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ بنارس میں ایک برہمن تھا، جس نے علم و حکمت میں کمال بہم پہنچا لیا تھا، لیکن وجود و عدم اور بقا و فنا کا عقدہ اس پر نہ کھل سکا۔ ایک روز وہ ایک شیخ کامل کے پاس پہنچا اور اپنی نارسائی کی کیفیت

بیان کی۔ شیخ نے فرمایا کہ تو آسمان پر اُڑتا رہتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے زمین پر بھی اُتر آ۔ میں تجھ سے بت پرستی نہیں چھڑاتا۔ کافر رہنا چاہتا ہے تو رہ، لیکن اپنے اندر وہ شان تو پیدا کر کہ زنّار پہننے کے لائق ہو جائے۔ تو پُرانی تہذیب کا امانت دار ہے، اپنے باپ دادا کا مسلک کیوں چھوڑتا ہے؟ قومی زندگی جمعیت پر موقوف ہے۔ یاد رکھ کہ کفر بھی جمعیت ہی کے بل پر قائم ہے۔ جب تیرے وجود میں خودی کی شمع ہی روشن نہ رہی تو آسمانوں کی پیمائش کرنے والا خیال تجھے کیا فائدہ پہنچائے گا؟

گنگا اور ہمالیہ کی باہمی بات چیت کا مفاد یہ ہے کہ ایک روز گنگا نے ہمالیہ سے کہا، بیشک تو بہت بلند ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی، تجھ پر برف کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ تو اونچا تو ہو گیا لیکن تجھے چلنا نہ آیا، حالانکہ زندگی بس چلنے کا نام ہے۔ ہمالیہ نے سُن کر جواب دیا کہ دیکھ تجھ جیسے سیکڑوں دریا میرے سینے میں موجود ہیں۔ تو جس چلنے پر فخر کرتا ہے، وہ تو تیرے لیے فنا ہونے کا سامان ہے۔ جس وجود نے خودی چھوڑی، وہ اسی لائق ہے کہ مٹ جائے۔ تو اپنی ہستی سمندر کی نذر کر رہا ہے۔ خودی سے آگاہ نہیں اور نہ اپنے نقصان پر نازاں ہے۔ تجھ سے تو ساحل بہتر ہے، جو اپنی جگہ جما کھڑا ہے۔ میں جب سے پیدا ہوا ہوں، ایک جگہ قائم ہوں۔ تو سمجھتا ہے کہ میں منزل سے دور رہ گیا، حالانکہ میں اتنا اونچا ہو گیا کہ ستارے بھی میرے دامن میں آرام لینے لگے۔ اگر تو چلنے ہی کو کمال سمجھتا تھا تو بہتر ہوتا کہ بادل بن جاتا تاکہ سمندر پانی کے لیے تیرا محتاج ہو جاتا۔

دونوں حکایتوں میں خودی کے استحکام اور ملّی روایات سے وابستگی کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

<u>برہمن</u> | برہمند۔ برہمن کا مزید علیہ۔

گیرا۔ پکڑنے والا۔ گیرندہ۔

ندرت کوش۔ نئی نئی باتیں سوچنے اور اُن کے لیے کوشش کرنے والا۔

عنقا۔ ایک فرضی پرندہ۔ سیمرغ۔

سپند۔ وہ کالا دانہ جو نظرِ بد کا اثر زائل کرنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔ حرمل۔

حرمان۔ محرومی۔

غمّاز۔ اشارہ کرنے والا۔ چغلی کھانے والا۔ ظاہر کرنے والا۔

۱۔ بنارس میں ایک معزز برہمن رہتا تھا، جو وجود اور عدم، فنا اور بقا کے مسئلوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ یعنی ہر وقت یہ سوچتا تھا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ فنا کس حالت کو کہتے ہیں اور اس کی کیفیت کیا ہو گی؟

۲۔ اُسے حکمت اور فلسفے میں خاص کمال حاصل تھا۔ ساتھ ساتھ خدا کی تلاش کرنے والے بزرگوں سے عقیدت بھی تھی۔

۳۔ اُس کا ذہن ہر قسم کی مشکل باتیں بہ آسانی قابو میں لے آتا اور ہر وقت اس کی کوشش یہ رہتی کہ نادر نکتے دریافت

کرے۔ اُس کی عقل اتنی بلند تھی کہ کہ سکتے ہیں، وہ ثریا کے برابر پہنچی ہوئی تھی۔

۴۔ جس طرح عنقا بہت بلندی پر گھونسلا بناتا ہے، اُسی طرح اس برہمن کا دماغ بھی ہمیشہ بلندیوں پر پرواز کرتا رہتا۔ وہ اتنا اونچا اُڑتا کہ کہ سکتے ہیں، سورج اور چاند اس کے غور و فکر کی آگ پر سپند بنے ہوئے تھے۔

۵۔ وہ مدت تک فکری محنت و مشقت میں لگا رہا، لیکن حکمت کے ساقی نے کوئی شراب اس کے پیالے میں نہ ڈالی۔

۶۔ اُس نے علم و حکمت کے باغ میں مسلسل جال بچھائے رکھا، لیکن اُس کے جال کی آنکھ نے حقیقت کا کوئی پرندہ نہ دیکھا یعنی کوئی پرندہ اس کے حلقۂ دام میں نہ پھنسا۔

مطلب یہ ہے کہ علم و دانش کی کوئی محنت اُسے مطلوب تک نہ پہنچا سکی۔

۷۔ اُس کی فکر کا ناخن عقدے کھولتے کھولتے لہو ہو گیا ہوا تو وہ چور ہو کر رہ گیا، لیکن فنا و بقا کی گتھی نہ کھول سکا۔

۸۔ اُس کے لبوں پر آہ تھی جو اُس کی محرومی کی گواہ تھی اور اس کا چہرہ دیکھتے ہی دل کی حیرانی نمایاں ہو جاتی تھی۔

۹۔ ایک روز وہ ایک شیخ کامل کے پاس گیا، جس کے سینے میں حق شناس دل موجود تھا۔

۱۰۔ جاتے ہی حالِ دل سنایا، پھر لبوں پر خاموشی کی مہر لگا لی اور دانا شیخ کی گفتگو پر کان لگا لیے۔

شیخ | **طائف** - طواف کرنے والا - گھومنے والا -

۱۔ شیخ نے فرمایا، تُو بلند آسمانوں پر اُڑتا پھرتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے زمین سے بھی وفا کا پیمان باندھ لے۔

۲۔ تُو خود جنگلوں میں مارا مارا پھرنے لگا ہے اور تیرا بیباک خیال آسمانوں سے بھی آگے نکل گیا۔

۳۔ اے آسمانوں کو طے کرنے والے! تُو زمین کے ساتھ بھی تعلق پیدا کر اور تاروں کے موتیوں کی تلاش میں بھٹکنا چھوڑ دے۔

۴۔ میں نہیں کہتا کہ تُو بتوں سے بیزاری اختیار کر لے۔ تجھے کفر پسند ہے تو کافر ہی رہ، لیکن اتنا تو کر کہ زنار پہننے کے قابل ہو جائے اور تُو کفر کے لیے باعثِ ننگ نہ رہے۔

۵۔ تیرے پاس ایک پُرانی تہذیب بطورِ امانت موجود ہے، اس کا حق ادا کر اور باپ دادا کے طور طریقے نہ چھوڑ۔

۶۔ اگر قومی زندگی جمعیت و اتحاد پر موقوف ہے تو ظاہر ہے کہ کفر بھی جمعیت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

۷۔ مصیبت یہ ہے کہ تو کفر کے معیار پر بھی پورا نہیں اُترا اور اُس میں بھی درجۂ کمال حاصل نہیں کر سکا، اس لیے تُو دل کے حرم کا طواف کرنے کے قابل نہ ہو سکا، یعنی صاحبِ دل نہ بن سکا۔

۸۔ ہم دونوں تسلیم و رضا کے راستے سے ہٹ گئے۔ تُو بت پرست تھا اور آزر کے طریقے سے دُور چلا گیا۔ میں توحید پرست تھا اور حضرت ابراہیمؑ کے راستے پر نہ چل سکا۔

۹۔ ہمارا مجنون لیلیٰ کے محمل کا دیوانہ نہ بنا اور وہ عاشقی کے جنون میں کمال حاصل نہ کر سکا۔

۱۰۔ جب خودی کا چراغ وجود کے اندر بجھ گیا تو آسمان کی منزلیں طے کرنے والے خیال سے کیا فائدہ حاصل ہو گا؟

شیخ کی پوری دعوت کا مقصد یہ تھا کہ برہمن کو حصولِ مقصد کے لیے زمین سے ربط و تعلق بڑھانا چاہیے تھا اور یہ جو فرمایا کہ باپ دادا کا طریقہ نہ چھوڑ تو یہ مٹی روایات سے وابستگی پیدا کرنے کی دعوت تھی۔

گنگا | آفرینش۔ پیدائش۔ ابتدائے عالم۔

۱۔ پانی نے پہاڑ کے دامن پر چنگل مارا۔ ایک روز دریائے گنگا نے کوہستان ہمالہ سے کہا؟

۲۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی، تُو برف کے بے اندازہ انبار کندھے پر اٹھائے کھڑا ہے۔ سیکڑوں ندیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سیم تار ہیں جو تیرے گلے سے بندھے ہوئے ہیں۔

۳۔ خدا نے بلندی میں تجھے آسمان کا ہمراز بنا دیا، لیکن تیرے پاؤں کو خرام ناز سے محروم رکھا۔

۴۔ جب تیرے پاؤں میں چلنے ہی کی طاقت باقی نہ چھوڑی تو اس وقار اس بلندی اور اس تمکنت سے کیا فائدہ؟

۵۔ زندگی مسلسل چلنے ہی کا نام ہے دیکھو، موج کے وجود کا پورا سر و سامان تگ و دو کے سوا کچھ نہیں۔

ہمالہ | دُوہ۔ چوٹی۔

۱۔ پہاڑ نے دریا سے یہ طعنہ سُنا تو غصے کے مارے آگ کے سمندر کی طرح بھڑک اٹھا۔

۲۔ بولا، اے دریا! تیری وسعت میرے لیے آئینے کا کام دے رہی ہے اور تجھ ایسے سیکڑوں دریا میرے سینے میں موجود ہیں۔

۳۔ تُو جسے خرام ناز کہتا ہے، وہ تو اپنے آپ کو ختم کر لینے کا ذریعہ ہے۔ جو شخص اپنی ہستی سے بیگانہ ہوا، وہ اسی قابل ہے کہ فنا کے گھاٹ اتر جائے۔

۴۔ تُو اپنے مقام اور اس کی حقیقی حیثیت سے واقف نہیں اور تیری حماقت کا یہ حال ہے کہ اپنے نقصان پر فخر و ناز کر رہا ہے۔

۵۔ تیرا دعویٰ ہے کہ تُو آسمان کے بطن سے پیدا ہوا، لیکن تجھ سے تو وہ ساحل بہتر ہے جو اپنی جگہ جما کھڑا ہے۔

گنگا کو آسمان سے اس لیے منسوب کیا کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اس دریا کا سرچشمہ آسمان پر ہے۔

۶۔ تُو نے اپنی ہستی سمندر کی نذر کر دی اور جان کا سرمایہ رہزن کے آگے ڈال دیا۔

۷۔ تُو باغ میں پھول کی طرح خوددار بن اور جگہ جگہ خوشبو پھیلانے کی غرض سے گلچیں کے پیچھے نہ جا۔

اس شعر میں شاعر نے پھول کی دو حیثیتیں بیان کیں۔ اوّل، جب تک وہ باغ میں رہتا ہے، خوددار ہوتا ہے۔ دوم جب اُس کے دل میں یہ ولولہ اٹھتا ہے کہ خوشبو جگہ جگہ پھیلائے تو اس کی خودداری ختم ہو جاتی ہے اور گلچیں اسے توڑ کر جہاں چاہتا ہے، پہنچا دیتا ہے، گویا خوشبو پھیلانے کی

آرزو اس کی خودداری ہی نہیں، ہستی بھی مٹا دیتی ہے۔

۸۔ زندگی یہ ہے کہ اپنی جگہ بیٹھ کر ترقی و استحکام کے لیے سعی کی جائے اور خودی کی کیاری سے پھول چُنے جائیں۔

۹۔ دیکھو، صدیاں گزر گئیں، میں ایک جگہ پاؤں جمائے کھڑا ہوں۔ تو سمجھتا ہے کہ میں اپنی منزل سے دُور ہوں۔

۱۰۔ اس حقیقت کو نہیں دیکھتا کہ میرا وجود بڑھتے بڑھتے آسمان تک جا پہنچا اور ثریا بھی میرے دامن میں آرام پانے لگا۔

۱۱۔ باقی رہا تُو تو تیری ہستی سمندر میں گم ہو گئی اور میری چوٹی ستاروں کی سجدہ گاہ ہے۔

۱۲۔ میری آنکھ آسمان کے بھید دیکھتی ہے اور میرے کان فرشتوں کے اُڑتے کی آواز سے آشنا ہیں۔

۱۳۔ میں مسلسل جدوجہد کرتا رہا اور اس آگ میں جلتا رہا۔ تُو جانتا ہے کہ اس کا ثمرہ کیا ملا؟

یہ کہ لعل، الماس اور گوہروں سے میرا دامن بھر گیا۔

۱۴۔ میرے اندر پتھر ہیں، اور پتھروں کے اندر آگ ہے۔ وہ ایسی آگ ہے کہ پانی اُس تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔

یہ مولانا روم کا تصرف ہے۔ اسی لیے اصل میں اسے واوین کے اندر رکھا گیا ہے۔

۱۵۔ تُو قطرہ بھی ہو تو اپنے آپ کو اپنے پاؤں میں نہ گرا۔ اپنے اندر طوفان کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کر، سمندر سے لڑ جا۔

۱۶۔ تو گوہر کی آب و تاب کا طلبگار ہو اور گوہر کا ٹکڑا بن جا۔ اس طرح تو آویزہ بن کر کسی محبوب کے کان تک پہنچ جائے گا۔

۱۷۔ یا اپنے آپ کو بڑھا اور تیز رفتار ہو جا، مثلاً بادل بن جا، جس سے بجلیاں گرتی ہیں اور دریاؤں کو لبریز کر دینے والا پانی برستا ہے۔

۱۸۔ اگر تُو بادل بن جائے گا تو سمندر طوفان پیدا کرنے کے لیے تیرے پاس بھیک مانگنے آئے گا اور تُو اتنا پانی دے گا کہ وہ اپنے دامن کے تنگ ہونے کی شکایت کرنے لگے گا۔

۱۹۔ وہ اپنے آپ کو تیرے مقابلے میں ایک موج سے بھی کم سمجھے گا اور اپنی ہستی تیرے پاؤں پر ڈال دے گا۔

سولھواں باب

مسلمان کی زندگی کا نصب العین

اس باب میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد کلمۂ حق کی سربلندی اور جہاد ہے۔
اگر جہاد کا محرک تسخیرِ ممالک ہو تو اسلام کے رو سے یہ حرام ہے۔

تمہید جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے، مسلمان کی زندگی کا مقصد کلمۂ حق کی سربلندی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی غرض سے جہاد لازم قرار پایا۔ تسخیرِ ممالک کے لیے جہاد اسلام کے نزدیک حرام ہے۔ فرماتے ہیں کہ مسلمان کی ہر چیز خدا کی رضا کے تابع ہے۔ اُس کا دیکھنا، نہ دیکھنا، کھانا، پینا، سونا سب کچھ خدا کے لیے ہوتا ہے اور ہر عمل کا مقصود یہ ہونا چاہیے کہ خدا کا قرب حاصل ہو۔ اگر خدا کے سوا کچھ مقصود ہو تو صلح بھی شر بن جاتی ہے۔ اگر صرف خدا مقصود ہو تو جنگ بھی بہت بڑی نیکی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ میاں میرؒ کی ایک حکایت بیان کی ہے کہ ہندوستان کا بادشاہ شیخ موصوف کا مرید تھا اور اس کا لشکر دکن میں جنگ کر رہا تھا۔ بادشاہ فتح کی دعا کے لیے شیخ کی خدمت میں پہنچا۔ شیخ خاموش رہے۔ اس اثناء میں ایک مرید نے ایک روپیہ بطور نذر شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ شیخ نے فرمایا: یہ روپیہ بادشاہ کو دے دو کیونکہ وہ بادشاہی کے لباس میں سب سے زیادہ مفلس ہے۔ اس کی نظر دوسروں کے مال پر ہے۔ سلطنت وسیع کرنے کی حرص نے اس کے سینے میں جو آگ بھڑکا رکھی ہے، اُس نے دنیا بھر کو جلا ڈالا ہے۔ غرض جو شخص اللہ کی رضا کے سوا تلوار کھینچتا ہے، وہ تلوار اُسی کا سینہ چیر ڈالتی ہے۔

رضائے باری تعالیٰ صبغۃ اللہ۔ خدا کا رنگ۔ اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف:

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝

ہدایت اور نجات کی راہ بپتسمے یعنی رنگ دینے کی محتاج نہیں جیسا کہ عیسائیوں کا خیال ہے۔ یہ اللہ کا رنگ دینا ہے اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔

قاہر۔ قہر و غضب والا۔ غالب۔ زبردست۔

شاہد علی النّاس۔ یہ بھی سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے یعنی:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

اور ہم نے تمھیں نیک ترین اُمّت ہونے کا درجہ عطا فرمایا تاکہ تم انسانوں کے لیے گواہی دینے والے ہو اور تمھارے

عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۝ یے اللہ کا رسول گواہی دینے والا ہو

۱۔ دل کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ دے، جس سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔ اسی طرح عشق کے لیے عزت، نیک نامی اور ناموس کا سروسامان ہوگا۔ یعنی جو شخص اللہ کے رنگ میں رنگا جائے گا، اپنے آپ کو خدا کی رضا کے حوالے کردے گا۔ اللہ کے تمام حکموں پر ٹھیک ٹھیک عمل کرے گا۔ اسی کے لیے زیبا ہوگا کہ عشق حق کا دعویٰ زبان پر لائے۔ وہ فرد یا مجموعۂ افراد، جسے عرف میں قوم کہتے ہیں، کیونکر خدا کی محبت کا مدعی ہو سکتا ہے، جب تک اُس کا ہر عمل خدا کی رضا کے تابع نہ ہو؟

۲۔ مسلمان کی فطرت محبت ہی کے بل پر غلبہ پاتی ہے اور سب پر برتری حاصل کر لیتی ہے۔ جو مسلمان عشق و محبت سے خالی ہو، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مسلمان نہیں، کافر ہے، اگرچہ زبان سے اسلام کا مدعی ہو۔

اس شعر کا مطلب خوب ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ مسلمان کی فطرت ہی یہ ہے کہ خدا کے عشق میں ڈوبا رہے۔ وہ اسی عشق کی بنا پر سب سے آگے نکل جاتا ہے اور سب اُس کا حکم مانتے ہیں۔ پھر مسلمان رسول پاکؐ کے اتباع میں ہر فرد کو محبت، پیار اور ہمدردی سے راہِ حق کی طرف لاتا ہے۔ جبر، سختی اور مظاہرۂ قوت کے لیے اس کی تبلیغ میں کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ جبر سے دوسرے کو مجبور کیا جا سکتا ہے، دبایا جا سکتا ہے، مگر اس کے دل میں وہ کلمۂ حق نہیں اتارا جا سکتا جو اعمال کی بنیاد و اساس اور تخلیق کا حقیقی مقصود ہے۔ جو مسلمان محبت کے اس مسلک پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلتا، ظاہر ہے کہ اسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اُس کا دیکھنا اور نہ دیکھنا، کھانا، پینا اور سونا سب کچھ خدا کی رضا کے تابع ہوتا ہے۔

یہاں سورۂ انعام کی مشہور آیت بھی سامنے رکھ لینی چاہیے۔ رسول اللہ صلعم کو ارشاد ہوتا ہے کہ کہو، خدا نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا۔ وہی درست اور صحیح دین ہے۔ وہی ابراہیمؑ کا طریقہ ہے کہ صرف خدا کے لیے ہو جانا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝	کہو، بے شک میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

۴۔ خدا کی رضا کے مطابق کام کرنے والے کی شان اور مرتبے پر کبھی غور کیا؟ اُس کی شان یہ ہے کہ خدا کی مرضی اُس کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔ یہ ہے تو حقیقت اور اسے سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں، لیکن ظاہر میں لوگ اوّل نظر میں اسے

ترینِ یقین کب سمجھیں گے ؛

اس شعر کا آخری مصرع مولانا روم سے لیا گیا ہے۔ ہم پہلے تفصیلاً لکھ چکے ہیں کہ اللہ کی رضا پر چلنے والے کا ہر فعل کیونکر خود اللہ کا فعل بن جاتا ہے۔ یعنی وہ مشہور حدیث جس میں فرمایا کہ بندہ نفلی عبادت سے میرا قرب حاصل کرتا ہے تو میں اس کے کان، آنکھیں، زبان اور ہاتھ بن جاتا ہوں۔ ویسے بھی ظاہر ہے کہ جب اللہ کا کوئی بندہ اپنا ہر عمل خدا کی رضا کے تابع رکھے گا تو جو کچھ کرے گا عین خدا کے حکم کے مطابق ہوگا۔ یہی مطلب ہے اس مصرع کا کہ اس کی مرضی میں خدا کی مرضی گم ہو جاتی ہے۔

۵، ۶۔ مسلمان توحید کے میدان میں خیمہ لگا لیتا ہے تو دنیا بھر کی قوموں کے لیے سچائی کا گواہ، نمونہ اور معیار بن جاتا ہے۔ خود مسلمان کے لیے جن و انس کے نبی حضرت رسول اکرم صلعم گواہ، نمونہ اور معیار ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ آپؐ کائنات کے تمام گواہوں میں سے صادق ترین گواہ ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی جس آیت کی طرف اشارہ ہے، وہ اوپر پیش کی جا چکی ہے۔

۷۔ قال کو چھوڑ اور حال کا دروازہ کھٹکھٹا، یعنی صرف باتوں اور زبانی دعووں سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، ضرورت اس امر کی ہے کہ اللہ کے حکموں پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے۔ انسان عمل سے کبھی باز نہیں رہ سکتا، لیکن جو عمل خدا کی رضا کے خلاف ہوگا، وہ سراسر تاریک اور سیاہ ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ حق کے نور سے عملوں کی یہ ظلمت دھو ڈال، یعنی ہر عمل خدا کی رضا کے تابع رکھ۔

۸۔ اگر تو نے بادشاہی کا بھی لباس پہن رکھا ہے تو درویشوں کی سی زندگی بسر کر۔ آنکھ بیدار رکھ اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کو دھیان میں رکھ۔

۹۔ مسلمان کے ہر عمل کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اُسے خدا کا قرب حاصل ہو۔ اسی طرح خدا کا جلال اس سے پھوٹ کر باہر نکلے گا کیونکہ اُس کا مقصد خدا ہوگا، ماسوا اللہ نہ ہوگا اور اعمال کی برتری نیّت کی پاکیزگی اور خلوص پر موقوف ہے۔

۱۰۔ اگر خدا کے سوا کچھ اور مقصود ہوگا تو صلح بھی، جو بظاہر نیک کام ہے، سراسر بُرائی بن جائے گی اور اگر خدا مقصود و نصب العین ہو تو لڑائی بھی، جو بظاہر بُرا کام ہے، بے شبہ نیکی کی شکل اختیار کرے گی۔

مبادا غلط فہمی ہو، یہ سمجھ لینا چاہیے کہ غیر اللہ کے لیے صلح کو شر اور اللہ کے لیے جنگ کو خیر بتانا کسی خاص صلح اور خاص جنگ پر موقوف نہیں، فیصلے کا معیار یہ ہے کہ اُس صلح اور اُس جنگ سے انسانیت کے نظام پر بہ حیثیتِ مجموعی کیا اثر پڑے گا۔ غیر اللہ کے لیے صلح یقیناً شر کا بیج بوئے گی اور یہ پودا تناور ہو کر ایک وسیع بُرائی کی شکل اختیار کرے گا۔ اس کے برعکس اگر اللہ

کے بیے جنگ بھی کی جائے گی تو نظامِ انسانیت ایک ایسی بُرائی سے پاک ہوگا، جسے پھیلنے کا موقع مل جاتا تو مصیبت کا باعث بن جاتی، الہٰذا اسے خیر قرار دیا۔

۱۱۔ اگر ہماری تلوار سے کلمۂ حق سربلند نہ ہو اور خدا کی رضا کا دائرہ عملاً وسعت اختیار نہ کرے تو ایسی تیغ زنی اور جنگ آزمائی یقیناً قوم کے لیے نامبارک ثابت ہوگی۔ نہ اس سے کوئی نفع ملے گا، نہ عزت۔

شیخ میانمیرؒ اور بادشاہِ ہند جبہہ۔ پیشانی۔

ھل من مزید۔ لغوی معنی ہیں "کیا کچھ اور بھی ہے؟" یہ سورۂ قاف کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے، یعنی

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَ تَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ ۝ جس دن ہم جہنم سے کہیں گے، کیا بھر گیا اور وہ کہے گا، کیا کچھ اور بھی ہے؟

خَوے۔ تلفظ خَے ہے، یہاں خَیْے پڑھا جائے گا۔ پسینا۔

اجانب۔ اجنبی کی جمع۔ بیگانے۔ غیر۔

سطوت۔ رعب۔ شوکت۔ دبدبہ۔

۱۔ حضرت شیخ میانمیرؒ وہ بزرگ تھے، جن کی جان کے نور سے معرفتِ حق کا ہر چھپا ہُوا بھید روشن ہو جاتا تھا۔ شیخ محمد میرؒ اصلاً سندھی تھے۔ سہوان آپ کا وطن تھا جسے سیوستان بھی کہتے تھے۔ ولادت ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) وفات سہ شنبہ ۷۔ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ (۱۱۔ اگست ۱۶۳۶ء) بعد از نمازِ ظہر۔ عمرِ مبارک کا بیشتر حصّہ لاہور میں گزرا۔ یہیں آپ کا مزار اس آبادی میں ہے جو آپ کے نام سے موسوم ہوئی۔

۲۔ آپ رسول اللہ صلعم کی سنّت پر مضبوطی سے قائم تھے اور آپ ایک ایسی بانسری تھے، جس میں سے عشق و محبتِ حق کے نغمے نکلتے تھے۔

۳۔ آپ کا مزار ہمارے شہر کی خاک کے لیے ایمان کا سرمایہ ہے اور ہمارے لیے نورِ ہدایت کی مشعل ہے۔

۴۔ حضرت شیخ کا رتبہ اتنا بلند تھا کہ آسمان بھی آپ کے دروازے پر پیشانی ملتا تھا۔ ہندوستان کا بادشاہ آپ کا مرید و عقیدت مند تھا۔ بدیہی طور پر اس سے اشارہ شاہجہاں کی طرف ہے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ نکلسن نے "اسرارِ خودی" کے انگریزی ترجمے میں بادشاہ کا نام اورنگ زیب لکھا، حالانکہ اورنگ زیب حضرت شیخ میانمیرؒ کی وفات سے کم و بیش تئیس برس بعد تخت نشین ہوا۔ یہاں سوال اصل واقعے کی صحت و عدمِ صحت کا نہیں، لیکن یہ شاہجہاں یا اس سے پیشتر کے زمانے کا ہونا چاہیے۔

۵۔ بادشاہ نے دل میں حرص کا بیج بو رکھا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ بہت سے ملک فتح کرے۔

۶۔ ہوس نے اس کی جان میں آگ دہکا رکھی تھی اور وہ اپنی تلوار کو یہ کلمہ سکھاتا تھا، کیا کچھ اور بھی ہے؟ مطلب یہ

کہ اُس کی تلوار ایک علاقہ فتح کر چکنے کے بعد دوسرے کے سر پر جا چمکتی تھی۔

۷- اُس وقت دکن میں بڑا ہنگامہ بپا تھا۔ لڑائیاں ہو رہی تھیں اور بادشاہ ہند کا لشکر بھی وہیں مصروف تھا۔

۸- بادشاہ اُس بزرگ کی خدمت میں پہنچا، جس کا رتبہ بلندی میں آسمان کے برابر تھا تاکہ ان سے دعا کی برکت حاصل کرے، یعنی اس غرض سے شیخ کے پاس پہنچا کہ لشکر کی فتح کے لیے دعا کرائے۔

۹- مسلمان کو جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ دنیا سے ہٹ کر خدا کی طرف دوڑتا ہے اور دعا سے تدبیر کو تقویت پہنچاتا ہے۔

اقبالؔ کی شانِ اسلامیت ملاحظہ ہو کہ حقائق کی حیثیت کچھ اور تھی لیکن دعا کا ذکر آگیا تو اصل بیان سے قطع نظر کرتے ہوئے مسلمان کا یہ شیوہ واضح کر دیا کہ وہ محض تدبیروں کے بھروسے پر نہیں رہتا بلکہ خدا سے دعا بھی کرتا ہے۔ تدبیر میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا اور دعا سے بھی غافل نہیں رہتا۔ جس طرح محض تدبیروں پر بھروسا اسلامی شیوے کے خلاف ہے، اسی طرح صرف دعا میں لگ جانا اور تدبیروں سے قطع نظر کر لینا بھی اسلامی طریقہ نہیں۔

۱۰- شیخ میاں میرؒ نے بھی دعا کے لیے بادشاہ کی درخواست سُنی تو چُپ ہو گئے۔ آس پاس جو درویش بیٹھے تھے، وہ پوری توجہ سے اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ شیخ کی زبان سے جو کچھ نکلے، اسے سنیں۔

۱۱- اس اثناء میں ایک مرید، جس کے ہاتھ میں درہم تھا، بولا اور مجلس کا سکوت ٹوٹا۔

۱۲- مرید نے کہا، حضرت! آپ خدا کی راہ سے بھٹکنے والوں کا ہاتھ تھام لیتے ہیں، یہ حقیر سی نذر آپ کی خدمت میں لایا ہوں، اسے قبول فرمائیں۔

۱۳- میرے بدن نے محنت و مشقت کے پسینے میں کئی غوطے کھائے تو میں اس قابل ہوا کہ یہ درم اپنے دامن کے پلّے میں باندھوں، یعنی میں نے بڑی محنت و مشقت سے یہ سکّہ حاصل کیا۔

۱۴- اب شیخ بولے اور فرمایا کہ یہ سکّہ ہمارے بادشاہ کا حق ہے۔ وہی بادشاہ جو بادشاہی کے لباس میں فقیر ہے۔

۱۵- سورج، چاند اور تاروں پر حکمران ہے، لیکن ہمارا بادشاہ پھر بھی سب سے زیادہ غریب ہے۔

سورج، چاند، تاروں پر حکمرانی سے بطورِ مجاز یہ مراد ہے کہ بڑی سلطنت کا مالک ہے۔

۱۶- لیکن اُس نے اپنی نگاہیں غیروں کے دسترخوان پر جما رکھی ہیں اور اُس کے اندر بھوک کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس نے ایک دنیا کو جلا کر خاکستر بنا رکھا ہے۔

۱۷- اُس کی تلوار جدھر چمکتی ہے، ساتھ ہی قحط اور طاعون لے جاتی ہے۔ اس نے اپنے لیے تعمیر کا جو نقشہ بنا رکھا ہے، اس کی وجہ سے ایک جہان ویرانہ بن گیا ہے۔

۱۸- وہ نادار ہے؛ اور جو کچھ جہاں سے ملے لے لینا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے دنیا آہ و فریاد میں مبتلا ہے۔ اس کا ہاتھ خالی ہے اور وہ ضعیفوں اور کمزوروں کو دکھ دے رہا ہے تاکہ دولت سمیٹ لے۔

۱۹- اگرچہ وہ بڑی شان و شکوہ اور دبدبے کا مالک ہے لیکن یہ خصوصیت دنیا والوں سے دشمنی کا باعث بن گئی ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ انسان ایک قافلہ ہیں اور ہمارا بادشاہ اُس قافلے کے لیے ایک رہزن ہے۔

۲۰- پھر یہ عجیب و غریب معاملہ دیکھو کہ سوچ بچار کی خامی اور خود فریبی سے اس نے لوٹ مار اور بربادی کو ملک فتح کرنے کا نام دے رکھا ہے۔

۲۱- بادشاہی لشکر اور غنیم کی فوجیں دونوں اس کی حرص کی تلوار کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہیں۔

۲۲- اگر فقیر بھوکا ہو تو اُس کی بھوک صرف اس کی جان کے لیے آگ بن کر اُسے جلا دیتی ہے، لیکن بادشاہ کی بھوک ملک اور قوم کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

۲۳- یاد رکھو کہ جس نے خدا کے سوا کسی کے لیے تلوار کھینچی، وہ تلوار اسی کے سینے میں اترے گی اور سب کچھ پارہ پارہ کر ڈالے گی۔

ستر ھواں باب

مسلمانوں کے لیے دعوت

اس باب میں وہ نصیحتیں بیان کی گئی ہیں جو میر نجات نقشبند معروف بہ بابائے صحرائی نے مسلمانانِ ہند کے لیے فرمائی ہیں۔

تمہید | اس باب کے آغاز میں وہ نصیحتیں بیان ہوئی ہیں جو میر نجات نقشبند نے مسلمانانِ ہند کے لیے ضروری سمجھیں۔ میر نجات نقشبند بہ ظاہر ایک فرضی شخصیت ہے، جس کے پردے میں اقبالؔ نے اپنے افکار مسلمانوں کے سامنے پیش کیے۔ اس سلسلے میں مولانا روم اور شیخ شمس تبریزی کی پہلی ملاقات کا قصہ آگیا جو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اسے بھی دعوت ہی کا رنگ دے دیا ہے۔ پھر مسلمانوں کو دورِ حاضر کے یورپی سرمایۂ حکمت و دانش کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں اور ذاتی تجربات کی بنا پر اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ اقبالؔ کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہاں بھی مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھایا ہے اور باب کی آخری فصل میں دعوت کے ساتھ ساتھ ملتِ بیضا کی جس

بیماریوں اور خرابیوں کا بھی ذکر بڑے پُرتاثیر انداز میں کیا ہے۔

میر نجات کا نصیحت نامہ | بحر آشام - سمندر پی جانے والا - بلانوش۔
جگر خوار - جگر کھانے والا۔

۱- میر نجات فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! تُو اسی طرح مٹی سے نکل کر بڑھا ہے، جس طرح پھول نکلتا ہے، لیکن تُو غور کرے گا تو واضح ہو جائے گا کہ تُو بھی خودی کے بطن سے پیدا ہُوا ہے۔

۲- تُو خودی کو نہ چھوڑ اور ایسی زندگی بسر کر، جس کا انجام بقا ہو۔ بیشک تیری حیثیت ایک قطرے کی ہو، لیکن قطرے میں یہ ہمت ہونی چاہیے کہ سمندر پی جائے۔

۳- تیری چمک دمک صرف خودی کے نُور کی وجہ سے ہے۔ اگر تُو خودی کو مضبوط و مستحکم کرے گا تو خود بھی استوار و پائندہ رہے گا۔

۴- قدرت نے جس تجارت سے تیرا نفع وابستہ کر دیا ہے، یعنی جس تجارت سے تجھے فائدہ ہو سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ خودی کو مستحکم کرے۔ اسی سامان کی حفاظت سے تجھے آقائی مل سکتی ہے۔

۵- تُو موجود ہے اور نیست ہونے سے ڈر رہا ہے۔ میں تجھ پر قربان، تُو نے بالکل غلط سمجھا ہے۔

۶- میں زندگی کی راہ و رسم سے آگاہ ہوں اور تجھے بتاتا ہوں کہ اس کا بھید کیا ہے۔

۷- زندگی کا بھید یہ ہے کہ پہلے موتی کی طرح اپنی ذات میں غوطہ لگائے، پھر اپنی تنہائی کی جگہ چھوڑ کر سر باہر نکالے۔
مطلب یہ کہ پہلے اپنی خودی کو مستحکم کرے، جس طرح موتی صدف کی آغوش میں کچھ مدت گزار کر اپنی خودی مستحکم کرتا ہے۔ یہ اپنی ذات میں غوطہ لگانا ہے۔ پھر جس طرح موتی صدف سے باہر نکل کر زیادہ سے زیادہ قیمت پاتا ہے، اسی طرح خودی کو مستحکم کرنے والا باہر نکلے گا تو ہر جگہ مقبول و منظورِ نظر ہوگا، اور ہر شخص بے اختیار اس کا گرویدہ ہو جائے گا۔ اپنی ذات میں غوطہ مارنا وہی ہے جسے "بال جبریل" میں یوں کہا: اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی۔

۸- زندگی کا بھید یہ ہے کہ اوپر راکھ پڑی ہوئی ہو تو نیچے بیٹھ کر چنگاریاں جمع کرتے رہنا، پھر یکا یک آگ بن کر بھڑکنا اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو جلا دینا۔

یہ مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی تھی جب ہندوستان کے مسلمان مظلومی کی بے چارگی میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ انھیں تلقین یہ فرمائی کہ بے شک حالات ناساز گار ہیں، لیکن اصل مقصد نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے۔ چُپ چاپ قوّت فراہم کرتے جاؤ۔ جب اس قابل ہو جاؤ کہ بندھن توڑ سکو تو ایک دم اٹھو اور آزادی حاصل کر لو۔

۹۔ تُو لمبی مدت سے محنت و مشقت میں لگا ہُوا ہے، اب اُسے ختم کر۔ اپنے گرد چکّر لگا اور چکّر لگانے والی آگ بن جا۔

۱۰۔ زندگی کیا ہے؟ یہ ہے کہ دوسرے کے گرد چکّر لگانے سے نجات حاصل کرے اور اپنے آپ کو کعبہ سمجھے تاکہ دوسرے تیرے ارد گرد چکّر لگائیں۔

اس سے مراد یہ نہیں کہ انسان واقعی اپنے آپ کو کعبہ قرار دے لے، مراد یہ ہے کہ دوسروں کے پیچھے نہ پھرے بلکہ اپنے عزم اور حُسنِ عمل سے ایسی کیفیت پیدا کرے کہ دوسروں کو اُس کے پیچھے پھرنے کی رغبت ہو۔

۱۱۔ پر کھول اور زمین کی کشش سے آزادی حاصل کرے۔ پرندے کی طرح بلندی پر اُڑ اور گر جانے کا ڈر دل سے نکال دے۔

۱۲۔ اے عقل مند! تُو اگر پرندہ نہیں اور اُڑ نہیں سکتا تو پھر غار میں گھونسلا نہ بنا کیونکہ اگر اُڑ نہ سکے گا تو غار میں گر جائے گا۔

۱۳، ۱۴۔ تُو علم حاصل کر رہا ہے، میں تجھے پیرِ رومؒ کا پیغام سناتا ہوں۔ اگر تُو علم کو تن پروری کے لیے استعمال کرے گا تو جان لے کہ علم تجھے سانپ بن کر ڈستا رہے گا، لیکن اگر اسے دل کی درستی اور نفس کی اصلاح کے لیے استعمال کرے گا تو یہ نہایت اچھا رفیق ثابت ہوگا۔

مراد یہ کہ علم کا مقصود دنیوی سر و سامان یا جاہ و منصب نہیں، صرف قلب و روح اور فکر و نظر کی ترقی ہے۔

رومیؒ اور تبریزیؒ

اخوند۔ استاد۔

حلب۔ شام کا ایک مشہور شہر جہاں مولانا رومؒ نے تعلیم حاصل بھی کی اور تعلیم دیتے بھی رہے۔

توجیہات۔ توجیہ کی جمع۔ توجیہ بمعنی وجہ بیان کرنا۔ دلائل۔

تشکّک۔ لغوی معنی شک میں پڑنا، شک کرنا۔ اصطلاحاً فلسفے کا ایک دبستان، جس کا اصول یہ تھا کہ صرف عقل کی بنا پر حقائقِ اشیا کا یقینی علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اشراق۔ لغوی معنی روشن ہونا۔ اصطلاح میں فلسفہ و تصوّف کے اُس مجموعے کو کہتے ہیں، جس کی ابتدا افلاطون سے ہوئی تو فلاطونیوں نے اسے زیادہ واضح شکل دے دی۔ مسلمان حکماء میں شیخ شہاب الدین مقتول اس کے بہت بڑے جامع اور شارح تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے علماء کے فتوے کے مطابق شیخ کو قتل کرا دیا تھا۔ یہ دبستان اس امر کا قائل تھا کہ معرفت کا مقام غور و فکر، مراقبے اور وجدان کے ذریعے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حِکَم۔ حکمت کی جمع۔ حکمتیں۔

مشائین۔ فلسفیوں کا ایک گروہ جو ارسطو کا پیرو تھا۔ یہ لوگ چل پھر کر درس دیا کرتے تھے، اس لیے مشائین

یعنی چلنے پھرنے والے مشہور ہوئے۔

پیر تبریز۔ شیخ شمس الدین، جو تبریز سے منسوب تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کیا بزرگ کے خاندان سے تھے جو باطنیوں کا امام تھا اور انھوں نے آبائی مذہب ترک کر کے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد بابا کمال الدین جندی سے بیعت کی۔ سوداگروں کی وضع میں پھرتے رہتے تھے لیکن تجارت نہیں کرتے تھے۔ جہاں جاتے، سرائے میں ٹھہر جاتے۔ حجرہ بند کر کے مراقبے میں مصروف ہو جاتے۔ معاش کے لیے ازار بند بُن کر بیچ لیتے۔

کمال۔ بابا کمال الدین جندی جو شیخ شمس تبریزی کے مرشد تھے۔

قیاس۔ منطق کی اصطلاح میں دو قضیوں کو ترتیب دے کر نتیجہ نکالنا۔

وہم۔ معنیٔ جزئیہ کا ادراک۔

مقالات۔ مقالہ کی جمع۔ لغوی معنی کہی ہوئی بات، مراد ہے اقوال۔

ادراک۔ پا جانا۔ پا جانے کی صلاحیت۔ عقل و فہم۔ دریافت۔

کیمیائے احمر۔ سرخ گندھک، جو کیمیا کا جزوِ اعظم ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ اس سے تانبا، سونا بن جاتا ہے۔

تگرگ۔ اولا۔

آفل۔ چھپ جانے والا۔ ڈوب جانے والا۔ زائل ہو جانے والا، یعنی خدا کے سوا ہر شے۔

پیر روم۔ یہاں مولانا رومؒ کے حالات اختصاراً بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے:

محمد نام، جلال الدین، مولانا رومؒ اور پیر روم القاب۔ اصل وطن بلخ تھا۔ ۶۰۴ھ (۱۲۰۷ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا بہاء الدین بہت بڑے عالم اور بزرگ تھے اور رشتے میں سلطان محمد خوارزم شاہ کے بھانجے تھے۔ عقیدت مندوں کی کثرت کے باعث مولانا بہاء الدین کے متعلق سلطان کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے۔ مولانا نے وطن چھوڑ دیا۔ پہلے بغداد پہنچے، پھر حجاز اور شام ہوتے ہوئے قونیہ پہنچ کر مقیم ہو گئے۔

مولانا رومؒ نے ابتدائی تعلیم والد سے پائی۔ ان کے انتقال کے بعد حلب میں تکمیل علوم کی اور کچھ مدت تک درس بھی دیا۔ پھر قونیہ واپس گئے تو اس ٹھاٹھ سے درس شروع کیا کہ وقت کے بلند پایہ علماء میں شمار ہونے لگے لیکن طبیعت پر ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا۔ شیخ شمس تبریزی کی صحبت نے مولانا کی طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اُس وقت سے زندگی کی ہر چیز بدل گئی۔ ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) میں غروبِ آفتاب کے وقت وفات پائی۔ دسمبر کی سترھویں تاریخ تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ قونیہ میں آپ کا مزار مرجعِ عوام ہے۔ آپ سے رقص کرنے والے صوفیوں کا فرقہ مولویہ چلا۔

۱۔ کیا تو رومؒ کے مشہور استاد کی کہانی سے آگاہ ہے جو شام کے شہر حلب میں علوم کا درس دیا کرتے تھے؟

۲۔ اُن کی حالت یہ تھی کہ عقلی دلائل کی زنجیر پاؤں میں پڑی ہوئی تھی اور ان کی کشتی عقل کے اندھیرے میں طوفان کے

بھیڑیے کھا رہی تھی۔

۳۔ اگر انھیں موسیٰؑ فرض کر لیا جائے تو وہ ایسے موسیٰ تھے جنھوں نے عشق کے کوہِ سینا سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ عشق اور اُس کے جنوں سے بالکل ناواقف تھے۔

مطلب یہ کہ ظاہری علوم میں تو اونچا پایہ حاصل کر لیا لیکن عشق کی اُن پر پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی۔

۴۔ وہ درس دیتے تھے تو فلسفے کے مختلف دبستانوں کی تشریح میں لگے رہتے تھے۔ کبھی تشکک کی حقیقت بیان کرتے اور کبھی اشراک پر لکچر دیتے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ جس حد تک ظاہر علوم کا تعلق ہے، وہ جب تقریر کرتے تو حکمت اور دانائی کے موتی پروتے؛

۵۔ وہ پیروانِ ارسطو کے اقوال کی گتھیاں سلجھاتے اور خدا نے ان کے دماغ کو ایسی روشنی عطا کر رکھی تھی کہ ہر پوشیدہ اور مشکل نکتہ ان کے بیان سے روشن ہو جاتا؛

۶۔ اُن کے ارد گرد کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا اور ان کی زبان کتابوں ہی کے اسرار بیان کرتی رہتی؛

۷۔ یہ کیفیت تھی، جب باباکمال الدین جندی نے اپنے مریدِ باصفا شیخ شمس تبریزی کو حکم دیا اور اس کے مطابق پیرِ تبریزی مولانا رومؒ کی درس گاہ میں پہنچ گئے؛

۸۔ جاتے ہی پوچھا کہ یہ کیا غوغا اور کیا قیل و قال ہے؟ قیاس، وہم اور استدلال کا مطلب کیا ہے؟

۹۔ مولانا نے یہ سوال سنتے ہی فرمایا: "او ناواقف آدمی! چپ رہ۔ عقلمندوں کی بات پر ہنسنا ہرگز زیبا نہیں؛

۱۰۔ بہتر یہ ہے کہ میری درس گاہ سے فوراً نکل جا۔ یہ قیل و قال ہے، تجھے اس سے کیا مطلب؟

۱۱۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں، وہ تیری سمجھ سے بہت اونچا ہے۔ ہماری باتوں سے ادراک کا شیشہ جلا پاتا ہے"؛

۱۲۔ مولانا کی زبان سے یہ سنتے ہی پیر تبریزی کا سوزِ عشق بہت تیز ہو گیا۔ انھوں نے اپنے باطن سے ایک آگ نکالی؛

۱۳۔ ساتھ ہی اُن کی نگاہ بجلی بن کر زمین پر گری اور ان کے سانس کی جلن کے باعث مٹی سے شعلے بھڑکنے لگے؛

۱۴۔ اُن کے دل سے جو آگ نکلی تھی، اس نے مولانا کے فہم و ادراک کا خرمن جلا دیا اور ان کے دفترِ فلسفہ کو بھسم کر دیا؛

۱۵۔ مولانا رومؒ عشق کی کرامتوں سے بالکل ناواقف تھے اور انھوں نے اس ساز کے نغمے کبھی نہیں سُنے تھے؛

۱۶۔ حیران ہو کر بولے، تُو نے یہ آگ کیونکر روشن کی جس سے حکمت و فلسفہ کی تمام کتابیں یک قلم جل اٹھیں؟

۱۷۔ پیرِ تبریزی نے فرمایا کہ تُو مسلمان تو ہے مگر ایسا جس نے ابھی تک زنار ڈال رکھا ہے۔ یہ ذوق و حال کی باتیں ہیں، تجھے ان سے کیا سروکار؟

۱۸۔ ہم پر جو حالت وارد ہوئی، وہ تیری سمجھ سے بہت اونچی ہے۔ ہمارے اندر سے جو شعلہ نکلا وہ شررِ گندھک ہے جو تانبے کو سونا بنا دیتی ہے؛

۱۹۔ تیری کیفیت کیا رہی؟ تو حکمت اور فلسفے کی برف لے کر طرح طرح کا سامان تیار کرتا تھا اور تیری فکر کے بادل سے اولے برستے تھے ؛

۲۰۔ اب اس حالت کو چھوڑ، اپنے خس و خاشاک سے آگ پیدا کر اور اپنی خاک سے شعلے بنا۔

۲۱۔ یاد رکھ، مسلمان کا علم دل کے سوز سے درجۂ کمال پر پہنچتا ہے۔ اسلام کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہر اس شے سے بے تعلق ہو جائے جو ڈوب جانے والی اور زائل ہو جانے والی ہے ؛

۲۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا معاملہ پیشِ نظر لا۔ وہ جس وقت ڈوبنے والوں اور زائل ہو جانے والوں کی بندش سے آزاد ہوئے تو بے تکلف بھڑکتی ہوئی آگ میں بیٹھ گئے اور شعلے انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے ؛

رومی اور تبریزی کی ملاقات اقبالؔ نے رومی اور تبریزی کی ملاقات کے متعلق جو حکایت بیان فرمائی اہل علم کے نزدیک وہ محلِ نظر ہے۔ ۔ ۔ ۔ مولانا شبلی نے اپنی کتاب "مولانا روم" میں اس سلسلے کی تین روایتیں لکھی ہیں۔

۱۔ ایک روز مولانا گھر میں تھے۔ شاگرد آس پاس بیٹھے تھے۔ چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس وقت شمس تبریزی آئے۔ کتابوں کی طرف اشارہ کر کے مولانا سے پوچھا: "یہ کیا ہے؟" مولانا نے جواب دیا: "یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے۔" یہ کہنا تھا کہ کتابوں میں آگ لگ گئی۔ اب مولانا نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟" شمس نے جواب دیا: "یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے" اور یہ کہہ کر چل دیے۔ یہی حکایت اقبالؔ نے بیان کی ہے ؛

۲۔ شمس تبریزی بابا کمالؔ کے حکم سے قونیہ پہنچے تو شکر فروشوں کی سرائے میں اترے۔ ایک روز مولانا کی سواری بڑی شان سے نکلی تو شمسؔ نے سرِ راہ ٹوک کر پوچھا کہ مجاہدے اور ریاضت سے کیا مقصد ہے؟ مولانا نے جواب دیا: "اتباعِ شریعت" شمسؔ نے فرمایا: "یہ تو سب جانتے ہیں۔ علم کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو منزل تک پہنچا دے۔" ساتھ ہی سنائی کا یہ شعر پڑھا:

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار

۳۔ مولانا ایک حوض کے کنارے بیٹھے تھے۔ سامنے کچھ کتابیں دھری تھیں۔ شمسؔ نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟" مولانا نے کہا: "یہ قیل و قال ہے، تمھیں اس سے کیا غرض؟" شمسؔ نے کتابیں حوض میں پھینک دیں۔ مولانا کو نہایت رنج ہوا اور کہا تم نے ایسی چیزیں ضائع کر دیں جو کہیں نہیں مل سکتیں۔ شمسؔ نے ہاتھ حوض میں ڈالا اور تمام کتابیں نکال کر کنارے پر رکھ دیں اور وہ سب خشک تھیں۔ مولانا سخت حیران ہوئے اور پوچھا: "یہ کیونکر ہوا؟" شمسؔ نے کہا: "یہ علم حال کی باتیں ہیں، تم اسے کیا جانو؟" اقبالؔ نے ایک جزو اس حکایت کا بھی اپنے بیان

میں شامل کر لیا۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ روایتیں مستند کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔ اصل واقعہ اتنا ہے کہ شمس رات کے وقت قونیہ پہنچے۔ برنج فروشوں کی سرائے میں اترے۔ سرائے کے دروازے پر ایک بلند چبوترا تھا، جس پر اکثر امراء و عمائد تفریح کی غرض سے آ بیٹھتے تھے۔ شمس بھی وہاں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز مولانا کو شمس کے آنے کا حال معلوم ہوا تو ان کی ملاقات کو نکلے۔ راستے میں لوگ قدم بوس ہوتے جاتے تھے۔ اسی شان سے سرائے کے دروازے پر پہنچے تو شمس کو اندازہ ہو گیا، یہی شخص ہے جس کے لیے قونیہ پہنچنے کا اشارہ ہوا ہے۔ مولانا سے پوچھا کہ بایزید بسطامی کے متعلق دو روایتیں ہیں، ان میں تطبیق کیونکر ہو گی؛ ایک طرف تو یہ حال تھا کہ عمر بھر خربوزہ نہ کھایا کیونکہ معلوم نہ تھا، رسول اللہ صلعم نے تناول فرمایا یا نہ فرمایا اور فرمایا تو کس طرح؛ دوسری طرف وہ اپنے متعلق کہتے ہیں۔ سبحانی ما اعظم شانی (میں پاک ہوں! میری شان کس قدر بڑی ہے) حالانکہ رسول اللہ صلعم جلالتِ شان کے باوجود فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔ مولانا نے جواب دیا کہ اگرچہ بایزید بڑے پایے کے بزرگ تھے، لیکن مقامِ ولایت میں ایک خاص درجے پر ٹھہر گئے تھے اور وہ اپنے درجے کی بلندی کے اثر سے ایسے الفاظ کہہ گئے۔ اس کے خلاف رسول اللہ صلعم منازلِ تقرب میں برابر ایک درجے سے دوسرے درجے کی طرف بڑھے چلے جاتے تھے۔ جب بلند پایے پر پہنچتے۔ تو پہلا پایہ پست نظر آتا اور اس سے استغفار کرتے۔

بس یہ ملاقات گہرے ربط و تعلق کا سبب بن گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے وہ واقعہ لے لیا جو "جواہرِ مضیہ" میں منقول تھا اور "جواہر" حنفی علماء کے حالات میں بڑی مستند کتاب ہے، لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔

اقبال کا نقطۂ نگاہ یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ شاعر جو حکایتیں بیان کرتا ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے درست ہوں اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے ان پر اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ وہ جس واقعے کو پیشِ نظر مطالب کے لیے موزوں سمجھتا ہے، لے لیتا ہے۔ اس میں کچھ تغیر بھی کرنا پڑے تو بے تکلف کر لیتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ حضرت علامہ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ نے اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق جو حکایت یعنی حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر بیان کی ہے، وہ کسی تاریخی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ عالمگیر کی بہادری و جوانمردی کے مستند واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں۔ مثلاً چودہ سال کی عمر میں ہاتھی سے لڑا تھا، جنگ بلخ کے وقت تیروں کی بارش میں نماز۔ آپ نے ایسے واقعات چھوڑ دیے اور ایک غیر مستند واقعہ لے لیا۔ فرمایا! مجھے اس سے کیا غرض کہ واقعہ تاریخی اعتبار سے درست ہے یا نہیں۔ میں تاریخ نہیں لکھ رہا، ایک خاص تعلیم پیش کر رہا ہوں۔ جو کچھ مجھے مناسب نظر آیا، اختیار کر لیا۔ اگر دوسرے لوگ تحقیق کے بغیر اسے تاریخی اعتبار سے صحیح سمجھنے کی کوشش

کرتے ہیں تو ذمہ دار وہ ہیں نہ کہ میں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا، کہ جب آپ کسی واقعے کے لیے تاریخی نام استعمال کرتے ہیں تو پڑھنے والوں کو یقیناً غلط فہمی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے یہ ہر حال چھان بین کے بعد ہی یہ لکھا ہوگا۔ فرمایا یہ بھی ان کے فہم کا قصور ہے۔ میں تاریخ نہیں لکھ رہا، تعلیم پیش کر رہا ہوں۔ اگر تاریخ نگاری کا مدعی ہوتا تو یقیناً مستوجب الزام ٹھہرتا۔

علم و عشق | قفا۔ لغوی معنی، گردن کا پچھلا حصہ، مجازاً، پیچھے۔ عقب۔

طوبیٰ۔ بہشت کا ایک درخت، جس کی شاخیں ہر جنتی کے گھر میں پہنچی ہوں گی اور ان میں قسم قسم کے میوے لگے ہوئے ہوں گے۔ خوشبوئیں بھی آئیں گی۔

دانشِ حاضر۔ موجودہ زمانے کے علوم و فنون۔

حجابِ اکبر۔ سب سے بڑا پردہ۔

مظاہر۔ مظہر کی جمع۔ لغوی معنی ظاہر ہونے کی جگہ، مقصود ہے تمام وہ اشیاء جو نظر آتی ہیں۔

صراط۔ راستہ۔

ساجد و مسجود۔ ساجد، سجدہ کرنے والا۔ مسجود، جسے سجدہ کیا جائے۔

۱۔ تُو نے وہ علم پسِ پُشت ڈال دیا، جو حق تک پہنچانے والا تھا اور روٹی کے لیے تُو نے دین کی پونجی ہار دی۔
مطلب یہ کہ وہ علم پڑھا، جس سے ملازمت مل جائے اور اُس علم سے کوئی سروکار نہ رکھا جو انسانیت کی راہ میں تیرا صحیح رہبر ہو سکتا تھا۔

۲۔ تُو سرمے کی تلاش میں تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑتا پھرا۔ یہ خیال نہ کیا کہ تیری آنکھیں خود سیاہ ہیں، جو سرمے کی محتاج نہیں ہو سکتیں۔ یعنی تو ایسی دولت و ثروت کا مالک ہے، جس سے بڑی دولت کوئی نہیں ہو سکتی۔ اپنی حالت سے بے خبری کے باعث یہ دولت نظر انداز کیے بیٹھا ہے۔ دوسروں کے پیچھے دوڑا پھرتا ہے کہ کچھ مل جائے تو دولت مندوں میں شمار ہونے لگے۔

۳، ۴، ۵۔ ان تین شعروں میں عجیب طریق پر دورِ حاضر کے علوم کی حقیقی حیثیت واضح کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں: کیا تلوار کی دھار سے کسی نے آبِ حیات طلب کیا ہے؟ تلوار کی دھار تو گردنیں کاٹتی ہے، اس سے کون زندگی طلب کرے گا؟ اسی طرح کیا اژدہے کے مُنہ سے کبھی کسی کو کوثر حاصل کرنے کی اُمید ہوئی ہے؟ کیا سنگِ اسود، جو حرمِ پاک کی زینت ہے، بُت خانے سے مل سکتا ہے؟ کیا پاگل کتّے سے کسی نے نافۂ مُشک نکالا ہے؟ ایسی بدیہی ناممکن باتیں ممکن ہو سکتی ہیں یعنی تلوار کی دھار سے آبِ حیواں، اژدہے کے مُنہ سے کوثر، بُت خانے کے دروازے سے سنگِ اسود اور پاگل کتّے سے نافۂ مشک حاصل کرنا چاہے تو ممکن ہے، مل جائے،

مگر یہ ممکن نہیں کہ دورِ حاضر کے علوم و فنون سے تجھے عشق کا سوز اور محبت کی تپش مل جائے۔ یہ علوم و فنون ایسے کافر ہیں کہ شراب کا جو پیالہ لیے بیٹھے ہیں، اس میں حق کا سرور اور عشقِ حق کا نشہ ہو ہی نہیں سکتا۔

۶، ۷، ۸ - ذاتی تجربات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں مدت تک سعی و کوشش اور تگ و دو میں لگا رہا۔ موجودہ علوم و فنون کے تمام بھید میں جانتا ہوں۔ جو لوگ ان علوم و فنون کے استاد تھے، وہ سب میرا امتحان لے چکے اور انھوں نے مجھے اس باغ کی ہر چیز سے آگاہ کر دیا۔ میں سوا اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ باغ نہیں، عبرت کا لالہ زار ہے۔ تم نے کاغذ کے بنے ہوئے پھول دیکھے ہوں گے۔ کیا ان میں خوشبو ہوتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ انھیں خوشبو کا سراب کہنا چاہیے یعنی ان علوم و فنون کے پاس ایسی امیدیں ہیں کہ جاؤ گے تو کوئی بھی پوری نہ ہو گی۔ ان کی ظاہری رنگت بڑی دلکش نظر آئے گی، لیکن ان کے اندر عبرت کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ کاغذی پھولوں کی طرح یہ خوشنما بہت ہیں لیکن خوشبو سے خالی ہیں۔

۹ - میں نے جب سے اس باغ کے ساتھ تعلق کا رشتہ توڑ لیا ہے اور آزاد ہو چکا ہوں، اپنا گھونسلا طوبیٰ کی شاخ پر بنا لیا ہے؛ جہاں قسم قسم کے پاکیزہ پھل کھاتا ہوں اور پاکیزہ خوشبوؤں سے میرا دماغ معطر رہتا ہے:

۱۰ - یقین جانو کہ موجودہ زمانے کے علوم و فنون ذہن و دماغ اور قلب و روح کے لیے بہت بڑا پردہ ہیں۔ یہ پردہ ہر روشنی کو روک لیتا ہے اور انسان کے تمام خداداد جوہر زنگ خوردہ ہو جاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کی حقیقت کیا ہے؟ یوں سمجھ لو کہ بُت بیچے جاتے ہیں اور بتوں کی پوجا ہوتی ہے، بہر حال یہ حقیقت سے دُور رکھتے ہیں۔

۱۱ - ان علوم و فنون کو حجاب اکبر کیوں کہا گیا؟ کیونکہ یہ اپنے پاؤں جکڑ کر مادیت کے قید خانے میں بیٹھ گئے اور محسوسات کی حدوں سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔

۱۲ - یہ زندگی کے راستے پر چلنے سے محروم ہو گئے اور انھوں نے اپنی گردن پر تلوار رکھ لی۔

۱۳ - ان میں جو آگ ہے، وہ لالے کے پھول کی طرح سرد ہے، یعنی اس میں عشق کی تپش، حرارت اور سوز بالکل نہیں مل سکتا۔ ظاہر ہے کہ جو آگ سرد ہو، وہ اپنا اصل جوہر کھو بیٹھتی ہے۔ جس کا شعلہ لالے کی طرح ٹھنڈا ہو اسے کون آگ سمجھنے کے لیے تیار ہو گا۔

چونکہ لالے کا رنگ بہت سرخ ہوتا ہے، اس لیے شاعر اسے آگ سے تشبیہ دیتے ہیں، لیکن یہ سرخی صرف دیکھنے تک محدود ہوتی ہے اور اس آگ سے کوئی جل نہیں سکتا، لہٰذا اسے ٹھنڈی آگ کہا۔

۱۴ - ان علوم و فنون کی فطرت عشق کے سوز سے آزاد رہی یعنی انھیں عشق کا سوز نہ ملا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں تلاش و تجسس کی دنیا میں خوشی نصیب نہ ہو سکی۔ انسان کے لیے وہی تلاش شادمانی کا سرمایہ ہوتی ہے، جو مراد تک پہنچا دے۔ چونکہ دورِ حاضر کے علوم و فنون یہ نہیں کر سکتے، اس لیے وہ شادمانی کا ذریعہ بھی نہیں ہو سکتے۔

۱۵- موجودہ دور کے علوم و فنون کو سوزِ عشق سے خالی قرار دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ عشق ہی وہ افلاطون حکیم ہے، جو عقل کی تمام بیماریوں کا علاج کر سکتا ہے۔ عشق کا نشتر چلے تو عقل کا سودادی مادہ فوراً نکل جاتا ہے:

۱۶- ساری دنیا عشق کے روبرو سجدے کر رہی ہے اور وہی سب کی سجدہ گاہ ہے۔ اگر عقل کو سومنات فرض کر لیا لیا جائے تو اسے عشق ہی کا محمود مسخّر کر سکتا ہے، جس طرح سومنات کو محمود نے مسخر کیا تھا۔

۱۷- دورِ حاضر کے علوم و فنون کی صراحی میں عشق کی شراب موجود نہیں۔ راتیں وہی خوشگوار ہیں، جن میں یَا رب کی صدائیں اٹھتی رہیں۔ دورِ حاضر کے علوم و فنون کی اندھیری راتیں یارب کے شور سے بالکل بے نصیب ہیں:

عشق و عقل کے باب میں اقبال نے یہاں صرف اشارے کیے ہیں، لیکن ان کا مقصود اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ عشق سے مقصود عشقِ حق ہے، جس میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن پر حق کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ خلقِ خدا کی محبت بھی اسی عشق کا ایک جزو ہے۔ جس پہلو میں خلقِ خدا کی خدمت کا جذبہ نہ ہوگا، اسے یقیناً کاغذ کا وہ پھول سمجھنا چاہیے، جو خوشبو سے خالی ہوتا ہے۔ عشق کبھی یہ نہیں سوچتا کہ خدمت ذاتی نفع کے لیے کی جاتی ہے۔ وہ صرف خدمت بجا لاتا ہے اس لیے کہ خدمت ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس عقل ہر معاملے کو ذاتی نفع کے نقطۂ خیال سے دیکھے گی اور ذاتی نفع و نقصان میں الجھنے والے دل و دماغ خدمت انجام دے ہی نہیں سکتے۔ اقبال یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ موجودہ علوم و فنون تمھیں آذر جو چاہیں، سکھا دیں، لیکن عشق کا سوز پیدا نہیں کر سکتے، جو انسانیت کا عزیز ترین جوہر ہے:

ملّت سے خطاب

بیاض - سفیدی۔

سخرہ - تمسخر۔ ہنسی۔ مذاق۔ وہ شخص جس کی ہنسی اُڑائی جائے۔

۱- اے مسلمان! تُو نے اپنے شمشاد کی قدر و قیمت نہ پہچانی، جو سب سے بلند تھا اور دوسروں کے سرو کو تو اونچا ماننے لگا، حالانکہ وہ تیرے شمشاد سے اونچا نہ تھا۔

۲- تُو نے بانسری کی طرح اپنی ذات کو اپنے آپ سے خالی کر دیا یعنی خودی سے محروم ہوگیا اور دوسروں کے ترانے پر دل جما دیا:

۳- آہ! تُو دوسروں کے دسترخوان سے ٹکڑوں کی بھیک مانگتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی افسوس کا کوئی مقام ہو سکتا ہے کہ اپنی جنس غیروں کی دکان سے خریدنے کا آرزومند ہے؟

۴- افسوس کہ مسلمان کی مجلس غیروں کے چراغ سے جل بُجھی اور اس کی مسجد کو بُت خانے کی چنگاری نے راکھ کا ڈھیر بنا دیا:

۵- ہرن جب تک حرم کے حدود میں تھا، کوئی اسے نقصان پہنچانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، جب وہ حرم کی حدوں سے باہر ہوا تو شکاری کے تیر نے اس کا پہلو چیر کر رکھ دیا:

مثال کتنی اچھی دی۔ شعر کا مقصود یہ ہے کہ جب تک مسلمان اسلامی احکام پر کاربند رہا یعنی جب تک وہ حدّ حرم کے اندر تھا، اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ جب وہ راہِ اسلام سے منحرف ہوا اور حدّ حرم سے باہر چلا گیا تو جو شکاری مدت سے انتظار میں بیٹھے تھے، انھوں نے ہر طرف سے تیر چلانے شروع کیے اور مسلمان بے بس ہو کر رہ گیا۔ گویا اُس پر جتنی مصیبتیں آئیں اور اُسے جتنے نقصان پہنچے، وہ حدّ حرم سے باہر آنے یعنی اسلام سے برگشتہ ہونے کی پاداش تھے۔

۶- پھول کی پنکھڑیاں اُسی طرح بکھر گئیں، جس طرح اس کی خوشبو بکھرتی ہے۔ اے اپنی ذات سے بھاگے ہوئے! پھر اپنی طرف لوٹ آ۔

۷- اے مسلمان! تو قرآن مجید کی حکمت کا امانت دار ہے۔ جس وحدت کو کھو بیٹھا ہے، اُسے پھر حاصل کرنے کی کوشش کر۔ اوّل قرآن مجید کی حکمت کا درس یہی ہے۔ دوسرے جب تک تمام مسلمان متحد نہ ہوں گے، اس امانت کا حق ادا نہیں کر سکتے، جو حکمت قرآن کی شکل میں ان کے سپرد ہوئی۔

۸- کیا کبھی اس پر غور کیا کہ ہمارا مقام اور منصب کیا ہے؟ ہم ملّت کے قلعے کے لیے محافظ و پاسبان مقرر ہوئے تھے۔ ہم نے قومی شعار اور شیوہ ترک کر دیا، اس لیے ایمان سے محروم ہو گئے تو ملّت کی پاسبانی کا فرض کیونکر ادا کر سکتے ہیں؟

۹- قدیم ساقی کا پیالہ ٹوٹ گیا اور شراب حجاز کے مستوں کی محفل درہم برہم ہو گئی۔

۱۰- ہم نے قسم قسم کے جو بُت بنائے تھے، اُن سے کعبے کو بھر دیا۔ ہمارے اسلام کی حالت اتنی خراب ہے کہ کفر بھی اس کی ہنسی اُڑا رہا ہے اور یہ ہنسی کچھ بیجا بھی نہیں۔

۱۱- ہمارے مذہبی پیشواؤں کی حالت کیا ہے؟ وہ بتوں کے عشق میں اسلام ہار بیٹھے اور انھوں نے برہمنوں اور گبروں سے زنّار لے کر اپنی تسبیح کے لیے دھاگا مہیا کیا، یعنی اُن کی اسلامیت غیروں کے شعائر و عقائد سے داغدار ہے۔

۱۲- پیروں کی کیا کیفیت ہے؟ یہ سمجھنا چاہیے کہ بال سفید ہو جانے کے باعث پیر کہلاتے ہیں اور ان کی علمی و عملی حالت یہ ہے کہ گلی کوچوں کے لونڈے ان کا مذاق اُڑاتے ہیں:

۱۳- اُن کے دل کلمۂ توحید کے نقش سے بالکل اجنبی ہو گئے یعنی اُس نقش کا نشان تک باقی نہ رہا اور ہوا و ہوس کے بُت اُن کے دل میں اس قدر بس گئے کہ انھوں نے بُت خانوں کی حیثیت اختیار کر لی۔

۱۴- جو شخص بال بڑھا لیتا ہے، وہ گدڑی پہن کر صوفی بن جاتا ہے۔ افسوس! یہ سب لوگ سوداگر ہیں جو جا بجا دین

بیچ رہے ہیں:

۱۵- مریدوں کے گروہ ساتھ لے کر فتوح کی حرص میں شہر بہ شہر اور دہ بہ دہ چکر لگاتے رہتے ہیں۔ انھیں ملک و قوم کی حقیقی ضرورتوں سے ہرگز واقفیت نہیں۔

۱۶- اُن کی آنکھیں دیکھو تو نرگس کی آنکھوں کی طرح بے نور ہیں۔ سینے دل کی دولت سے خالی ہیں۔ یعنی نہ انھیں جسمانی صحت میسر ہے، نہ روحانی دولت۔

۱۷- واعظ ہوں یا صوفی، سب منصب کے پجاری بن گئے۔ ملّت بیضا کی عزت و حرمت جاتی رہی۔

۱۸- ہمارے واعظوں کی آنکھیں بت خانوں پر جمی ہوئی ہیں اور ہمارے دینِ روشن کا مفتی فتوے بیچ رہا ہے۔

۱۹- دوستو! ہمارے پیر و مرشد نے تو شراب خانے کا رُخ کر لیا ہے یعنی وہ راہِ راست سے پھر گیا ہے، ہم جو اس کے ارادتمند اور پیرو ہیں، سوچو اور بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

اٹھارھواں باب

وقت تلوار ہے

تمہید اقبالؒ نے الوقت سیفٌ کا مقولہ امام شافعیؒ سے منسوب کیا ہے۔ میں نے مختلف ذرائع سے اس باب میں سراغ لگانے کی کوشش کی، مگر کچھ پتا نہ چل سکا کہ امام موصوف نے یہ کب اور کس موقع پر فرمایا اور یہ مقولہ ان کی کون سی کتاب میں درج ہے۔ مولانا رومؒ نے مثنوی کے پہلے دفتر کے آغاز میں یہ مقولہ نظم کیا ہے:

گفت اطعمنی فانی جائعٌ　　فاعتجل فالوقت سیفٌ قاطعٌ

مجھے کھانا کھلاؤ کیونکہ میں بھوکا ہوں اور جلدی کرو کیونکہ وقت کاٹنے والی تلوار کی طرح ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں الوقت سیفٌ کا وہ مفہوم ہرگز پیشِ نظر نہیں رکھا گیا، جسے اقبالؒ نے شعر کا لباس پہنایا اور مجھے یقین ہے کہ اگر یہ مقولہ واقعی امام شافعیؒ کا ہے تو غالباً خود ان کے پیشِ نظر بھی وہ مفہوم نہ ہوگا جو اقبالؒ نے اختیار کیا۔

اقبالؒ نے اس معاملے کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کے باب میں قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ وقت و زمان پر خطباتِ مدراس میں بھی بحث کی گئی ہے، خصوصاً تیسرے خطبے میں، جس کا عنوان ہے:

"ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقتِ دعا" یہاں چند باتیں عرض کر دینا کافی ہے جو اشعار کے سمجھنے میں ایک حد تک معاون ثابت ہوں گی۔ باقی رہا اصل مسئلہ تو اس پر مفصّل بحث نہ یہاں ہو سکتی ہے اور نہ یہ معاملہ زیادہ سے زیادہ تفصیلات کے باوجود پوری طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ زمان ایک تخلیقی حرکت ہے۔ ایک تلوار ہے جو مزاحمتوں کو کاٹتی ہوئی اپنا راستہ بناتی چلی جاتی ہے۔

۲۔ زمان یا وقت ایک ارتقائی اور اخلاقی قوت ہے، جس نے مختلف اوقات میں مختلف افراد کی شکل اختیار کی اور وہ کارنامے انجام دیے جو اب تک دنیا میں تخلیق و اخلاق کا سب سے بڑا معیار ہیں۔

۳۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے قول کے مطابق اقبالؔ مسئلۂ زمان کو اس لیے اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے ہاں عبد اور حُر، پابند اور آزاد کی تمیز کا معیار یہی ہے۔ کوئی روح ایام کی زنجیر میں مقیّد ہے یا اس زنجیر سے آزاد ہو کر زمانِ حقیقی میں غوطہ لگاتی ہے اور تسخیر مسلسل نیز خلاّقی میں مصروف رہتی ہے۔

۴۔ جس انسان کے ہاتھ میں زمانے کی تلوار ہو، وہی زندگی کے ممکنات کو نمایاں کر سکتا ہے۔ عبد یا پابندِ زمانے سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ حُر یا آزاد زمانے سے جنگ آزمائی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

۵۔ زمان کی دو صورتیں ہیں، ایک زمانِ حقیقی یا زمانِ محض، جس میں نہ ماضی ہے، نہ حال ہے، نہ مستقبل ہے۔ نہ اس میں مرور ہے، نہ تسلسل۔ دوسری صورت وہ ہے، جسے زمانِ مسلسل کہنا چاہیے یعنی جو مختلف لمحوں سے مرکب ہو، جس طرحِ مکان کا تصور ہم نقطوں کی بنا پر کرتے ہیں یعنی ایک نقطے کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، تیسرے کے بعد چوتھا، اسی طرح زمان کا تصور لمحوں کی بنا پر کر سکتے ہیں۔ مکان کی اکائی نقطہ ہے اور زمان کی اکائی لمحہ۔ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ زمان کو مکان کی طرح پھیلی ہوئی چیز قرار دینا ٹھیک نہیں۔ اس طرح زمان کی حقیقی حیثیت زائل ہو جاتی ہے۔ نہ زمان کو ایک خط کی طرح سمجھنا چاہیے۔ امید ہے یہ اشارے ایک حد تک فہمِ اشعار میں معاون بن سکیں گے۔

الوقت سیفٌ | الوقت سیفٌ۔ وقت تلوار ہے

دریائے احمر۔ یہاں دریا سے مراد سمندر ہے اور جس سمندر کا ذکر ہے، اسے بحیرۂ احمر بھی کہتے ہیں اور بحیرۂ قلزم بھی۔ عام روایت کے مطابق حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تھے تو بحیرۂ قلزم کے شمالی حصے ہی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں داخل ہوئے تھے۔ فرعون نے تعاقب کیا تو وہ لاؤ لشکر کے ساتھ ڈوب گیا۔

لی مع اللہ۔ اشارہ ہے لی مع اللہ وقتٌ لا یسعنی فیہ نبیٌ مرسلٌ و ملکٌ مقربٌ یعنی بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے ایسا روحانی قرب حاصل ہوتا ہے کہ اس میں نہ کوئی مرسل نبی بار پا سکتا ہے نہ کوئی مقرب فرشتہ۔

اسے بعض لوگ حدیث قرار دیتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ معنوی لحاظ سے اس کی درستی کا درجہ کوئی

ہو، لیکن لفظاً یہ حدیث نہیں، البتہ صوفیہ اسے حدیث ہی کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

لاتسبوا الدہر - رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں:- اللہ تعالیٰ نے کہا:- یوذینی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار (متفق علیہ): ابن آدم مجھے دکھ پہنچاتا ہے کیونکہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے اور زمانہ میں ہوں۔ معاملات کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے اور رات دن کو میں تبدیل کرتا ہوں ؛

مطلب یہ کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی یا نازل ہوتی ہے تو عام طریقہ یہ ہے کہ لوگ زمانے کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ برا بھلا کہنا اُس ذاتِ پاک کی طرف لوٹ جاتا ہے جو زمانے میں کارفرما ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ۔

یاوہ - گم - ناپدید۔

مرور - گزرنا۔

اقرأ - اشارہ ہے سورۂ اقرأ کی طرف جس کی ابتدائی آیتیں یہ ہیں،

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ — اُس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ — پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو لہو کی ایک پھٹکی سے۔

اس صورت کی ابتدائی آیتیں سب سے پہلے رسول اللہ صلعم کو غارِ حرا پر وحی ہوئی تھیں۔ اقبال کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا حقیقی علم رسول اللہ صلعم کے واسطے سے ہمیں پہنچایا اور ہم اس کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔

۱- امام شافعیؒ کی خاک پاک سبز ہو یعنی رحمت کی بارش سے ان کی تربت ٹھنڈی رہے۔ ایک دنیا امام موصوف کے انگور کا رس پی کر مست و سرخوش ہے ؛

۲- امام کی فکر نے آسمان سے تارا چنا ہے یعنی بڑی بلند چیز ان کے ذہن مبارک میں آئی۔ انھوں نے وقت کو کاٹنے والی تلوار قرار دیا ؛

۳- میں تجھے اس تلوار کا بھید کیا بتاؤں، صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کی آب و تاب زندگی کی سرمایہ دار ہے۔

۴- جس کے ہاتھ میں یہ تلوار آجاتی ہے، وہ امید و بیم سے اوپر نکل جاتا ہے اور اس کا ہاتھ بھی کلیم کے ہاتھ کی طرح روشن ہوتا ہے۔

امید و بیم سے بالا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عام انسانوں کی طرح جد و جہد میں اس کے لیے تذبذب کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا یعنی یہ نہیں ہوتا کہ وہ کامیاب ہوگا یا نہیں ہوگا - کامیاب ہونا "امید" ہے اور نہ ہونا بیم۔ جس کے ہاتھ میں وقت کی تلوار ہو، اس کی کامیابی میں کوئی شبہہ ہو ہی نہیں سکتا، لہٰذا امید و بیم

کے درمیان جھگڑا لگانے کا معاملہ ہی پیش ہی نہیں آ سکتا۔

۵۔ پھر صاحبِ شمشیرِ وقت کے بعض کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کی زندگی کے چند نہایت اہم واقعات بطور مثال پیش کیے ہیں۔ مثلاً پہاڑ اس کی ضرب سے پانی ہو جاتے ہیں اور سمندر میں اس طرح الگ کر لی جاتی ہے کہ خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے مصرع میں حضرت موسیٰؑ کے اس معجزے کی طرف اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو حضرت ممدوحؑ نے اللہ کے حکم سے چٹان پر عصا مارا اور بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ دوسرے مصرع میں اس معجزے کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر بحیرۂ احمر کے کنارے پہنچے۔ پیچھے سے فرعون تعاقب کرتا ہوا آ پہنچا۔ اللہ کی رحمت سے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں راستہ پیدا ہو گیا۔ فرعون لاؤ لشکر کے ساتھ اسی راستے سے پار اترنے لگا تو سمندر مل گیا اور وہ سب ڈوب گئے۔

۶۔ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں یہی وقت کی تلوار تھی، جس کی بدولت وہ تدبیر کی سطح سے بہت بلند ہو گئے یعنی نہ خود انھیں عام طور طریقوں کے مطابق تدبیر کی ضرورت رہی اور نہ کسی کی مخالفانہ تدبیر کے بارے میں انھیں کوئی اندیشہ باقی رہا۔

۷۔ چنانچہ انھوں نے بحیرۂ احمر کا سینہ چاک کر کے اس میں سے پیدل چلنے کا راستہ نکال لیا اور سمندر کو زمین کی طرح خشک کر ڈالا۔

۸۔ دیکھو، علی مرتضیٰؓ کے ہاتھ میں بھی یہی تلوار تھی۔ اسی کی قوت سے انھوں نے خیبر کا قلعہ فتح کر لیا۔

۹۔ پھرنے والے آسمان کی گردش کو خوب غور و توجہ سے دیکھنا چاہیے۔ رات دن کے انقلاب کی حقیقت پوری طرح سمجھی چاہیے۔

یہاں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ آلِ عمران میں آئی ہے۔ یعنی

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بےشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ	اور دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اربابِ
لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	دانش کے لیے حکمتِ الٰہی کی بڑی نشانیاں ہیں۔

۱۰۔ اے مخاطب! تو گزری ہوئی کل اور آنے والی کل کے جھگڑے میں پڑا ہوا ہے۔ اس جھگڑے سے باہر نکل اور دل میں نئی دنیا کا تماشا کر۔

مراد یہ ہے کہ جب تک وقت کے اس تصور سے نجات حاصل نہ کرو گے اسے دوش و فردا کی شکل میں دیکھتے رہو گے، تو دل کے اندر وقت کی حقیقی حیثیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۱۱-۱۲۔ اے مخاطب! تو نے اپنے دل کی خاک میں تاریکی کا بیج بویا کیونکہ وقت کو ایک خط کی طرح سمجھ لیا، جس کے حصے

کیے جا سکتے ہیں، مثلاً دوش، فردا، ماضی، حال، مستقبل وغیرہ۔ جب تجھے زمانے کا یہ طول ناپنے کا خیال آیا تو اس کے لیے دہی رات دن کا پیمانہ استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے سوا ہمارے پاس وقت کی پیمائش کا کوئی آلہ نہیں۔ رات اور دن، ہفتے اور مہینے بنتے ہیں۔ مہینے سال کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہی حساب ہمارے ہاں چل رہا ہے۔

۱۳- فرماتے ہیں، تُو نے اس رشتے کو اپنے لیے زنار بنا لیا ہے۔ اور بتوں کی طرح باطل فروشی شروع کر دی ہے۔

۱۴- تُو کیمیا تھا، مگر ایک مُشتِ خاک رہ گیا۔ تُو سِرِّ حق پیدا ہوا، لیکن باطل بن گیا۔

۱۵- کیا تُو مسلمان ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو اس زنار سے آزادی حاصل کر اور احرار کی بزم ملت میں شمع بن جا۔

اصلیتِ زمان | ۱- جب تُو وقت اور زمان کی اصلیت ہی سے واقف نہیں تو تجھے ہمیشگی کی زندگی سے کیونکر آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔ گویا حیاتِ جاوداں کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ وقت و زمان کی حقیقت سے آگاہی حاصل کی جائے۔

۲- تُو کب تک رات اور دن کے چکر میں سرگرداں رہے گا۔ اگر وقت کا بھید سمجھنا چاہتا ہے تو لی مع اللہ کا قول پیش نظر رکھ۔

لی مع اللہ کی تشریح الفاظ میں گزر چکی۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا چاہیے اقبالؔ کے تصور کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ صلعم کی ذاتِ گرامی پر ایسی کیفیت بھی رونما ہو جاتی تھی، جب آپ مکان و زمان سے بالاتر ہو جاتے تھے۔

۳- این و آں کی نمود صرف وقت کی رفتار کا کرشمہ ہے بلکہ خود زندگی وقت کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔

۴- ہمارا تصورِ وقت سورج کے گرد زمین کی گردش پر موقوف ہے لیکن حقیقی وقت اس گردش سے بالا ہے۔ وقت ہمیشہ رہنے والا ہے، سورج فانی ہے، وہ ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔

۵- وقت میں عید، عاشورہ، عیش اور غم سب اکٹھے ہیں، چاند اور سورج کی روشنی کا بھید بھی وقت ہی ہے۔

۶- اے مخاطب! تُو نے وقت کو مکان کی طرح پھیلی ہوئی چیز قرار دے لیا اور دوش و فردا کی تمیز کو اپنا شیوہ و شعار بنا لیا۔

۷- اے بے خبر! تُو خوشبو بن کر اپنے باغ سے اُڑ گیا اور خود ہی اپنے لیے ایک قید خانہ تیار کر لیا۔

۸- حقیقتِ وقت پر غور کرے تو تجھ پر واضح ہو جائے کہ نہ اس کی ابتدا ہے، نہ انتہا اور یہ ہمارے ضمیر کی کیاری سے اگتا ہے۔

۹- اگر کسی زندہ وجود کو وقت کی حقیقت کا پتا چل جائے تو وہ اور زندہ ہو جائے گا اور اس کی زندگی صبح سے بھی زیادہ منور و درخشاں ہو جائے گی۔

۱۰ - زندگی دہر ہے اور دہر زندگی ہے - رسول اللہ صلعم کا فرمان ہے کہ دہر کو بُرا بھلا نہ کہو ؛

عبد و حُر | ۱ - مَیں تجھے ایسا نکتہ بتاتا ہوں جو موتی کی طرح درخشاں ہے تاکہ تُو غلام اور آزاد کے درمیان تمیز کر سکے ؛

۲ - غلام کی کیفیت یہ ہے کہ وہ لیل و نہار کے چکر میں گم ہو جاتا ہے اور آزاد کی شان اتنی بلند ہے کہ زمانہ اس میں گُم ہو جاتا ہے ؛

۳ - غلام کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دنوں کے تار و پود سے کفن تیار کرتا رہتا ہے رات اور دن کو اپنے آپ پر مختار بناتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ اس کی اپنی حیثیت کچھ نہیں ہوتی - جو کچھ پیش آتا ہے، اسے قبول کر لیتا ہے ؛

۴ - آزاد اپنے آپ کو زمین سے باہر نکال لیتا ہے، یعنی مادی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو زمانے پر مختار رکھتا ہے ؛

مراد یہ کہ آزاد اپنی قوتِ عزم و عمل کی بدولت زمانے کو جس ڈھنگ پر چاہتا ہے چلاتا ہے ؛

۵ - غلام کی کیفیت اُس پرندے کی سی ہوتی ہے جو صبح و شام کے جال میں پھنسا ہوا ہو اور اُس کی جان نے اُڑنے کی لذت اپنے آپ پر حرام کر رکھی ہو ؛

۶ - لیکن آزاد کے سینے میں سانس انتہائی مستعدی اور تیزی سے چلتا ہے اور وہ سینہ زمانے کے پرندے کے لیے پنجرہ بن جاتا ہے ؛

۷ - غلام کی حالت یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے، اسی کو فطرت قرار دے لیتا ہے اور اس کی جان پر کبھی کوئی ایسی چیز وارد نہیں ہوتی جو نادر اور نادیدہ ہو -

۸ - وہ کاہل اور سست ہوتا ہے - ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اس کے لیے دو بھر ہو جاتا ہے، لہٰذا جہاں وہ ٹھہر گیا، ٹھہر گیا اور صبح و شام ایک ہی رنگ کی آہ و فغاں کرتا رہتا ہے ؛

۹،۱۰ - آزاد ہر وقت نئی چیزیں پیدا کرتا ہے - اس کے ساز سے برابر تازہ نغمے نکلتے رہتے ہیں - اس کی فطرت کبھی کسی چیز کو دہرانے کی تکلیف نہیں اُٹھاتی اور اس کا راستہ پرکار کا حلقہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی جگہ رہے ؛

۱۱ - غلام کے لیے وقت اور زمانہ زنجیر بن جاتا ہے اور اس کے لب پر ہمیشہ تقدیر کا لفظ رہتا ہے، یعنی جو کچھ پیش آجاتا ہے، اسی کو وہ تقدیر مان لیتا ہے -

۱۲ - آزاد میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ وہ قضا کو مشورے دینے لگتا ہے اور حادثے اسی کے ہاتھ سے صورتیں اختیار کرتے ہیں -

۱۳ - ماضی اور مستقبل اس میں موجود ہوتے ہیں اور اس کی جلدی میں دیر آسودہ ہوتی ہے ؛

۱۴ - یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ آواز و آہنگ سے بالکل پاک ہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ؛

۱۵۔ میں نے کہا تو بے نور ہے اور جو کچھ کہا وہ معنی سے شرمندہ ہے۔ معنی کو یہ شکایت ہے کہ مجھے الفاظ سے کیا واسطہ؛

۱۶۔ زندہ معنی لفظوں میں بیان کیے جائیں تو وہ مر جاتے ہیں۔ تیرے سانس اس کی آگ بجھا دیتے ہیں؛

ان تین چار شعروں کا مطلب کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے جو کچھ لکھا، لکھ تو دیا، لیکن دل میں احساس ہے کہ حقیقت واضح نہیں کر سکا اور وہ حقیقت ہی ایسی ہے جو لفظوں کی متحمل نہیں ہو سکتی؛

۱۷۔ حضور و غیب کا نکتہ دل کے اندر ہے۔ اسی طرح زمانہ اور اس کی رفتار کا بھید بھی دل ہی سے تعلق رکھتا ہے؛

۱۸۔ وقت کے ساز سے جو نغمہ نکلتا ہے، وہ نغمۂ خاموش ہے، یعنی حواس کے ذریعے سے سنا نہیں جا سکتا، البتہ دل میں غوطہ لگا، ممکن ہے وقت کا راز تجھ پر آشکارا ہو جائے۔

ماضی کی یاد ۱۔ کبھی وہ دور بھی تھا جب زمانے کی تلوار ہمارے قوی بازو کی رفیق بنی ہوئی تھی۔

۲۔ ہم نے اپنے دلوں کے کھیت میں ذہن کا بیج بو رکھا تھا اور حقیقت کے چہرے سے ہم پردہ اٹھا رہے تھے؛

۳۔ ہمارے ناخن نے دنیا کی الجھن کو سلجھا کر رکھ دیا اور اس زمین کا نصیبا ہمارے سجدوں کے باعث چمک اٹھا؛

۴۔ ہم خمِ حق سے ارغوانی شراب پیتے تھے اور پرانے میخانوں پر چھاپے مارتے تھے، یعنی ہم نے تمام پرانے نظریات و تصورات کو ختم کر کے رکھ دیا اور اس دنیا میں فکر و نظر کی تازگی پیدا کر دی۔

اہلِ مغرب سے خطاب ۱۔ اے مغرب والو! تمھاری صراحی میں پرانی شراب موجود ہے اور شراب اتنی تیز ہے کہ اس کی گرمی سے صراحی پانی پانی ہو رہی ہے؛

۲۔ تم لوگ آج غرور، نخوت، تکبر اور خود پرستی کے جنون میں ہم پر ناداری کے آوازے کس رہے ہو؛

۳۔ ہمارا ساغر بھی مجلس کی زینت بن چکا ہے اور ہمارا سینہ بھی دل کی دولت سے آباد رہ چکا ہے؛

۴۔ نئے زمانے نے جو جلوے آراستہ کیے ہیں اور جن کی بنا پر وہ فخر و ناز کر رہا ہے، کبھی سوچا کہ ان کی اصل کیا ہے؟ وہ سب ہمارے پاؤں کے غبار سے نکلے ہیں؛

۵۔ حق کی کھیتیاں ہمارے خون سے سیراب ہوئیں اور دنیا بھر کے حق پرست ہمارے ممنون و احسان مند ہیں کیونکہ ہم نے اپنی قربانیوں سے حق کو ہر جگہ پھیلا دیا اور حق پرستوں کے لیے اپنی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنے کی صورتیں نکل آئیں؛

۶۔ دنیا کو ہم نے تکبیر سکھائی۔ ہماری مٹی سے جا بجا کعبے تعمیر ہوئے؛

۷۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اقرأ کی تعلیم دی تھی اور اپنا رزق ہمارے ہاتھ سے تقسیم کرایا تھا؛

مسلمان کی شان ۱۔ بلاشبہ آج ہمارے ہاتھ میں تاج و نگیں نہیں رہے۔ سلطنتیں اور حکومتیں ہم سے چھن گئیں

اور ہم فقیر و بے نوا رہ گئے ؛ لیکن اے مغرب والو! ہمیں حقارت سے نہ دیکھو ۔

۲ ۔ تمھاری نگاہوں میں تو ہم لوگوں نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے ، اس کی وجہ سے آپ اپنا نقصان کر رہے ہیں ۔ ہماری سمجھ بوسیدہ ہو چکی ہے ۔ جو کچھ سوچتے ہیں ، وہ دقیانوسی ہے اور ہم خوار و ذلیل ہیں ۔

۳ ۔ کیا کبھی یہ بھی سوچا کہ ہماری عزت و آبرو لا الٰہ سے ہے اور دونوں جہانوں یعنی دنیا و عقبیٰ کے ہم نگہبان ہیں اور دونوں کو پیش نظر رکھتے ہیں ؟

۴ ۔ ہمیں نہ آج کا غم ہے ، نہ آنے والی کل کی فکر ہے ۔ ہم ان جھنجاٹوں سے بالکل پاک ہو چکے ہیں کیونکہ ہم نے ایک پاک شخصیت سے محبت کا عہد کر رکھا ہے ۔ وہ پاک شخصیت رسول اللہ صلعم کی ذات بابرکات ہے ۔

۵ ۔ ہم خدا کے دل کا چھپا ہوا بھید ہیں ۔ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے وارث ہیں

۶ ۔ یہ سورج اور چاند ہماری تب و تاب سے روشن ہیں ۔ ہمیں حقیر نہ سمجھو ، ہمارے بادل میں اب بھی بجلیاں موجود ہیں ۔ یہ مضمون ایک مرتبہ اردو میں بھی بڑے دلکش انداز سے پیش کیا تھا :

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

۷ ۔ ہمارا وجود خدا کے وجود کا آئینہ ہے اور مسلمان کی ہستی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے :

اُنیسواں باب

دُعا

تمہید : یہ " اسرار خودی " کا آخری باب ہے ۔ اس کے ابتدائی حصے میں مسلمانوں کے لیے خدا سے دعائیں کی ہیں کہ ہمارے ناشاد دلوں کے لیے تسکین کا سروسامان کر ، ہمارا عشق خام ہے ، اسے پختہ کر دے ۔ ہم بے حقیقت گھاس ہیں ہمیں آتش آشام بنا دے ۔ ہمیں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی قوت عطا فرما ۔ دوسرے حصے میں زیادہ تر اپنے حالات بیان کیے ہیں کہ میں شمع کی طرح جل رہا ہوں ، لیکن کوئی پروانہ ایسا نظر نہیں آتا جو مجھ پر آ گرے ۔ میرے عہد کے لوگوں کا پہلو دل سے خالی ہو گیا ۔ کوئی نہیں جو میرا رازدار و غمگسار بن سکے ۔ میں اس آگ کو کب تک اپنی جان پر لیے پھروں ؟ اے خدا یا تو اپنی یہ امانت واپس لے لے یا مجھے کوئی پرانا رفیق عطا کر ۔ سمندر میں موج کا ساتھ موج دے رہی ہے ۔ آسمان پر تارے تاروں کے رفیق ہیں ۔ غرض ، دنیا کی ہر چیز رفاقت سے بہرہ ور ہے ، صرف میں رفاقت سے محروم ہوں ۔ کوئی ایسا رفیق عطا کر جو درد تو نے مجھ میں بھر دیا ہے ، اسے اس کی جان کے حوالے کر دوں ۔

بارگاہِ باری تعالیٰ میں | محسود ۔ جس سے حسد کیا جائے ۔

سلمانؓ و بلالؓ ۔ رسول اللہ صلعم کے دو مشہور صحابی جن میں سے پہلے فارسی تھے اور دوسرے حبشی ۔

اعناق اعدا خاضعین ۔ اس میں سورۂ شعراء کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے ۔

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً ۔ اگر ہم چاہیں، اتاریں ان پر آسمان سے ایک نشان، پھر رہ

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۔ جائیں ان کی گردنیں اس کے آگے نیچی ۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے ۔ یہاں انسانوں کی فرمانبرداری اور سرکشی کو آزمایا جاتا ہے اس لیے حکمتِ الٰہی مقتضی نہیں کہ بندوں کو قوتِ تمیز سے کام لینے کا موقع نہ دے ۔ یہاں اقبالؒ نے آیت کا اصل مفہوم پیش نہیں کیا، صرف اس کے الفاظ سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ ایسا نشان دکھا جسے دیکھ کر دشمنوں کی گردنیں نیچی ہو جائیں :

۱ ۔ خدا سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں، اے پاک ذات تجھے اس کائنات کے اندر جان کی حیثیت حاصل ہے ۔ تُو ہماری جانوں میں چھپا بیٹھا ہے، لیکن ہم سے دُور بھاگ رہا ہے :

مراد یہ ہے کہ ہماری جانوں میں تیرے عشق و محبت کے سوا کچھ نہیں، لیکن تُو ہم سے کیوں کنارہ کش ہے؟

۲ ۔ زندگی کے ساز میں صرف تیرے فیض کی برکت سے نغمہ پیدا ہوتا ہے اور تیری راہ میں سر جانا ایسی نعمت ہے کہ زندگی بھی اس پر رشک کرتی ہے ۔ زندگی صرف اللہ کا امر اور اس کی رحمت ہے ۔ خدا کی راہ میں شہادت پانے سے بڑی نیکی کوئی نہیں ۔

۳ ۔ ہمارے دل سخت رنجیدہ اور غمناک ہیں ۔ تُو ان کے لیے تسکین کا سامان بن ۔ پھر ہمارے سینوں میں آ کر بس جا :

۴ ۔ ہم پہلے تیری راہ میں ننگ و نام قربان کر چکے ہیں ۔ پھر ہم سے اُسی قربانی کا طلبگار ہو ۔ ہم عشق میں خام ہیں ۔ ہمیں پختہ کر دے ۔

۵ ۔ اپنی قسمت کی شکایتیں ہماری زبان پر ہیں ۔ تیرا نرخ بہت اونچا ہے اور ہم مفلس و نادار ہیں :

۶ ۔ بیشک ہم خالی ہاتھ ہیں، لیکن ہم سے اپنا دلکش چہرہ نہ چھپا ۔ حضرت سلمانؓ اور حضرت بلالؓ کا عشق بڑے اونچے درجے کا تھا ۔ اس کا نرخ بہت گراں تھا ۔ اب اسے سستا کر دے تاکہ ہم جیسے فرومایہ بھی اس سے فیض حاصل کر سکیں :

۷ ۔ ہمیں ایسی آنکھ عطا کر جو نیند کو اپنے اوپر حرام سمجھے ۔ وہ دل عنایت فرما، جسے ایک لمحے کے لیے بھی قرار نہ آئے، یعنی ہم میں پہلے کی طرح پھر پارے کی خصلت بھر دے ۔

۸ ۔ اپنے روشن نشانوں میں سے ایک نشان دکھا تاکہ دشمنوں کی گردنیں نیچی ہو جائیں :

۹۔ ہم گھاس پھوس کی حیثیت رکھتے ہیں، جو کسی کام نہیں آسکتی۔ ہمیں آگ اُگلنے والا پہاڑ بنادے اندر ہماری آگ کو وہ تپش عطا کر کہ تیرے سوا ہر شئے کو جلادے۔

۱۰۔ جب سے قوم نے وحدت کا رشتہ چھوڑا، ہمارے کام کے رشتے میں سیکڑوں گرہیں پڑ گئیں۔

۱۱۔ ہم ستاروں کی طرح دنیا میں بکھر گئے۔ اگرچہ ایک دوسرے کے پاس پاس رہتے ہیں، تاہم ایک دوسرے سے اجنبی ہیں۔

۱۲۔ ان بکھرے ہوئے اوراق کے لیے شیرازے میں بندھ جانے کا سامان کر دے۔ پھر محبت کا وہ شیوہ تازہ کر دے جس سے ہمارے اسلاف نے گوناگوں برکتیں حاصل کی تھیں۔

۱۳۔ پھر ہمیں وہی خدمت سونپ دے، جس پر ہم صدیوں مامور رہے۔ ہم تیرے عاشق ہیں، اپنا کاروبارِ عاشقی کے حوالے کر۔

۱۴۔ ہم تیری تسلیم و رضا کے راستے پر چل رہے ہیں، ہمیں منزلِ مقصود پر پہنچا اور حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی قوت سے سرفرازی بخش۔

۱۵۔ عشق کو پہلے **لا** کے شغل سے آگاہ کر، پھر اسے **الّا اللہ** کی رمز سکھا۔

(۱۶) <u>کیفیت</u> ایلدا ۔ تاریک ۔ سیاہ

۱۔ میں شمع کی طرح دوسروں کے لیے جل رہا ہوں اور اپنی محفل کو اُسی طرح رونے کا سبق دے رہا ہوں جس طرح شمع محفل میں اشکبار رہتی ہے۔

۲۔ اے اللہ! مجھے وہ آنسو عطا کر جو دلوں میں روشنی پیدا کر دے، بیقرار ہو، مضطرب ہو اور آرام کو جلا دے۔

۳۔ میں اُس آنسو کو باغ میں بو دوں اور اُس سے آگ اُگے۔ لالے کی قبا سے آگ جھڑنے لگے۔

۴۔ میرا دل ماضی کی کیفیتوں میں گم ہے اور میری آنکھ آنے والے دور پر جمی ہوئی ہے۔ میری پوری انجمن میں ایک فرد بھی اس قماش کا نہیں، گویا میں بھری مجلس میں تنہا ہوں۔

۵۔ یہاں مولانا رومؒ کا مشہور شعر برمحل پیش کیا گیا ہے کہ جو بھی شخص آیا، وہ اپنے خیال اور قیاس کی بنا پر میرا ساتھی بن گیا اور اپنے خیال و قیاس ہی میں گم رہا۔ یہ کوشش کبھی نہ کی کہ میرے سینے میں جو راز بھرے ہوئے ہیں، ان کا جائزہ لے لیتا۔

۶۔ اے خدا! میرا ساتھی کہاں ہے؟ میں سینا کے نخل کی طرح جل رہا ہوں۔ اس کے تجلی زار سے فائدہ اٹھانے والا کلیم کہاں ہے؟

۷۔ اے خدا! میں ظالم ہوں، میں نے اپنے آپ پر بڑے ظلم کیے ہیں۔ میں ایک شعلے کو اپنی آغوش میں پالتا رہا۔

۸۔ وہ شعلہ ہوش و حواس کا سامان لُوٹ لے گیا اور عقل کے دامن میں انگارے ڈال دیے۔

۹۔ اس نے عقل کو دیوانگی سکھائی اور علم کا سرمایۂ وجود جلا کر رکھ دیا۔

۱۰۔ وہی شعلہ ہے جس سے سورج آسمان کی بلندی پر پہنچا۔ وہی شعلہ ہے جس کے اردگرد بجلیاں متواتر طواف کرتی رہتی ہیں۔

۱۱۔ میں شبنم کی طرح روتی ہوئی آنکھ بنا، جب کہیں پر چھپی ہوئی آگ میرے سپرد ہوئی۔

۱۲۔ میں نے شمع کو کھُلم کھُلا جلنے کی تعلیم دی لیکن خود دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر جلتا رہا۔

۱۳۔ آخر وہ نوبت آگئی کہ میرے بدن کے بال بال سے شعلے اُگنے لگے اور میری فطرت کی رگوں سے آگ ٹپکنے لگی۔

۱۴۔ میری بلبل نے چنگاریوں کے دانے چگ لیے، پھر آتشیں نغمہ پیدا کیا۔

۱۵۔ میرے دور کا سینہ دل سے خالی ہے، یعنی اس دور میں کوئی صاحبِ دل نظر نہیں آتا۔ مجنون تڑپ رہا ہے کہ محل خالی ہوگیا۔

۱۶۔ شمع کے لیے اکیلے جلتے رہنا آسان نہیں، کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک بھی پروانہ میرے شعلوں پر گرنے کے لائق نہ نکلا۔

غمگسار کا انتظار ۱۔ میں کب تک کسی غمخوار کا انتظار کرتا رہوں اور کب تک کسی راز دار کی تلاش میں دوڑا پھروں؟

۲، ۳، ۴۔ اے پاک ذات! چاند اور ستارے تیرے ہی چہرے سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ مجھ عاجز کی یہ التجا قبول کر جو آگ تُو نے میری جان میں رکھی ہے، اسے واپس لے لے۔ یہ تیری امانت ہے، اسے میرے سینے سے نکال لے۔ میرے آئینے میں جو ہر کانٹوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں، ان کانٹوں کو کھینچ لے یا مجھے کوئی پُرانا ساتھی عطا کر۔ میرے دل میں دُنیا کو جلا دینے والے عشق کی آگ رکھی ہے۔ اس عشق کے لیے کوئی آئینہ دے دے۔

۵۔ میں دُنیا کی حالت دیکھتا ہوں تو ہر شے کو کوئی نہ کوئی ساتھی ملا ہوا ہے۔ سمندر میں موج کے پاس موج موجود ہے۔ ان کی عادت ہی یہ ہے کہ ایک دوسری سے مل کر تڑپتی ہیں۔

۶۔ آسمان پر تارے تاروں کے ساتھی ہیں۔ روشن چاند رات کے زانو پر سر رکھتے ہوئے ہے۔

۷۔ دن اندھیری رات سے پہلو مارتا ہے۔ آج اپنے آپ کو آنے والی کل پر گراتا ہے۔

۸۔ ایک ندی کی ہستی دوسری ندی کی ہستی میں گم ہو جاتی ہے۔ ہوا کی لہر خوشبو میں سما جاتی ہے۔

۹۔ ویرانے کے گوشے گوشے میں رقص ہو رہا ہے۔ دیوانے دیوانوں سے مل کر ناچ رہے ہیں۔

۱۰۔ اگرچہ تُو اپنی ذات میں یکتا ہے اور تجھے کبھی کسی ساتھی کی ضرورت نہیں پڑی لیکن تُو نے بھی اپنی دلچسپی کے لیے ایک دنیا آراستہ کر لی ہے۔

۱۱- میری مثال صحرائی لالے کی ہے اور بھری مجلس میں تنہا ہوں:

۱۲- میری التجا ہے کہ اپنے لطف و کرم سے مجھے ایک ایسا ساتھی عطا کر جو میرا ہمدم ہو، جو میری فطرت کا محرم ہو:

۱۳- ایسا ہمدم جو دیوانہ بھی ہو اور عقلمند بھی۔ این و آں کا اسے کوئی خیال نہ ہو۔ یعنی اسے دنیوی عز و جاہ سے کچھ سروکار نہ ہو۔

۱۴- تاکہ میں اپنے عشق و محبت کی آگ اس کی جان کے حوالے کر دوں۔ پھر اُس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔

۱۵- میں اپنی مٹی سے ایک مُٹھی لے کر اُس کا جسم بناؤں اور اُس کے لیے بُت بھی بنوں اور آزر بھی، یعنی میں ہی اسے بناؤں اور وہ میری ہی تعلیمات اور مخلصانہ عشق و محبت کا ترجمان ہو:

رموزِ بیخودی

رموزِ بیخودی

پہلا باب — ملّتِ اسلامیہ کے حضور میں پیشکش

تمہید، خطاب بہ ملّت، خدا سے دعا

دوسرا باب — فرد و ملّت کا ربط

تمہید، فرد و ملّت، خودی اور بیخودی

تیسرا باب — تربیتِ ملّت اور نبوّت

تمہید، انسانوں کی ابتدائی حالت، نبوّت،

ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ

چوتھا باب — پہلا رکن —— توحید

تمہید، انسانوں کی ابتدائی حالت، نبوّت

پانچواں باب — یاس، حزن اور خوف

تمہید، یاس و حزن، خوف

چھٹا باب — تیر اور تلوار کی بات چیت

ساتواں باب — اورنگ زیب عالمگیر اور شیر کی حکایت

تمہید، اورنگ زیب عالمگیر، شیر کا واقعہ

آٹھواں باب — دوسرا رکن —— رسالت

تمہید، رسالت، وحدتِ ملّت، دوامِ ملّت

نواں باب — رسالتِ محمدیہ کا نصب العین

تمہید، انسانیت کی حالتِ زار، ظہورِ رحمتِ عالم، اُمّتِ اندلس کا نصب العین

دسواں باب — ابو عبیدہؓ اور جابان —— اسلامی اخوّت

تمہید، مسلمان سپاہی اور ایرانی سپہ سالار، اسلامی سالار کا فیصلہ

گیارھواں باب — سلطان مراد اور معمار —— اسلامی مساوات

تمہید، معمار کو سزا، قرآن مجید کا فیصلہ

بارھواں باب — حادثۂ کربلا ———— اسلامی حریت
تمہید، عقل و عشق، امام حسینؓ، معرکۂ کربلا

تیرھواں باب — ملتِ اسلامیہ کی آفاقیت
تمہید، ملتِ اسلامیہ کی بنیاد، ہجرت کی حقیقت

چودھواں باب — وطن بنیادِ ملت نہیں
تمہید، وطن پہ ملت کی تعمیر، میکیاولی کی تعلیم

پندرھواں باب — ملتِ اسلامیہ کی ابدیت
تمہید، فنا و بقا، فرد و قوم، ملتِ اسلامیہ، ملتِ اسلامیہ کا دوام

سولھواں باب — نظامِ ملت ———— قرآن
تمہید، آئین کی ضرورت، قرآنِ مجید، عرب اور قرآن، مسلمان سے خطاب

سترھواں باب — اجتہاد و تقلید
تمہید، عہدِ حاضر، تقلید، یہودیوں کی مثال، مسلمان سے خطاب

اٹھارھواں باب — اتباعِ شریعت اور پختگیِ سیرت
تمہید، شریعت، اسلام، نسخۂ قدرت، مسلمانوں کی کیفیت، شیخ احمد رفاعی کی نصیحت

انیسواں باب — اسوۂ حسنہ کی پابندی
تمہید، حموش کا واقعہ، والد کے ارشادات، مسلمان اور خلقِ نبیؐ، ایک مثال

بیسواں باب — ملتِ اسلامیہ اور بیت الحرام
تمہید، زندگی کی کیفیت، قومی مرکزیت، یہودیوں کا انجام، مسلمان سے خطاب

اکیسواں باب — حفاظت و اشاعتِ توحید
تمہید، مقصد و نصب العین، مسلمان کا فرض، ملتِ اسلامیہ کا مقام، رنگ ملک اور نسل کے بت

بائیسواں باب — نظامِ عالم کی تسخیر
تمہید، دعوتِ تسخیر، نیابتِ حق کے مقدمات، علمِ اسماء کا مدعا

تئیسواں باب — قومی تاریخ کا مقام
تمہید، بچے کے مدارج ارتقاء، قومی خودی
قومی تاریخ

چوبیسواں باب — امومت

تمہید، امومت، مثالی خاتون، اصل قومی سرمایہ

پچیسواں باب — حضرت فاطمۃ الزہرا رض

تمہید، تین نسبتیں، ماؤں کے لیے اسوۂ کامل، پردہ نشینوں سے خطاب

تفسیر سورۂ اخلاص

(مثنوی کے مطالب کا خلاصہ)

پہلا باب — قل ھو اللہ احد

حضرت صدیق اکبرؓ کا ارشاد، توحید فی العمل کی دعوت

دوسرا باب — اللہ الصمد

بے نیازی کی دعوت، ہارون الرشید اور امام مالکؒ، غیروں سے آزادی

تیسرا باب — لم یلد ولم یولد

رنگ و نسب سے بالاتر قومیت، حضرت ابن مسعودؓ کا واقعہ، رسول اللہ صلعم سے عشق

چوتھا باب — ولم یکن لہٗ کفواً احد

مسلمان کی شانِ برتری، خیر و شر کا معیار

پانچواں باب — رحمۃ للعالمینؐ کے حضور میں عرضِ حال

رحمۃ للعالمینؐ، مسلمان کی کم نصیبی اور حق ناشناسی۔
بارگاہِ حضورؐ میں التجا، سایۂ دیوار میں مرقد کی آرزو

پہلا باب

ملّتِ اسلامیہ کے حضور میں پیشکش

تمہید: اس پیشکش میں ملّتِ اسلامیہ کے مقام بلند کا سرسری نقشہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سب نعمتیں تو تیرے لیے تھیں، تو کعبہ چھوڑ کر غیروں کے پیچھے پھر رہا ہے۔ پھر اپنے دل میں عشق کے وہی انداز پیدا کر، جو تیرے اسلاف کے لیے فخر و عزت کا سامان تھے، یعنی رسول اللہ صلعم سے از سرِ نو پیمانِ نیاز باندھ لے۔ میرے ہمسروں نے زلف و رخسار کی داستانیں سنائیں۔ ساقی کے دروازے پر پیشانی رکھی۔ مغ زادوں کے قصّوں میں وقت صرف کیا۔ میں صرف تیری تیغِ ابرو سے شہید ہوا اور سب کچھ تیری نذر کر دیا۔ بے مقام خداداد جوہرِ سخن سنجی صرف تیری اصلاح و ترقی کے لیے وقف رہے۔ اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، مجھے اربابِ جاہ و منصب کی مدح نہیں آتی۔ میں کسی کا احسان قبول نہیں کرتا۔ میں ایک خنجر کی طرح سخت کوش ہوں۔ میرے سمندر کے ہاتھ میں گرداب کا کاسہ نہیں یعنی سوال میری فطرت نہیں، میری جان تیرے دروازے پہ سوز و گداز کا ہدیہ لے کر آئی ہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ تو اپنے حسن سے آگاہ ہو اور اپنے ہی گیسو کی زنجیر میں جکڑی جائے۔

میں ایک ایسی قوم کے لیے، جو اپنی حقیقت سے نامحرم ہو چکی تھی، خدا کی بارگاہ میں پائدار زندگی کی التجائیں کرتا رہا۔ راتیں رو کر گزار دیں۔ میرے پاس آہ و فغاں کا ایک پھول تھا۔ اے ملّتِ اسلامیہ! میں وہ پھول تیری دستار پر رکھ رہا ہوں۔ حشر بپا کر رہا ہوں تاکہ تو گہری نیند سے بیدار ہو جائے۔ تیری خاک کے دامن سے لالہ زار اُگے اور تیرا سانس بادِ بہار بن جائے۔

خطاب بہ ملّت: خاتم۔ ختم کرنے والی۔ آخری۔

ہمگر۔ لغوی معنی دو چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔ اس کا اطلاق رفوگر پہ ہوتا ہے۔ فارسی کا مشہور شاعر مجدالدین ہمگر رفوگر تھا، اس لیے "ہمگر" مشہور ہوا۔

ترسا۔ یہ آتش پرست اور نصرانی دونوں کے لیے مستعمل ہے۔

دریوزہ۔ بھیک۔

آدینہ۔ جمعہ۔

پیشکش کا عنوان عرفی کا مشہور شعر ہے:

منکر نشوی گر بہ غلط دم زنم از عشق

این نشہ مرا گر نبود باد گرے ہست

اقبال نے یہ شعر کسی قدر مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں عشق کا دعوی کرتا ہوں اور اے مخاطب! اگر وہ تیرے نزدیک درست نہیں تو نفس عشق کا انکار نہ کر۔ تھوڑی دیر کے لیے سمجھ لے کہ میں اس شراب سے مست نہیں، لیکن کوئی نہ کوئی تو ضرور مست ہوگا۔

اس شعر کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ انسان کی توجہ ہمیشہ "من قال" پر نہیں بلکہ "ما قال" پر رہنی چاہیے۔ یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ کہنے والا کون ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے؛ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا کہا گیا ہے اور اس کی عظمت و اہمیت کی کیا کیفیت ہے۔

۱- اے ملت اسلامیہ! جس طرح تیرے رسول خاتم الرسل اور اس دنیا کے آخری نبی تھے، اسی طرح تو قوموں کی خاتم ہے، یعنی تیرے بعد کوئی قوم پیدا نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں جو آغاز ہوا تھا، وہ تیری ذات پر انجام کو پہنچ گیا۔

۲- اے ملت! تیرے پاکباز اور پاک باطن اصحاب کو اس سے ملتی جلتی حیثیت حاصل ہے، جو پہلی قوموں میں انبیا کو حاصل تھی اور تیرے جن بزرگوں کے جگر عشق حق کی وجہ سے چاک چاک ہیں، وہ دلوں کے زخم رفو کر دیتے ہیں۔
پہلے مصرع میں جو مضمون ہے، اسے ایک روایت سے وابستہ کیا جاتا ہے یعنی علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (رسول اللہ صلعم نے فرمایا: "میری امت کے علماء دین وہی فرائض انجام دیں گے، جو بنی اسرائیل میں انبیاء نے انجام دیے) لیکن اہل علم و تحقیق کے نزدیک یہ روایت ثابت نہیں، البتہ معنوی اعتبار سے اسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ علماء حق نے یقیناً امت کی ہدایت کے لیے وہ سب کچھ کیا، جس کا نقشہ بائبل نے اپنے انبیاء کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔

۳- اے ملت! تیری نگاہیں تو نصرانیوں اور گبروں کے حسن پر جم گئی ہیں، تو کعبے کے راستے سے دور چلی گئی ہے، یعنی جو تیرا حقیقی مقصود تھا، اس سے ہٹ گئی ہے۔

۴،۵- یہ آسمان تیرے کوچے کے گرد و غبار کی ایک مٹھی ہے اور تیرے چہرے کے حسن کا یہ عالم ہے کہ دنیا کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی ہیں، لیکن تیری کیفیت یہ ہے کہ تو موج کی طرح بیقرار ہو کر دوسری طرف چلی جا رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ تجھے ذوق تماشا کہاں لیے جا رہا ہے ـــــ ان دونوں شعروں کے آخری دو مصرعے سعدی کی غزل کے ایک شعر سے لیے گئے ہیں یعنی:

اے تماشا گاہ عالم روے تو

تو کجا بہر تماشا مے روی

۶- تجھے چاہیے کہ پروانے سے سوز کے راز سیکھے اور چنگاریوں میں گھر بنائے:

۷- اپنی جان کے اندر عشق کا انداز پیدا کر اور رسول اللہ صلعم سے پھر پیمان نیاز و وفا باندھے:

۸- اے ملت! تیرے چہرے سے نقاب اٹھا اور میں نے اس کی آب و تاب دیکھی تو میرے دل کو نصرانیوں اور گبروں سے نفرت ہو گئی۔

یہ امر محتاج تصریح نہیں کہ یہاں مقصود حقیقی مجموعۂ افراد کے بجائے زندگی کے وہ مقاصد و اصول ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ملتِ اسلام کے لیے مقرر کیے اور جن کی پابندی انسانیت کے ہر گروہ کو حُسنِ بے مثال کا پیکر بنا سکتی ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں نے تیرے مقاصد و اصول دیکھے تو اُن کے مقابلے میں کسی غیر مسلم قوم کے مقاصد و اصول ایک آنکھ نہ بھائے۔

۹، ۱۰- میرے ہمنواؤں نے غیروں کی جلوہ افروزیوں کے افسانے سنائے۔ گیسو و رخ کی داستانیں بیان کیں۔ انھوں نے ساقی کے دروازے پر پیشانی گھسی۔ وہ مغ زادوں کے قصّے کہتے رہے:

یہ وقت کے عام شاعروں کی کیفیت تھی، اپنے متعلق فرماتے ہیں:

۱۱- اے ملتِ اسلامیہ! میں تو تیری تیغ ابرو کا شہید ہوں۔ بلاشبہہ میری حیثیت خاک کی ہے، لیکن تیرے ہی کوچے میں مجھے آسائش نصیب ہوئی ہے:

۱۲- مَیں کسی کی مدح و ستائش نہیں کر سکتا۔ اس سے بہُت اونچا ہوں۔ ہر وزیر کے آگے میرا سر نہیں جھُک سکتا:

۱۳- قضا و قدر نے مجھے شعر و سخن کا آئینہ ساز بنایا ہے اور بادشاہوں سے بے نیاز کر دیا ہے، اگرچہ وہ سکندر جیسی عالمگیر سلطنت ہی کے مالک ہوں:

۱۴- میری گردن احسان کے بوجھ کی روادار نہیں ہو سکتی۔ میں باغ میں پہنچ جاؤں تو میرا دامن کھلا نہیں رہتا، بند ہو کر کلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے تاکہ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو، میں باغ سے کچھ لینے کے لیے آیا ہوں:

مطلب یہ کہ میں کسی کے آگے دامن پھیلا نہیں سکتا:

۱۵- میں اس دُنیا میں تلوار کی طرح سخت کوش ہوں اور بھاری پتّھر سے آب حاصل کرتا ہوں:

مراد یہ ہے کہ خنجر کو سنگ فساں پر تیز کیا جاتا ہے۔ اس طرح اُس کی دھار بھی تیز ہوتی ہے اور آب و تاب بھی بڑھتی ہے۔ اقبالؔ نے شاعرانہ انداز میں یہ فرمایا کہ میرا خنجر بھی پتّھر سے اپنے لیے آب حاصل کرتا ہے۔ سخت کوشی کا تقاضا یہی ہو سکتا ہے:

۱۶- اگرچہ میں سمندر ہوں، لیکن میری موجوں میں کوئی بیقراری نہیں اور میرے ہاتھ میں بھنور کا کاسہ ہرگز نظر نہ آئے گا گرداب کی شکل بہ ظاہر گول ہوتی ہے اور اسے کاسے سے تشبیہ دی۔ کاسہ بھیک مانگنے

کی دلیل ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ سمندر تو ہوں، لیکن عام سمندر کی طرح میرے ہاتھ میں کاسہ نظر نہ آئے گا، خواہ وہ گرداب ہی کا ہو۔

۱۷۔ میں رنگ کا پردہ ہوں، خوشبو نہیں کہ بادِ نسیم کا ہر جھونکا مجھے شکار کر کے لے جائے۔

مطلب یہ ہے کہ نسیم چلتی ہے تو خوشبو اڑا کر لے جاتی ہے، لیکن رنگ نہیں لے جا سکتی۔

۱۸۔ میں زندگی کے اس مقام پر، جہاں شعلے ہی شعلے ہیں، ایک انگارہ ہوں اور اس پر خوش ہوں کہ آخر راکھ میرے لیے خلعت مہیا کرے گی۔

۱۹۔ اے ملّتِ اسلامیہ! میری جان تیرے در پہ نیاز لے کر آئی ہے۔ اس کے دامن میں تیرے لیے سو دو گدازِ تحفہ ہے۔

۲۰، ۲۱۔ جس آسمان کا رنگ نیلا ہے، میں سمندر کے پانی سے ملتا جلتا ہے، اس سے میرے پُر حرارت دل پر دمبدم دریا ٹپکتے رہتے ہیں۔ میں انھیں ندی سے بھی زیادہ باریک بناتا ہوں تاکہ وہ تیرے باغ کے صحن میں بہنے لگیں۔

مراد یہ ہے کہ آسمان سے فیضان کی جو بارش مجھ پر ہوتی ہے، اے ملّت! میں صرف تیری بہبود کے لیے اس سے کام لیتا ہوں۔

۲۲۔ اے ملّت! یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تو ہمارے محبوبؐ کو پیاری ہے اور ہم نے دل کی طرح تجھے پہلو میں بٹھا رکھا ہے۔

۲۳، ۲۴۔ جب سے عشق نے سینے میں آہ و فغاں کی بنیاد رکھی، اس کی آگ نے میرے دل کو آئینہ بنا دیا۔ میں پھول کی طرح اپنا سینہ چیر رہا ہوں تاکہ یہ آئینہ تیرے سامنے آ جائے۔

۲۵۔ اور تو اس آئینے میں اپنے چہرے پر ایک نظر ڈالے تاکہ اپنی زلف میں اسیر ہو جائے۔

۲۶۔ میں تیری پرانی داستان پھر سے سناتا ہوں تاکہ تیرے سینے کے داغ تازہ ہو جائیں۔

خدا سے دعا ۱۔ میں اس قوم کے لیے، جو اپنی حقیقت سے ناآشنا ہو چکی تھی، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پائدار زندگی کی التجائیں کرتا تھا:

۲۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا اور میں رو رہا تھا۔ دنیا سو رہی تھی اور میری آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے:

۳۔ میری جان صبر اور سکون کی دولت کھو چکی تھی اور میں یا حیّ و یا قیّوم کا ورد کر رہا تھا۔ یہ دعا پائدار اور محکم زندگی کے لیے تھی، ایسے میں "یا حیّ و یا قیّوم" ہی کا ورد موزوں تھا۔

۴۔ میرے دل میں ایک آرزو تھی، اسے لہو بنا کر بہایا اور آنکھوں کے راستے باہر نکال دیا۔

۵، ۶۔ انسان لالے کی طرح کب تک متواتر جلتا رہے اور کب تک صبح سے شبنم کی بھیک مانگی جائے، میں نے شمع کی طرح اپنے آنسو اپنے آپ پر گرانے شروع کیے اور اسی کی طرح اندھیری رات سے پنجہ آزمائی شروع کر دی

جس شمع سے آنسو نکلتے ہیں، وہ موم کی شمع ہوتی ہے اور اندھیری رات سے شمع کی پنجہ آزمائی کا معاملہ بالکل واضح ہے کیونکہ وہ چاہتی ہے، اندھیرا اُس کے نور سے اجالا بن جائے۔

۷ - مَیں خود گھلتا گیا اور روشنی کو تیز تر کرتا رہا۔ اس طرح دوسروں کے لیے محفل آراستہ کر دی۔

۸ - مجھے ایک لمحے کے لیے بھی سینے کی جلن سے فراغت نہیں ملتی۔ میرے ہفتے میں روزِ جمعہ ہے ہی نہیں۔ اسلامی حکومت میں جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی، جس طرح مسیحی حکومتوں میں اتوار یومِ تعطیل مقرر ہوا۔ شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ سب کو ہفتے میں ایک دن کے لیے چھٹی مل جاتی ہے لیکن میرے ہاں چھٹی کا سوال سرے سے ہی نہیں۔

۹ - میرے پرانے جسم میں، جو غموں سے نڈھال ہے، جان کی کیفیت ایسی ہے، جیسے آہ کا ایک جلوہ گرد و غبار سے آلودہ ہو۔

۱۰، ۱۱، ۱۲ - ازل کی صبح کو خدا نے مجھے پیدا کیا تو میرے ساز کے ریشمی تاروں میں نالے تڑپنے لگے۔ یہ نالے ایسے تھے، جو عشق کے بھید ظاہر کر دینے والے تھے اور جنھیں عشق کی حسرت گفتار کا خونبہا کہنا چاہیے۔ ان نالوں میں یہ قوت تھی کہ خس و خاشاک کو آگ کی فطرت بخش دیں اور خاک کی مٹھی میں پروانے کی شوخی بھر دیں۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ازل ہی سے قوم کا درد رکھ دیا تھا اور وہی درد آج اس دعوت کا موجب بنا ہے۔

۱۳ - عشق کے لیے لالے کی طرح داغ ہی کا سامان بس کرتا ہے۔ اگر اُس کے گریبان میں لالے کا ایک بھی پھول ہو تو وہ کافی ہے۔

۱۴ - اے ملّتِ اسلامیہ! میں یہی پھول تیرے طرّے کی زینت بناتا ہوں۔ تو بڑی گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ میں حشر برپا کر رہا ہوں تاکہ تُو جاگ اُٹھے۔

۱۵ - پھر ایسی جدوجہد کرے کہ تیری خاک کا دامن لالہ زار بن جائے اور تیرا سانس اس کائنات کے لیے فصلِ بہار کی شکل اختیار کرے۔

دوسرا باب

فرد و ملّت کا ربط

تمہید | تمہید میں اقبالؔ نے فرد و ملت کے ربط و تعلق کی کیفیت واضح کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ فرد کو ایک قوم سے وابستہ ہو جانے کے بعد عزت ملتی ہے اور خود قوم افراد کے باہم مل جانے سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ پھر اس کی متعدد مثالیں دی ہیں، مثلاً جب تک پتا شاخ سے وابستہ رہتا ہے، اسے امید باقی رہتی ہے کہ بہار آئے گی تو وہ بھی اپنے حصے کی تازگی حاصل کرے گا، لیکن اگر وہ شاخ سے الگ ہو جائے تو ساتھ ہی بہار سے فائدہ اٹھانے کی امید بھی ختم ہو جائے گی۔ بالکل یہی کیفیت فرد و قوم کی ہے۔ فرد جب تک اکیلا رہتا ہے، اس کے دل میں مقاصدِ عالیہ پیدا ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ مقاصد تو اُس وقت سامنے آئیں گے، جب مختلف افراد یکجا ہوں گے۔ جب اُس کے سامنے کوئی اچھا اور پائدار نصب العین نہیں ہوگا تو قدرت کی عطا کی ہوئی قوّت عمل رائگاں جائے گی۔ جب فرد جماعت سے ربط پیدا کرتا ہے تو جماعت اسے مقاصد عالیہ سے آشنا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو جوہر فرد کو عطا کیے ہیں، ان سب کے لیے بروئے کار آنے کا موقع پیدا ہوتا ہے۔ قوم سے ربط فرد پر بعض پابندیاں عائد کر دیتا ہے۔ ان پابندیوں کے بغیر افراد یکجا ہو ہی نہیں سکتے، لیکن یہ پابندیاں ایسی ہیں جو افراد کی حقیقی آزادی کی ضامن ہیں، کیونکہ اس کے سامنے اعلیٰ مقاصد آتے ہیں اور وہ مفید اغراض کے لیے متواتر جد و جہد شروع کرتا ہے۔ جماعت میں پہنچ کر فرد ایک ضابطے، قانون اور آئین کا پابند ہو جاتا ہے۔ جو ہرن اِدھر اُدھر بے مقصد دوڑتا پھرتا تھا، آئین کی پابندی سے اس میں نافہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد خودی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب وہ خلوت سے نکل کر جلوت میں آتی ہے تو اُس کے دل سے "من" مٹ جاتا اور "تو" پیدا ہو جاتا ہے یعنی وہ سراپا جماعتی اغراض کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ اس کے اختیارات پر بندھن لگ جاتے ہیں اور محبت کی دولت اُسے دے دی جاتی ہے، یعنی جب تک فرد کے دل میں دوسروں سے محبت و الفت پیدا نہ ہو، وہ ذاتی اغراض کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ میں جو نکتے بیان کر رہا ہوں، یہ فولاد کی طرح تیز ہیں۔ اے مخاطب اگر تو انھیں نہیں سمجھتا تو میرے پاس بیٹھنے سے کیا فائدہ؟

فرد و ملت | حرز ۔ تعویذ ۔

پویا ۔ دوڑنے والا ۔

۱- فرد کے لیے جماعت سے ربط پیدا کرنا رحمت کا باعث ہے کیونکہ خدا نے اس میں جو جوہر رکھے ہیں، وہ جماعت کے بغیر نشوونما کے درجۂ کمال پر نہیں پہنچ سکتے۔

۲- تو کوشش کی آخری حد تک جماعت سے وابستہ رہ۔ یہی ایک صورت ہے کہ تو آزاد لوگوں کے ہنگامے کے لیے باعثِ رونق بنا رہے گا۔

۳- رسول اللہ (صلعم) کے اس ارشاد کو جان کے لیے تعویذ بنالے کہ جماعت سے شیطان دور رہتا ہے۔

واضح رہے کہ التزامِ جماعت کے متعلق روایات بکثرت موجود ہیں، انھیں یہاں نقل کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے، جس سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو اور من شذّ شذّ فی النار تو سب کے سامنے ہے یعنی جو جماعت سے الگ ہوا، وہ آگ میں گیا۔

۴- فرد اور قوم ایک دوسرے کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں،

مطلب یہ کہ افراد کی حالت اچھی ہے تو قوم کی حالت یقیناً اچھی ہوگی۔ قوم کی حالت اچھی ہے تو ہر شخص کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے افراد کی معنوی حالت کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ فرد و قوم کا تعلق رشتے اور گوہر کا یا کہکشاں اور اختر کا تعلق ہے۔ گوہر رشتے کے بغیر ایک لڑی نہیں بن سکتے کہکشاں در اصل ستاروں ہی کا ایک عظیم الشان جھرمٹ ہے۔ وہ ستارے یکجا نہ ہوتے تو کہکشاں صورت پذیر نہ ہو سکتی:

۵- فرد ملت کی بنا پر عزت حاصل کرتا ہے۔ ملت افراد کے مل جانے سے ترکیب پاتی ہے۔

۶- فرد جماعت میں شامل ہو جاتا ہے تو سمجھنا یہ چاہیے کہ ایک قطرہ تھا، جس کے دل میں پھیلاؤ کی طلب نے جوش مارا۔ چنانچہ اس کی طلب پوری ہوئی اور وہ سمندر بن گیا۔

یہ امر محتاجِ تصریح نہیں کہ جس طرح قطروں سے سمندر بنتا ہے، اسی طرح افراد سے قومیں صورت پذیر ہوتی ہیں۔

۷- فرد پرانی سیرت کا سرمایہ دار ہوتا ہے۔ وہ ماضی اور حال کا آئینہ بن جاتا ہے، یعنی ماضی کے اوصاف و خصائص بھی اس میں موجود ہوتے ہیں اور آئندہ کے عزائم و مقاصد بھی اس میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۸- اس کی ذات میں ماضی اور مستقبل جمع ہوتے ہیں اور ابد کی طرح اس کے اوقات کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔

۹- اس کے دل میں بڑھنے اور ترقی کرنے کا ذوق اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ ملت کی صورت میں منظم

ہو جاتا ہے۔ ملّت ہی اس کی سرگرمیوں کا محاسبہ کرتی ہے۔ وہی ان کی اچھائی برائی جانچتی ہے۔ وہی تمام گرم جوشیوں کو ضبط و نظم میں رکھتی ہے:

۱۰۔ فرد کا جسم بھی قوم سے ہوتا ہے اور جان بھی قوم سے۔ دونوں کی حیثیت ظاہر و باطن کی ہے اور یہ سب قوم سے ہوتے ہیں:

۱۱۔ وہ قوم کی زبان سے بولتا ہے اور بزرگوں کے راستے پر سرگرم تگ و دو رہتا ہے۔

۱۲۔ وہ اپنے جیسے دوسرے افراد کی صحبت میں پہنچتا ہے تو اس کی برکت سے زیادہ پختہ اور پائدار ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حقیقتِ حال کے اعتبار سے خود ملّت بن جاتا ہے، یعنی اس کا سوچنا، کھانا، پینا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا سب ملّت کے نقطۂ نگاہ کی بنا پر متعین ہوتا ہے۔

۱۳۔ اس کی تنہائی کثرت کی بنا پر مضبوط و مستحکم ہوتی ہے اور کثرت اس کی وحدت میں پہنچ کر خود وحدت بن جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ فرد دوسرے افرادِ قوم کے ساتھ مل کر پائدار و استوار ہوتا ہے کیونکہ وہ اکیلا نہیں رہتا بلکہ ہزاروں لاکھوں افراد اس کے معین و رفیق ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان سب میں ایک روح، ایک جذبہ، ایک نقشِ عمل اور ایک نصب العین ہوتا ہے، اس وجہ سے انھیں کثیر تعداد کے باوجود ایک سمجھنا چاہیے۔

۱۴۔ فرد اور ملّت کے باہمی تعلق کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شعر الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن اگر ایک بھی لفظ شعر سے باہر نکل جائے تو اس کے مضمون کا موتی ریزہ ریزہ ہو جائے گا یعنی اس میں مضمون باقی نہ رہے گا۔ گویا لفظ پر اپنے لیے اور شعر کو بامعنی رکھنے کے لیے لازم ہے کہ شعر سے الگ نہ ہو۔ اسی طرح فرد کے لیے لازم ہے کہ اپنی اور قوم کی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے جدائی اختیار نہ کرے۔

۱۵۔ دوسری مثال دیتے ہیں کہ جو سبز پتا درخت سے الگ ہو گیا، ظاہر ہے کہ فصلِ بہار سے اس کی امید کا رشتہ ٹوٹ گیا، یعنی بہار آئے گی تو انھیں پتوں میں نئی تازگی پیدا کرے گی، جو درخت کی شاخوں سے وابستہ ہوں گے۔ جو پتے جھڑ گئے، ان کے لیے بہار لازماً ختم ہو گئی۔ یہی مضمون دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے:۔

پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ

۱۶۔ جس فرد نے ملّت کے چشمۂ زمزم سے پانی نہ پیا، اس کے ساز میں نغموں کے شعلے ٹھٹھر کر رہ جائیں گے:

۱۷۔ جب تک فرد تنہا رہتا ہے، اس کے دل میں مقاصدِ عالیہ کی تڑپ پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور اسے قدرت نے عمل کی جو قوت عطا کی ہے، وہ رائگاں جائے گی کیونکہ اس کے سامنے کوئی نصب العین کوئی بڑا کام نہیں۔

۱۸۔ قوم اس کی فکر و نظر اور قوتِ عمل کو ایک ضابطے میں لاتی ہے۔ وہ بے مقصد جھکڑ نہیں رہتا بلکہ صبا کی طرح آہستہ آہستہ اور باقاعدہ چلنے لگتا ہے، جس سے ہر کیاری میں کلیاں کھل جاتی ہیں۔

مطلب یہ کہ فرد تنہا ہو تو وہ ضبط و نظم اور ڈسپلن سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ جماعت میں آتا ہے تو ضبط و نظم کا پابند ہو جاتا ہے اور پابند ہوتے ہی اس کی تمام سرگرمیاں مفید کاموں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔

۱۹۔ قوم فرد پر پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔ باغ کی مثال لی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمشاد کی طرح اسے زمین میں دھنسا دیتی ہے، لیکن یہ پابندیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ فرد کے لیے حقیقی آزادی کا راستہ ہموار ہو جائے۔

۲۰۔ جب فرد ایک ضابطے، ایک قانون، اور ایک آئین کا حلقہ گردن میں ڈال لیتا ہے تو اس کے ادھر ادھر بے مقصد دوڑنے والے آہوؤں نافہ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی اس کے طبعی جوہر کھلنے لگتے ہیں اور وہ جس مقصد کے لیے پیدا ہوا، اسے پورا کرنے لگتا ہے:

خودی اور بیخودی | بیروں دادن – آشکارا کرنا۔

۱۔ اے مخاطب! تو نے خودی اور بیخودی میں تمیز نہیں کی اور وہم و گمان میں پڑا رہا۔

۲۔ پہلے خودی کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں کہ تیری مٹی میں ایک نورانی اور روشن جوہر ہے۔ تجھ میں فہم و دریافت کا جو مادہ پیدا ہوا ہے، یہ بھی اُسی جوہر کی ایک کرن ہے۔

۳۔ اگر وہ خوش ہے تو تو بھی خوش ہے۔ اگر وہ غمگین ہے تو تو بھی غمگین ہے۔ گویا وہ ہر لمحہ الٹ پلٹ میں لگا رہتا ہے اور اس کی یہی الٹ پلٹ تیرے لیے زندگی کا سروسامان ہے۔

۴۔ وہ جوہر اکیلا ہے اور دُوئی کا روادار نہیں۔ اسی کی چمک دمک سے "میں" "میں" ہوں اور "تو" "تو" ہے، یعنی تمام افراد خودی کی بنا پر آگاہ اور باشعور افراد بنتے ہیں:

۵۔ یہی جوہر ہے، جو اپنے آپ کو قائم بھی رکھتا ہے۔ اپنے جلوے بھی بکھیرتا ہے اور اپنی ترقی و استواری میں بھی لگا رہتا ہے۔ وہ نیاز کے پردے میں ناز پالتا ہے۔

۶۔ اس کے سوز سے آگ بلند ہوتی ہے اور یہ چھوٹی سی چنگاری ہونے کے باوجود شعلے پر کمند پھینکتی ہے تاکہ اسے قابو میں لے آئے۔

مطلب یہ ہے کہ خودی میں بے پناہ زور ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو مسخر کر لینے کے لیے بیتاب ہوتی ہے اور قوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ چھوٹی سی چنگاری بڑے سے بڑے شعلے پر بے تکلف جا گرتی ہے:

۷۔ اس کی فطرت آزاد بھی ہے اور قید بھی اور اس کے جزو میں کل پر قابو پا لینے کی قوت موجود ہے۔ آزاد اس لیے کہ جماعتی ضابطہ قبول کرنے سے پیشتر خودی جو چاہے کر سکتی ہے۔ قید اس لیے کہ وہ اپنے ایک خاص دائرے سے

باہر نہیں نکل سکتی، اگرچہ اس میں قوت کے ممکنات بے اندازہ ہوتے ہیں۔

۸ – میں نے دیکھا کہ وہ جوہر مسلسل جدوجہد کا عادی ہے، میں نے اُسی جوہر کو خودی بھی قرار دیا اور زندگی بھی۔

۹، ۱۰ – خودی کی حقیقت واضح کرنے کے بعد بیخودی کی طرف آتے ہیں۔ فرماتے ہیں، جب یہ جوہر خلوت سے باہر نکلتا ہے اور جلوت کے ہنگامہ زار میں پاؤں رکھتا ہے تو اس کے دل پر "او" کا نقش ثبت ہو جاتا ہے۔ "من" درمیان سے نکل کر "تو" بن جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ خودی اپنی پہلی منزل سے نکل کر دوسری منزل میں آ جاتی ہے اور ذاتی اغراض سے قطع نظر کر کے جماعتی اغراض اپنا لیتی ہے۔ "میں" کے "تو" بننے کا مطلب یہی ہے۔ جب تک "میں" "میں" تھا، اس میں خود غرضی تھی، ایثار نہ تھا۔ جب "میں" "او" اور "تو" بنا تو خود غرضی محو ہو گئی اور اس کی جگہ ایثار نے لے لی۔

۱۱ – جماعت خودی پر پابندیاں عائد کر دیتی ہے، گویا جبر خودی کا اختیار ختم کر دیتا ہے اور اسے محبت کی دولت بخش دیتا ہے۔

جیسا کہ تمہید میں عرض کیا جا چکا ہے، جب تک فرد کا دل محبت سے معمور نہ ہو، وہ جماعتی مقاصد کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا اہل ہو ہی نہیں سکتا۔ خودی پہلی منزل میں خود مختار تھی، دوسری منزل یعنی جماعت میں پہنچتے ہی اس نے اپنے اختیارات پر پابندیاں قبول کر لیں اور یہ پابندیاں اس صورت میں قبول کیں کہ اس کا دل محبت سے لبریز ہو چکا تھا۔

۱۲، ۱۳ – ناز جب تک ناز ہے، اس سے نیاز پیدا نہیں ہوتا۔ جب بہت سے ناز اکٹھے ہو جاتے ہیں تو نیاز رونما ہو جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ فرد جب تک الگ رہتا ہے، اس کے لیے ایثار کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اپنی اغراض کا شیدا رہتا ہے گویا ناز ہوتا ہے، نیاز بالکل نہیں۔ لیکن جب جماعت میں آتا ہے اور دوسرے "اناؤں" سے دوچار ہوتا ہے تو ان سب میں ایک دوسرے کے لیے ایثار کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ ایثار ہی کو اقبال نے نیاز قرار دیا۔ خودی علیحدگی سے نکل کر جماعت میں پہنچتی ہے تو خود شکنی سے جماعت کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتی ہے۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ پھول کی ایک پنکھڑی باغ کی صورت اختیار کرے۔

۱۴ – خودی اور بیخودی کا تعلق واضح کر چکنے کے بعد مولانا روم کا مشہور شعر دہراتے ہیں کہ میں جو نکتے بیان کر رہا ہوں، وہ فولادی تلوار سے زیادہ تیز ہیں۔ اگر تو انھیں نہیں سمجھتا تو میرے سامنے سے دور ہو جا۔

تیسرا باب

تربیتِ ملّت اور نبوّت

اس باب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ملت افراد کے میل جول سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوت پر موقوف ہے۔

تمہیدایا فرماتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں، ابتدا میں انسانوں کے اندر میل جول کیونکر پیدا ہُوا، صرف اتنا جانتے ہیں کہ فرد فطرتاً انفرادیت کی طرف مائل تھا، لیکن اس کی حفاظت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ دوسروں سے رل جاتا۔ اس طرح ذاتی حفاظت کے تقاضے نے لوگوں کو اکٹھا کر دیا اور وہ زندگی کی جد و جہد میں ایک دوسرے کے رفیق بن گئے، مگر اُن کی حالت بڑی ہی خراب تھی۔ وہ تمدّن اور تہذیب سے ناآشنا تھے۔ دیوؤں اور پریوں پر اُن کا اعتقاد تھا۔ انھیں چیزوں سے ڈرتے تھے جو خود اُن کے وہم کی پیداوار تھیں۔ ان کے اجزائے ترکیبی کا سرمایہ صرف ایک شے تھی، یعنی جان کا خوف۔ ذرا تیز ہوا چلتی تو ان کے دل لرز جاتے۔ پھر وہ محنت مشقت سے بھاگتے تھے اور اس کائنات میں خدا نے انسانوں کے لیے جو برکتیں اور بصیرتیں رکھی تھی، ان سے فائدہ اُٹھانے کو تیار نہ تھے۔ جو کچھ زمین سے اُگتا یا درختوں سے گرتا، اسی پر گزارا کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی کے لیے نبی پیدا کیے، جنھوں نے انسانوں کو تہذیب و تمدّن کا راستہ دکھایا اور وہ منظم قومیں بن گئے۔ کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا۔ انسانوں کو اُن کے بنائے ہوئے خداوندوں سے آزادی دلائی۔ انبیاء ہی نے انسانوں کو نظام و دستور عطا کیے، توحید سکھائی اور خدا کے آگے جھکنے کی تعلیم دی۔

انسانوں کی ابتدائی حالت آوردگاہ۔ میدانِ جنگ۔

نبرد۔ لڑائی۔ پیکار۔

بادہ با پنبہ چیدن۔ فارسی میں کنایہ ہے شراب کی تنگی اور قلت کے لیے یعنی شراب اتنی تھوڑی تھی کہ ایک چھوٹے سے پنبے میں جذب ہو گئی۔

۱۔ کچھ معلوم نہیں کہ انسانوں میں اوّل اوّل میل جول کیونکر پیدا ہُوا۔ اس کہانی کا ابتدائی رشتہ بالکل غائب ہے۔

۲۔ ہم فرد کو جماعت میں دیکھتے ہیں اور باغ سے اُسے پھول کی طرح چُن لیتے ہیں۔

۳۔ اُس کی فطرت انفرادیت کی دلدادہ ہے، لیکن اس کی حفاظت کا تقاضا یہ ہے کہ انجمن آراستہ کر کے زندگی

بسر کرے، یعنی بہت سے افراد مل جل کر رہیں

۴- زندگی کے میدانِ جنگ کی آگ فرد کو شاہراہ حیات میں جلا دیتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لیے انسان کو جو جد و جہد کرنی پڑتی ہے، وہ اتنی مصیبت خیز ہوتی ہے کہ وہ تنہا اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، جماعت ہی میں یہ جد و جہد ممکن ہے۔

۵- انسان اسی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور موتیوں کی طرح ایک رشتے میں پروئے گئے۔

۶- وہ زندگی کی جنگ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، جس طرح ایک پیشے کے مختلف آدمی اکٹھے کام کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی اکٹھے ہو گئے۔

۷- تاروں کی محفل کو دیکھو، یہ ایک خاص کشش کی بدولت قائم ہے۔ ایک تارے کی ہستی دوسرے تارے کی وجہ سے استوار ہے۔

۸- قافلہ سفر شروع کرتا ہے تو پہاڑ، پہاڑیاں، چراگاہیں، صحرا کا دامن اور ریت کے ٹیلے، جہاں بھی چاہے خیمے لگا لیتا ہے۔

۹- فرماتے ہیں، انسان کے کاروبار کا تانا بانا بہت ہی بودا اور بیجان سا تھا، گویا اُس کے غور و فکر کی کلی کھل کر پھول نہیں بنی تھی۔

۱۰- اُس کے جس ساز کی آواز سے بجلیاں پیدا ہونے والی تھیں، وہ ابھی چھیڑا نہیں گیا تھا اور انسان کا نغمہ ابھی پردوں میں نامکمل پڑا تھا۔

۱۱- اس نے ابھی تلاش و جستجو کی تنبیہ کا تجربہ نہیں کیا تھا اور اس کے دل پر آرزو کی مضراب کی چوٹ نہیں لگی تھی۔

۱۲- جو محفل تازہ پیدا ہوئی تھی، اس کے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ شراب اتنی کم تھی کہ چھوٹے سے پینے میں جذب ہو سکتی تھی۔

۱۳- اس کی خاک سے سبزے نے ابھی سر نکالا ہی تھا اور اس کے انگور کی رگوں میں لہو سرد پڑا تھا۔

۱۴- اُس کے فکر و خیال پر دیو، پری اور بھوت پریت چھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہی اوہام سے جو چیزیں تراشتا تھا، انہیں سے ڈر کر بھاگتا تھا۔

۱۵- انسان کی زندگی ناپختہ تھی۔ اس کا میدان بہت تنگ تھا اور اس کی سوچ بچار نارسا تھی۔

۱۶- جان کا خوف انسان کی آب و گل کا سرمایہ تھا، یعنی اس کے اجزائے ترکیبی نے خوفِ جان کے سوا کوئی چیز پیدا نہ کی تھی۔ تیز ہوا بھی چلتی تو اس کا دل لرز جاتا۔

یہ حقیقت محتاجِ تصریح نہیں کہ جب تک انسان پر جان کا خوف طاری رہا، وہ دنیا میں کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دے سکا۔ یہ بڑے بڑے کارنامے جو مختلف گروہوں اور قوموں نے انجام دیے اور جنھیں ہم انسان کے قابلِ فخر کارنامے سمجھتے ہیں، وہ سب خوفِ جان سے آزاد ہونے کے بعد ہی انجام پا سکے:

۱۷- انسان کی جان محنت و مشقت سے دُور بھاگتی تھی اور اس نے فطرت کے دامن میں کبھی پنجہ نہیں مارا تھا۔

۱۸- جو کچھ خود بخود زمین سے اُگ آتا یا اوپر سے گر پڑتا، اُسی کو اُٹھا کر گزارا کر لیتا یعنی کھیتی باڑی یا کسی دوسرے ذریعۂ معاش کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ جہاں کوئی چیز مل جاتی، وہ سبزی ہوتی یا کسی درخت یا جھاڑی کا پھل، اسی پر انسان قانع تھا۔

نوبت | آوازہ۔ موسیقی کی اصطلاح میں وہ نوا جو مقام سے ترکیب پائے۔ یہاں اشارہ دعوتِ نبوت کی طرف ہے، لہٰذا مراد ہے دین و دنیا کے لیے بہترین راستہ۔

ارج- قیمت، مرتبہ، قدر۔

چشمک زن- آنکھ سے اشارہ کرنے والا۔ محاورے میں یہ طنز اور تحقیر کے لیے مستعمل ہے۔

عقلِ عریاں- نری عقل، عقلِ محض، وہ عقل جو کسی آسمانی یا روحانی سرچشمے سے فیضیاب نہ ہو:

عالمِ انسانیت کی اس ابتدائی اور غیر متمدن حالت کا ذکر کر چکنے کے بعد فرماتے ہیں:

۱- یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی صاحبدل پیدا کر دیتا ہے جو ایک حرف سے ایک دفتر لکھوا دیتا ہے:

صاحبدل سے مراد نبی ہے۔ حرف سے دفتر لکھوانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اُس وحی کی روشنی میں نبی قوم کے لیے پورا دستورِ حیات مرتب کر دیتا ہے۔

۲- اُس کی سازنوازی میں ایسا اعجاز ہوتا ہے کہ دو مقاموں سے ترکیب پائی ہوئی ایک نوا سناتا ہے اور خاک کو نئی زندگی بخش دیتا ہے:

مراد یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کے لیے اِس دنیا اور آنے والی دنیا کی زندگی کے متعلق ایک مکمل دستورِ عمل تیار کر دیتا ہے، جس سے قوم کی قوم جاگ اُٹھتی ہے۔ بے حس و حرکت خاک کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑ جاتا ہے:

۳- بے حقیقت ذرّہ اُس صاحبدل سے نورِ حق کی روشنی حاصل کر لیتا ہے اور جو بھی جنس اس کے پاس ہو، اس میں نئی قدر و قیمت پیدا ہو جاتی ہے:

۴- اُس کی ایک پھونک سے دو سو پیکر زندہ ہو جاتے ہیں۔ اُس کے ایک پیالے سے پوری محفل میں رونق اور رنگینی

پیدا ہو جاتی ہے۔

واضح رہے کہ دو سو پیکر سے مراد دو سو عدد نہیں بلکہ یہ بھی کثرت کی تعبیر کا ایک طریقہ ہے۔ یعنی ایک پھونک سے ہزاروں پیکر زندہ ہو جاتے ہیں۔

۵ - صاحبدل کی نگاہوں میں خاص جذب و کشش کا اعجاز ہوتا ہے۔ اس کے لبوں سے جو کچھ نکلتا ہے، وہ سننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی مقدس تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں سے دوئی اور بیگانگی مٹ جاتی ہے، وحدت اور یگانگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسانوں کو وحشت و درندگی کی زندگی سے نکال کر انسانیت کے رتبۂ اشرفیت پر پہنچانے کا کام صرف انبیاء نے انجام دیا یا وہ لوگ استطاعت کے مطابق اس میں کامیاب ہوئے جو انبیاء کے نقشِ قدم پر چلے۔ انبیاء ہی تھے، جن سے انسانوں کو فکر و نظر کی پاکیزگی اور تہذیب و شائستگی ملی۔ انبیاء ہی تھے جنھوں نے بے مقصد پھرنے والے حیوانوں کو ایک مسلک پر جمع کیا اور ان کے سامنے صحیح نصب العین رکھا۔ سورۂ انفال میں ایک مقام پر رسول اللہ صلعم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ "اللہ ہی تیرے لیے کافی ہے۔ اُسی نے تجھے اپنی نصرت اور مومنوں کی مدد سے نوازا۔ اُسی نے مومنوں کے دلوں میں الفت پیدا کی۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو زمین میں موجود ہے تو ان کے دلوں میں ہرگز الفت پیدا نہ کر سکتا۔ یہ الفت اللہ نے پیدا کی۔" دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے اُلفت و محبت پیدا کرنا اور انھیں وحدت کے رشتے میں پرونا اتنا دشوار کام ہے کہ زمین کی پوری دولت خرچ کر چکنے کے باوجود انجام نہ پا سکتا، لیکن اللہ اپنی رحمت سے انبیاء کو یہ قوت عطا کر دیتا ہے کہ وہ اسے کم سے کم مدت میں پورا کر دیتے ہیں، خصوصاً رسول اللہ صلعم نے جتنی کم مدت میں نہایت عظیم الشان پیمانے پر یہ کام انجام دیا، اس کی کوئی مثال کائنات کی تاریخ آج تک پیش نہ کر سکی اور نہ قیامت تک پیش کر سکے گی۔

۶، ۷ - اُس صاحبدل کے فیضِ روحانی کا سلسلہ آسمان (عالمِ بالا) سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک کُل بنا دیتا ہے۔

زندگی کے ٹکڑوں سے مراد ہیں مختلف انسان اور کُل سے مراد ہے قوم جو نبی کی آغوشِ تربیت میں پلتی ہے۔ وہ انسانوں کی نگاہوں میں نیا انداز پیدا کر دیتا ہے اور صحراؤں کو گلزار بنا دیتا ہے، جن میں رنگ رنگ کے پھولوں، طرح طرح کی خوشبوؤں اور گوناگوں پھلوں کی فراوانی ہو۔

۸۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ حرمل کا دانہ آگ پر رکھا جائے تو اس سے ایک خاص آواز نکلتی ہے اور وہ اچھل کر باہر جا پڑتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ صاحبدل کی حرارت پوری قوم کو حرمل کے دانے کا رقص بنا دیتی ہے یعنی قوم ایک نعرے اور ایک ہنگامے کے ساتھ خدا کی راہ میں ہمہ تن سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔

۹۔ صاحبدل ایک چنگاری اُس قوم کے دل میں ڈال دیتا ہے اور اُس کی خاک کو ایک ایسا شعلہ بنا دیتا ہے، جو ہر شے کو گرفت میں لے لینے کے لیے مضطرب ہو۔

۱۰۔ اُس کے پاؤں کا نقش خاک میں بینائی کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ ذرّے میں تجلیات کا ایسا سروسامان بہم پہنچا دیتا ہے کہ وہ طُورِ سینا سے چشمک زنی کرتا ہے۔

۱۱،۱۲۔ یہ صاحبدل برہنہ عقل کو لباس پہنا دیتا ہے تاکہ اُس کی برہنگی چھپ جائے اور اس مفلس و قلاش کو سرمایہ بخش دیتا ہے۔ اُس عقل کے انگاروں کو دامن سے ہوا دیتا ہے۔ اس طرح اس کے سونے کو پگھلا کر سارا کھوٹ باہر نکال لیتا ہے۔ جب تک عقل آسمانی ہدایت سے فیضیاب نہ ہو، وہ عقل محض رہتی ہے، جسے اقبال نے عقلِ عریاں کا نہایت موزون نام دیا یعنی ایسی عقل جو ہر لباس سے عاری ہو اور ظاہر ہے کہ عریانی کسی کے لیے بھی باعث فخر نہیں ہو سکتی۔ نبی جو آسمانی فیض حاصل کرتا ہے، اس سے عقل محض کے لیے صحیح راہِ فکر تجویز کر دیتا ہے، جس میں وہ ٹھوکروں کی رسوائی سے محفوظ رہتی ہے۔ اسی شے کو اقبال نے برہنہ عقل کے لیے لباس قرار دیا۔

مادۂ عقل بہرحال وہی رہتا ہے جو فیضان وحی اور تعلیم نبی سے پیشتر تھا، لیکن نبوت اُسے پگھلا کر کھوٹ الگ کر دیتی ہے اور خالص سونا باقی رہ جاتا ہے؛ گویا تعلیم نبوت سے پیشتر کی عقلِ عریاں تعلیم کے بعد عقلِ سلیم بن جاتی ہے۔

۱۳،۱۴۔ نبی کی تعلیم انسانوں کے پاؤں کو اُن بیڑیوں سے آزاد کر دیتی ہے جو اس نے خود بخود پہن لی تھیں اور جو انسان مختلف دیوتاؤں اور معبودوں کی پرستش میں لگا ہوا تھا، اسے تمام پرستشوں سے نجات دلا کر ایک خدا کی چوکھٹ پر لے آتی ہے۔ اُسے بتاتی ہے کہ تو خواہ مخواہ دوسروں کا غلام کیوں بنتا ہے؟ کیا تو اُن بتوں سے بھی کمتر ہے جو بول نہیں سکتے؟

یہاں حضرت ابراہیمؑ کے اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر سورۂ انبیاء میں آیا ہے، یعنی حضرت ابراہیمؑ قوم کو بُت پرستی سے روکتے تھے۔ قوم کہتی تھی کہ ہمارے باپ دادا انھیں بتوں کو پوجتے آئے ہیں اور ہم انھیں کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک دن موقع پا کر بڑے بُت کو چھوڑ، باقی تمام بُتوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ بت پرستوں نے یہ کیفیت دیکھی تو مجرم کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کے خلاف شہادت ملی تو ان سے پوچھا کہ آیا تم نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ فرمایا، یہ سب کچھ تو اس بڑے بُت نے کیا ہے۔ تمھارے بُت بول سکتے ہیں تو اُن سے

پوچھو۔ انھوں نے سر نیچا کیا اور کہا: اے ابراہیمؑ! تُو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔ حضرت ابراہیمؑ نے مخاطب فرمایا، پھر کیا تم ان کی پوجا کرتے ہو جو نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان؟ تُف ہے تم پر اور تمھارے معبودوں پر جنھیں خدا کے سوا تم پوجتے ہو۔ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ نبی انسانوں سے یہی کہتا ہے، کیا تم ان بے زبان بتوں سے بھی فروتر ہو؟

۱۵ - نبی انسانوں کو ایک مقصد کی طرف لے جاتا ہے، ضابطے اور آئین کی زنجیران کے پاؤں میں ڈال دیتا ہے یعنی انھیں ایک اچھے دستور کا پابند بنا دیتا ہے۔

۱۶ - پھر اُن کے دل میں توحید کا نکتہ بٹھاتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ خُدا کے سامنے جھکنے، اس کی عبادت کرنے اور اس کے حکموں کو ماننے کا کیا طریقہ ہے۔

چوتھا باب

پہلا رکن ——— توحید

توحید: اِنّی الرحمٰن عبدا۔ اشارہ ہے سورۂ مریمؑ کی اس آیت کی طرف:

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، وہ اسی لیے
اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا — ہے کہ اس کے آگے بندگی کا سر جھکائے حاضر ہو۔

۱ - عقل اس مادی دنیا میں حیران و سرگرداں پھرتی رہی اور اس نے ہر طرف چکر لگائے۔ صرف توحید کے ذریعے اس کے لیے منزل پر پہنچنے کا بندوبست ہُوا۔

کیف و کم سے مراد ہے کیسا اور کتنا۔ جہانِ کیف و کم اسی مادی دنیا کو کہتے ہیں کیونکہ اس کی برتنے کا پیمانہ کیفیت اور مقدار کے سوا کچھ نہیں، یعنی شے کیسی ہے اور کتنی ہے۔ جب سے انسان نے ہوش کی آنکھ کھولی، وہ اس تلاش میں مصروف ہو گیا کہ دنیا کی گتھی سلجھائے۔ یہ معلوم کرے کہ دنیا خود بخود پیدا ہو گئی یا کسی نے پیدا کی؟ کسی نے پیدا کی تو پیدا کرنے والا کون ہے؟ پیدا کرنے کا مقصد کیا تھا کیا ہے؟ اس کے بعد کیا ہوگا؟ غرض اس قسم کے سوالات انسان کے سامنے برابر آتے رہے اور

عجیب وغریب جواب پیش کیے گئے۔ مظاہر پرستی، بُت پرستی، اوہام پرستی اور اس قسم کی تمام چیزیں انھیں جوابات کی مختلف عملی صورتیں تھیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ عقل کی تمام سرگردانیاں اسے منزل کا سراغ نہ بتا سکیں۔ جب توحید عقلِ انسانی کے روبرو آئی تو اُس کی روشنی میں حقیقت کا نشان مل گیا اور عقل منزل پر پہنچنے کی اہل ہوئی۔

۲۔ اگر توحید کی روشنی نہ ملتی تو مسکین عقل منزل پر کیونکر پہنچ سکتی؟ تہہ و دریافت کی کشتی کو ساحل کیونکر میسر آتا؟ جب تک کشتی سمندر یا دریا میں رہتی ہے، مسلسل چلتی ہے۔ اسے سکون کنارے ہی پر پہنچ کر نصیب ہوتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ توحید کے سوا عقل کے لیے کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ راستہ نہ ملتا تو اس کی کشتی موجوں ہی کے تھپیڑے کھاتی رہتی، ساحل پر ہرگز نہ پہنچتی؛

۳۔ اہلِ حق توحید کی رمز کے ہر پہلو سے آگاہ ہیں۔ یہ رمز سورۂ مریمؑ کی اس آیت سے واضح ہے، جس کے آخر میں آتی الرحمٰن عبدا آتا ہے اور جس کا ترجمہ اوپر لکھا جا چکا ہے؛

۴۔ تو توحید کے بھیدوں سے اُس وقت تک پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکتا، جب تک عمل کے ذریعے سے اس کی آزمائش نہ کرے، یعنی محض زبان سے اللہ کو ایک کہہ دینا کافی نہیں۔ توحید پر عمل پیرا ہو اور اس کا منشا مانا کہ ایسی صورت میں تجھ پر آشکارا ہوگا کہ اس کے حقیقی بھید کیا ہیں۔

۵۔ دین توحید سے ہے، عقل توحید سے ہے، شریعت توحید سے ہے، زور و قوت اور ثبات و استحکام توحید سے ہے۔

۶۔ توحید کی جلوہ افروزی عالموں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے، عاشقوں کو عمل کی قوت وقدرت عطا کرتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ صرف علمی نقطۂ نگاہ سے توحید پر نظر ڈالتے ہیں، وہ اس کے گوناگوں جلووں پر حیران رہ جاتے ہیں، لیکن جن کا ایمان توحید پر پختہ ہو جاتا ہے، وہ اسی کے بل پر بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ تاریخ میں حق کے لیے قربانیوں کا جو بھی ذخیرہ موجود ہے، وہ توحید پر ایمان کے عملی کرشموں ہی کا ثبوت ہے؛

۷۔ جو شے رتبے میں پست ہے، وہ توحید کے سایے میں پہنچتے ہی بلند ہو جاتی ہے... یہ حقیقت مٹی توحید کی بدولت اپنے اندر اکسیر کی قدر و قیمت پیدا کر لیتی ہے؛
اس کی بہترین مثال عرب ہیں، جو اسلام سے پیشتر تمام قوموں کے نزدیک سراسر ناکارہ اور بے قدر تھے، لیکن توحید نے کم سے کم وقت میں انھیں اس بلندی پر پہنچا دیا کہ وہ تہذیب تمدن، سیاست، جنگ، علم، اخلاق، تجارت غرض زندگی کے ہر شعبے میں دنیا بھر کے مربی ور

رہنما بن گئے ؛

۸۔ توحید کی قوت انسان کو بلندی پہ پہنچا دیتی ہے اور اس میں نئی طرح کی زندگی پیدا کر دیتی ہے ؛

اس کی بہت سی مثالیں بھی عرب ہی کی تاریخ میں ملیں گی۔ حضرت صدیقؓ، حضرت فاروقؓ، حضرت علیؓ، حضرت خالدؓ وغیرہم نے کہیں تعلیم و تربیت نہیں پائی تھی، لیکن جب اُن کے لیے وقت کی سب سے بڑی طاقتوں کے خلاف جنگ ناگزیر ہو گئی تو وہ بلا تحاشا میدانِ جنگ میں اُتر پڑے اور ان طاقتوں کو مٹی کے کھلونوں کی طرح ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ سامان کی فراوانی، وسائل کی وسعت اور تجربے کی پختگی ان قوتوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی۔ پھر ان نہایت متمدن طاقتوں کا انتظام عربوں کے قبضے میں آیا تو انھوں نے عدل و توازن کا ایک ایسا بلند معیار قائم کر دیا کہ آج تک کوئی حکومت اس کے قریب بھی نہ پہنچ سکی۔ دیکھو صرف توحید نے ان بزرگوں کو زندگی کے نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا

۹۔ خدا کی راہ میں صاحب توحید کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اس کی رگوں میں جو خون ہے، وہ بجلی سے بھی زیادہ گرم ہو جاتا ہے ؛

۱۰۔ خوف اور شک کے کانٹے دل سے نکل جاتے ہیں۔ عمل کا جوش و ولولہ زندہ ہو جاتا ہے۔ آنکھ کائنات کے چھپے ہوئے حقائق دیکھنے لگتی ہے۔

۱۱۔ جب خدا کا بندہ عبدہٗ کے مقام پہ جم کر بیٹھ جاتا ہے یعنی وہ بندگی کے انتہائی مرتبے پہ پہنچ جاتا ہے تو بھیک کا کاسہ جامِ جم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بھیک کے کاسے کا مطلب یہ ہے کہ انسان قوتِ لایموت کے لیے بھی لوگوں کے دروازوں پہ سوال کرتا پھرے، جامِ جم سے مراد وہ پیالہ ہے، جس سے جمشید جیسے جلیل القدر شہنشاہ نے عالمگیر شہرت پائی اور اس میں وہ پیش آنے والے واقعات دیکھ لیتا تھا۔ گویا وہ شے جو انسان کو دنیا کی ہر شے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یقیناً بندگی کا اعلیٰ درجہ یہی ہے کہ بھکاری بے نیازی کے بلند ترین مرتبے پہ پہنچ جائے۔

توحید کے عملی کرشمے | عیار۔ کسوٹی۔ پیمانہ

۱۔ ملتِ بیضا جسم ہے اور اس کی جان کلمۂ توحید ہے۔ ہمارے ساز کے پردوں سے نغمے صرف توحید کی بدولت نکل رہے ہیں ؛

۲۔ توحید ہمارے تمام بھیدوں کا سرمایہ ہے۔ توحید کا رشتہ ہمارے افکار و خیالات کے لیے شیرازے کا کام دیتا ہے ؛

۳۔ جب لا الٰہ لبوں سے گزرتا ہوا دل میں اُترتا ہے تو زندگی کی قوت بڑھا دیتا ہے۔

۴۔ اگر پتھر لا الٰہ کا نقش قبول کرے تو وہ دل بن جائے گا۔ اگر دل لا الٰہ کی یاد سے حرارت حاصل نہ کرے تو وہ مٹی کی مانند حقیر ہیچ اور بے قیمت رہ جائے گا۔

۵۔ ہم نے جب توحید کے غم میں دل کی آگ بھڑکائی تو اس دنیا کے خرمن کو ایک آہ سے جلا دیا۔

۶۔ ہمارے سینوں میں دل پانی پانی ہو گئے۔ توحید کی حرارت نے ان آئینوں کو پگھلا دیا۔

۷۔ لالے کے پھول کی طرح توحید کا شعلہ ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اس داغ کے سوا دنیا میں ہمارا کوئی سرو سامان نہیں۔ یعنی ہمارا کل سرمایہ شعلۂ توحید ہے اور بس۔ ہماری زندگی کا مقصد بجز اشاعت و اقامتِ توحید کے سوا کچھ نہیں۔

۸۔ توحید کی برکت سے سیاہ رنگ کا آدمی سُرخ رنگ کے آدمی کا ہمسر بن جاتا ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے یگانہ بزرگانِ ملت سے رشتۂ خویشی پیدا کر لیتا ہے۔ یہاں صرف حضرت بلالؓ کی مثال پیش کر دینا کافی ہے۔ اگرچہ وہ حبشی تھے، لیکن اسلام کی برکت نے انھیں وہ رتبہ عطا کیا کہ حضرت فاروق اعظمؓ انھیں سردار کہہ کر پکارتے تھے۔

۹۔ دل خویشی اور بیگانگی کا مقام ہے۔ شوق کا تقاضا یہ ہے کہ اکٹھے بیٹھ کر پییں اور مستی طاری ہو۔

۱۰۔ ہماری ملت کی بنیاد دلوں کی یک رنگی پر قائم ہے۔ یہ کوہِ سینا ایک ہی جلوے سے روشن ہے۔ اس شعر میں ملت کو کوہِ سینا سے تشبیہ دی ہے۔

۱۱و۱۲۔ لازم ہے کہ قوم کے خیال و فکر میں یک جہتی قائم رہے اور تمام افرادِ قوم کے دلوں کا مقصد و مدعا ایک ہو۔ قوم کی فطرت میں ایک ہی جذبہ ہونا چاہیے اور اس کے لیے اچھائی بُرائی کا پیمانہ بھی ایک ہی لازم ہے۔

۱۳۔ جب تک فکر کے ساز میں حق کا سوز موجود نہ ہو، سوچنے کا ایسا انداز پیدا ہی نہیں ہو سکتا:

مراد یہ ہے کہ صرف حق کی تڑپ قوم میں فکری اور عملی وحدت پیدا کر سکتی ہے اور حق کی تڑپ محض توحید سے پیدا ہو سکتی ہے

ملت کی بنیاد | ابیکم۔ اشارہ ہے سورۂ حج کی اس آیت کی طرف،

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ

اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو جو جان لڑا دینے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں برگزیدہ کیا کہ یہ چنا اور تمھارے لیے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی۔ وہی تمھارا طریقہ ہوا جو تمھارے باپ ابراہیم

کا تھا۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا

اَلْمُسْلِمِیْنَ ۵

اساس۔ بنیاد۔

کیش۔ ترکش۔ مسلک۔ مذہب۔

۱۔ ہم مسلمان ہیں اور حضرت ابراہیم خلیلؑ کی اولاد ہیں۔ اگر تجھے اس بارے میں کسی دلیل کی ضرورت ہے تو دیکھ، قرآن مجید نے حضرت ابراہیمؑ کو ہمارا باپ کہا ہے۔

۲۔ دنیا میں جتنی قومیں ہیں، ان کی تقدیریں وطن سے وابستہ ہیں یا قوموں نے نسب کی بنا پر اپنی تنظیم کا بندوبست کیا ہے۔

مطلب یہ کہ قوموں نے تنظیم کے لیے زیادہ تر دو چیزیں پیش نظر رکھیں یا تو کسی جغرافیائی حلقے کو اپنا وطن بنایا، جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے اور آج کل ہر جگہ وطن ہی قوم کی بنیاد ہے یا بعض مقامات پر نسب کو بنیاد قومیت بنایا گیا، جیسا کہ سوویٹ روس میں ہوا کہ الگ الگ قوموں کی جمہوریتیں بن گئیں، جیسے ترکمانستان، ازبکستان، تاجکستان وغیرہ۔

۳، ۴۔ ان دونوں بنیادوں کی بے حقیقتی واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: بھلا وطن کو قوم کی بنیاد قرار دینا کیا لغویت ہے! کیا انسان کے لیے پانی، مٹی اور ہوا کی پرستش زیبا ہے؟ نسب پر فخر کرنا سراسر حماقت ہے۔ نسب کی کارفرمائی صرف بدن تک محدود ہے اور بدن مرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔

۵۔ ہماری قوم کی بنیاد دوسری ہے۔ یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پیوست ہے

۶۔ ہم خود موجود ہیں، لیکن ہمارے دل نے اس ذات پاک سے وابستگی پیدا کر لی ہے جو انسان کی گرفت سے بہت بلند ہے اور جسے قرآن کی اصطلاح میں "غائب" کہا گیا ہے، لہٰذا ہم ادھر ادھر کے تمام بندھنوں سے آزاد ہو گئے۔

۷۔ ہمارے افرادِ قوم کو جو رشتہ ایک دوسرے سے وابستہ کیے ہوئے ہے، وہ ویسا ہی ہے، جیسا تاروں کے درمیان قائم ہے۔ وہ موجود ہے، لیکن نگاہ کی طرح ہماری نگاہوں سے گم ہے، یعنی جس طرح تاروں کے درمیان کشش یا جذب ہمیں نظر نہیں آتا، اسی طرح ہمارے درمیان جو رشتہ ہے، اگرچہ وہ نظر نہیں آتا لیکن ہمارے دل اس میں بندھے ہوئے ہیں۔

۸۔ ہماری مثال اُن تیروں کی سی ہے، جن کے پیکان بڑے خوب صورت ہیں اور ہمارا ترکش ایک ہے ہم ایک نظر آتے ہیں، ایک نظر سے دیکھتے ہیں اور ایک طریق پر سوچتے ہیں۔

۹۔ ہمارا مقصد، ہمارا نظامِ رجوع اور ہمارا اندازِ خیال ایک ہے۔

۱۰۔ ہم پر اللہ تعالیٰ کی نعمت رحمت بن کر نازل ہوئی اور اس کی بدولت ہم بھائی بھائی بن گئے۔ ہماری زبانیں ایک ہوگئیں، ہمارے دل ایک ہو گئے، ہماری جانیں ایک ہو گئیں۔ اس شعر کا پہلا مصرع قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ج (آل عمران)	اور سب مل جل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔ اللہ نے تمھیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تمھارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے۔

پانچواں باب

یاس، حُزن اور خوف

اس باب میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ یاس، حُزن اور خوف تمام برائیوں کا سرچشمہ ہیں، ان سے زندگی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ توحید ان تمام ناپاک بیماریوں کو دُور کر دیتی ہے۔

تمہید اس باب کے دو بند ہیں۔ پہلے بند میں بتایا گیا ہے کہ انسان آرزوؤں سے محروم ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی موت کا سامان شروع ہو گیا۔ امید کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کے دل میں مسلسل آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں۔ ناامیدی زندگی کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہے۔ انسان کتنا ہی قوی ہو لیکن ناامیدی اسے قبر میں اتار دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے زندگی کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی حالت غم کی ہے۔ یاس اور غم ان دونوں سے محفوظ رہنا چاہیے اور رسول اللہ صلعم کا وہ ارشاد سامنے رکھنا چاہیے، جو غارِ ثور میں حضرت صدیقؓ سے فرمایا گیا تھا اور خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا چاہیے:

دوسرے بند میں خوف کے تباہی خیز اثرات واضح کیے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ خوف موت کی علامت کا جاسوس ہے جو زندگی کا کارخانہ درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ خوشامد، مکاری، جھوٹ، کینہ وغیرہ جتنی بیماریاں ہیں، سب خوف کی فضا میں فروغ پاتی ہیں۔ مسلمان کو ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے، خوف اور غم کو کبھی اپنے پاس نہ آنے

دینا چاہیے۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس دعوت حق دے کر گئے تھے تو لا تخف سے ان کا قلب مستحکم تھا خوف شرک ہی کی ایک قسم ہے۔

یاس و حزن| لا تقنطوا۔ اشارہ سورۂ زمر کی اس آیت کی طرف ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ؕ — اے پیغمبر! کہہ دے کہ اے میرے گنہگار بندو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

الوند۔ ایک بلند پہاڑ جو ہمدان (ایران) کے پاس ہے۔

عمی۔ اندھا۔ نابینا۔

لا تحزن۔ اشارہ ہے سورۂ توبہ کی اس آیت کی طرف:

اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ہُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ؕ — جب کافروں نے اسے (نبیؐ کو) اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ (صرف دو آدمی تھے اور ان میں دوسرا اللہ کا رسولؐ) تھا، اور دونوں غار میں چھپے بیٹھے تھے۔ اس وقت اللہ کے رسولؐ نے اپنے ساتھی سے کہا تھا: غمگین نہ ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

۱۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ موت کا سر و سامان کیا ہے؟ یہ کہ آرزو کا رشتہ کٹ جائے۔ جو شخص آرزو سے محروم ہو، سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی موت کے سامان جمع ہو گئے۔ زندگی کو مضبوط و مستحکم بنانے کا وسیلہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بشارت لا تقنطوا کو سامنے رکھتا ہوا کبھی مایوس نہ ہو۔

۲۔ امید کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان کے دل میں پے در پے آرزوؤں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ناامیدی زندگی کے لیے زہر ہے، جو اسے ختم کر دے گا۔

۳۔ ناامیدی انسان کو قبر کی طرح بھینچ کر رکھ دیتی ہے۔ اگر وہ الوند پہاڑ کی مانند بھی مضبوط و مستحکم ہو تو اسے چت گرا کر دم لیتی ہے۔

۴۔ کمزوری ناامیدی کی بندۂ احسان ہے۔ نامرادی اس کے دامن سے بندھی چلی آ رہی ہے:

مطلب یہ کہ کمزوری، ناتوانی اور نامرادی ناامیدی ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

۵۔ مایوسی زندگی کو سلا دیتی ہے اور اس کے اجزا میں سستی کی رہبر بن جاتی ہے یعنی اس کے اجزا کو سست کر دیتی ہے۔

۶۔ مایوسی کا سرمہ جان کی آنکھ کو اندھا کر دیتا ہے۔ روز روشن اس کی وجہ سے اندھیری رات بن جاتا ہے۔

۷۔ مایوسی کے سانس سے زندگی کی قوتیں مر جاتی ہیں اور اس کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔

۸۔ مایوسی غم کے ساتھ ایک چادر میں سوتی ہے اور غم جان کی رگ کے لیے نشتر ہے۔

ایک چادر میں سونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مستقل ساتھی ہیں:
۹۔ اے مخاطب! تو کیوں غم کے قید خانے میں جکڑا بیٹھا ہے۔ رسول اللہ صلعم کی بارگاہ سے لاتحزن کا سبق حاصل کر، یعنی حالات کتنے ہی ناموافق ہو جائیں، لیکن غمگین کبھی نہ ہو:
۱۰۔ لاتحزن کا سبق صدیقؓ نے صدیقؓ کو پڑھایا تھا اور تحقیق کا جام پلا کر اسے مست کر دیا تھا:
۱۱۔ مسلمان نے رضا کی بدولت روشن ستارے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ہستی کے راستے میں اس کے لبوں پر ہمیشہ تبسم رقصاں رہتا ہے یعنی جس طرح ستارہ مسکراتا ہوا راستہ طے کرتا ہے، بالکل اسی طرح مسلمان راہ رضا پہ چلتا ہوا زندگی کی منزل طے کرتا ہے۔
۱۲۔ اگر خدا پر تیرا عقیدہ پختہ ہے تو غم کے بندھن سے آزاد ہو جا۔ یہ کم، زیادہ کا خیال کیوں تجھے پریشان کرتا ہے۔ اسے دل سے نکال ڈال۔

خوف | لاخوفٌ علیہم۔ یہ ٹکڑا قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ میں:

بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ط ۔

ہاں (بے شک نجات کی راہ کھلی ہوئی ہے، مگر وہ گروہ بندی کی راہ نہیں ہو سکتی، وہ تو ایمان و عمل کی راہ ہے) جس کسی نے بھی اللہ کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور پائے گا۔ نہ تو اس کے لیے کسی قسم کا کھٹکا ہے اور نہ غمگینی۔

لاتخف۔ سورۂ طٰہٰ کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔

جب موسیٰ نے اپنے اندر ہراس محسوس کیا تو ہم نے کہا اندیشہ نہ کر تو ہی غالب رہے گا۔

تنگ تاب۔ طاقت سے محروم۔ کمزور
بزگیر۔ چور۔ مکار۔ حیلہ گر۔
لابہ۔ خوشامد:

۱۔ ایمان کی قوت تیری زندگی بڑھاتی ہے۔ تجھے چاہیے کہ لاخوفٌ علیہم کا ورد جاری رکھے یعنی خوف تیرے پاس پھٹکنے نہ پائے:
۲۔ جب اللہ کا کوئی پیغامبر حضرت موسیٰؑ کی طرح فرعون جیسے جابر کے پاس پیغام حق لے کر جاتا ہے تو اپنے دل کو لاتخف سے مضبوط کر لیتا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے فرعون سے مقابلے کے وقت بشارت

دے دی تھی کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، کامیابی تیرے ہی لیے ہے۔ اسی طرح جو بھی شخص کسی کے پاس جائے، اسے بے خوف ہو کر جانا چاہیے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی کا خوف عمل کی قوّت ختم کر دیتا ہے اور زندگی کے قافلے کو لوٹ لیتا ہے۔

۴۔ بڑے مضبوط ارادے والے آدمی پر بھی خوف کی پرچھائیں پڑ جائے تو وہ سوچنے لگے گا کہ عملی قدم اٹھانے سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے۔ اس طرح اس کا عزم تذبذب میں پڑ جائے گا اور اعلیٰ درجے کی ہمّت اصل کام انجام دینے سے پیشتر سوچ بچار کو اپنی عادت بنا لے گی۔ مطلب یہ نہیں کہ سوچ بچار یا عقل سلیم سے کام نہ لینا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ ہر سوچ بچار کی ایک حد ہے۔ سوچ بچار کو اس پیمانے پر لے جانا چاہیے کہ عمل کی قوّت مضمحل ہوتے ہوتے ختم ہو جائے۔ یقیناً زیادہ سوچ بچار انسان کی قوّت عمل شل کر کے رکھ دیتی ہے۔

۵۔ جب خوف کا بیج انسان کی ہستی میں جگہ پیدا کر لیتا ہے تو زندگی اپنے پورے جوہر نمایاں کرنے سے محروم ہو جاتی ہے۔

۶۔ خوف کی فطرت قوّت اور توانائی سے محروم ہے۔ وہ لرزانے والے دل اور کانپنے والے ہاتھ ہی سے سازگار ہوتی ہے۔ جس شخص کے ہاتھ کانپ رہے ہوں اور دل لرز رہا ہو، اس سے کوئی بھی کام انجام نہیں پا سکتا بلکہ اسے ناکارہ محض سمجھنا چاہیے۔ جہاں خوف ہو، وہ ناکارگی کے سوا کچھ پیدا نہیں کرے گا۔

۷۔ خوف پاؤں سے چلنے کی قوّت چرا لیتا ہے اور دماغ سے سوچ بچار کی صلاحیت چھین لے جاتا ہے۔

۸۔ کیا تو اتنی واضح اور روشن حقیقت کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ اگر دشمن کے سامنے ڈر ظاہر کرے گا تو وہ تجھے اسی طرح اُچک لے جائے گا جس طرح پھول کیاری سے توڑ لیا جاتا ہے۔

۹۔ محض دشمن کی تلوار ہی تجھ پر زیادہ قوّت سے نہیں پڑے گی بلکہ خوف کی حالت میں اُس کی نظر بھی تیرے لیے تلوار بن جائے گی۔

۱۰۔ خوف نے ہمارے پاؤں زنجیر سے جکڑ رکھے ہیں۔ اگر یہ زنجیر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے تو ہمارے دریا سے سینکڑوں طوفان اٹھ سکتے ہیں۔

مطلب یہ کہ قوّت عمل سے ہنگامہ ہائے عظیم بپا کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ قوم خوف سے نجات حاصل کرے۔

۱۱۔ تیرے ساز سے لے کیوں نہیں اٹھتی؟ صرف اس لیے کہ خوف نے تیرے ساز کے تار بہت ڈھیلے کر دیے ہیں۔

۱۲۔ تو وہ تار کس لے تاکہ اُن سے نغمے اٹھنے لگیں اور آہ و نالہ سے آسمان پر محشر بپا ہو جائے۔

۱۳۔ خوف موت کی ولایت کا جاسوس ہے، یعنی وہ موت کی خاطر سرگرم عمل ہے۔ اُس کا باطن نقشِ مرگ کے نیم

کی طرح تاریک ہے۔

مطلب یہ کہ فارسی کا میم لکھا جائے تو میم عربی کے برعکس اس کے اندر کوئی جگہ خالی نہیں ہوتی، بلکہ وہ پورا بھرا ہوتا ہے:

سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے غالباً اللہ اللہ بائے بسم اللہ پہ یہ اعتراض کیا تھا۔ اقبال لکھتے ہیں بائے بسم اللہ حضرت علیؓ کے لیے، قاآنی نے لکھا ہے اور میم سر مولانا جامی نے تحفۃ الاحرار میں لکھا۔ میں نے میم مرگ لکھا تھا۔ (اقبال نامہ حصّہ اول ص۹۶)

۱۴۔ خوف کی آنکھ زندگی کا کارخانہ درہم برہم کر ڈالتی ہے اور اُس کا کان زندگی کے اخبار کا چور ہے، یعنی جو چیزیں زندگی کا سروسامان ہیں، انھیں چُرا لے جاتا ہے:

۱۵۔ جو برائیاں تیرے دل کے اندر چھپی ہوئی ہیں، اگر تو ٹھیک ٹھیک دیکھے تو واضح ہو جائے گا کہ وہ سب خوف سے پیدا ہوئیں:

۱۶۔ خوشامد، مکر و حیلہ، کینہ، جھوٹ، یہ سب خوف ہی سے فروغ پاتے ہیں:

۱۷۔ مکاری اور ریاکاری کے پردے سے خوف کا پیراہن تیار ہوتا ہے اور اس کا دامن فتنوں کے لیے ماں کی گود ہے، یعنی جس طرح بچّے ماں کی گود میں پرورش پاتے ہیں، اُسی طرح فتنے خوف کے دامن میں پلتے ہیں۔

۱۸۔ جس شخص کا دل ہمّت سے مضبوط و مستحکم نہیں ہوتا، وہ ناموافق چیزوں کو بھی خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے:

۱۹۔ جس شخص نے رسول اللہ صلعم کے ارشادات کی حقیقت سمجھ لی ہے، وہ یقیناً شرک کو خوف میں چھپا ہُوا پائے گا:

چھٹا باب

تیر اور تلوار کی بات چیت

تمہید: ایک روز تیر نے تلوار سے کہا کہ تجھ میں بڑی خوبیاں ہیں۔ حضرت علی رضؓ کی ذوالفقار تیرے اسلاف میں تھی تُو نے حضرت خالد رضؓ کی قوّت بازو بھی خوب دیکھی۔ تُو دشمنوں کے لیے خدا کا قہر ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ دوستوں کے لیے جنّت الفردوس بھی تیرے ہی سایے میں ہے۔ میں بھی کچھ کم نہیں۔ جہاں جاتا ہوں، سراپا آگ بن کر جاتا ہوں، لیکن سینے میں پیوست ہونے سے پہلے خوب چھان بین کر لیتا ہوں۔ اگر اس کے اندر قلبِ سلیم نہ ہو، جو خوف اور مایوسی سے آزاد ہو تو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہوں، لیکن جس سینے میں مومن کا دل ہو، اُس کی حرارت سے خود پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

سوفار۔ عموماً تیر کے پچھلے حصّے یعنی چٹکی کو کہتے ہیں۔ "بہارِ عجم" میں اس کے معنی "دہانِ تیر" بھی لکھے ہیں۔ یہاں مراد ہے تیر کا سرا۔

ذوالفقار۔ دو دھاری تلوار۔ حضرت علی رضؓ کی خاص تلوار کا نام۔

توے۔ گہرائی۔ اندرونہ۔

نیمہ۔ کُرتی۔

۱۔ تیر نے عین گھمسان کے رن میں سوفار کے لب سے کام لیتے ہوئے سچائی کا ایک راز تلوار سے بیان کیا۔

۲۔ اے تلوار! تیرے اندر جو جوہر موجود ہیں، وہ تیرے تاف کی پریاں ہیں۔ حضرت علی رضؓ کی ذوالفقار بھی تیرے ہی آباو اجداد میں سے تھی۔

۳۔ تُو نے اللہ کی تلوار یعنی حضرت خالد رضؓ بن ولید کے بازو کی قوّت دیکھی ہے کیونکہ انھوں نے تجھ سے کام لیا اور ملک شام کے سر پر شفق کا چھڑکا ؤ کر دیا۔ دوسرے مصرع میں حضرت خالد رضؓ کی فتوحاتِ شام کی طرف اشارہ ہے۔

۴۔ ایک طرف تیرا سرمایہ خدا کے قہر و غضب کی آگ ہے، دوسری طرف تیرے سایے کے نیچے بہشت بریں ہے۔

مراد یہ کہ اگر تیرے کارناموں کی ظاہری حیثیت پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تُو خدا کا قہر ہے کیونکہ تو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارتی ہے۔ نیز دشمنانِ حق تیرے ہی

ذریعے سے سزا پاتے ہیں۔ دوسری طرف جو مجاہد اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہادت پاتے ہیں، وہ سیدھے بہشت بریں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس وجہ سے بہشت تلوار کے سایے کے نیچے ہے۔ اس میں مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ الجنت تحت ظلال السیوف (بہشت تلواروں کے سایے میں ہے) اس سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں قتال و جہاد ایسی نیکی ہے جو سیدھی بہشت میں لے جاتی ہے۔

۵۔ میری حالت پر غور کر کہ میں ترکش میں رہوں یا ہوا میں چلوں، جہاں کہیں بھی ہوں، سراپا آگ رہتا ہوں۔

۶۔ جب میں کمان سے نکل کر مقابل کے سینے کی طرف آتا ہوں تو سینے کی گہرائی میں خوب چھان بین کرتا ہوں۔

۷،۸۔ اگر مجھے وہاں قلب سلیم نظر نہ آئے اور ایسا قلب ملے جو خوف اور مایوسی کی آلائشوں سے لتھڑا ہوا ہو تو میں اپنی نوک سے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے موج خون کی کرتی پہنا دیتا ہوں:

۹،۱۰۔ اگر میں دیکھوں کہ اندر مومن کا دل ہے جس کی وجہ سے پورا سینہ آئینے کی طرح صاف ہے اور باطن کے نور سے اس کا ظاہر بھی روشن ہے تو اس کی حرارت سے میری جان پانی پانی ہو جاتی ہے اور میری نوک شبنم کی طرح قطرے بن کر ٹپک جاتی ہے:

ساتواں باب

اورنگ زیب عالمگیر اور شیر کی حکایت

تمہید تیر اور تلوار کی گفتگو میں یہی حقیقت واضح کی گئی تھی کہ صاحب ایمان کے قلب میں مایوسی اور خوف کی گنجائش ہی نہیں۔ جان لیوا چیزیں اُس قلب کے نور کو دیکھ کر خود پانی پانی ہو جاتی ہیں۔ اسی سلسلے میں اورنگ زیب عالمگیر کے متعلق ایک حکایت بیان فرماتے ہیں۔ ابتدا میں عالمگیر کے مقام بلند کی کیفیت واضح کی ہے، مثلاً یہ کہ سینے روشن دلوں سے خالی ہو چکے تھے اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ پر فتنوں کے دروازے کھل رہے تھے۔ عین اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے عالمگیر کو پیدا کیا، جو درویش تھا اور صاحب شمشیر بھی۔ اس غرض سے پیدا کیا کہ دین از سر نو زندہ ہو جائے اور یقین و ایمان کے رگ و ریشہ میں تازگی کی نئی روح دوڑ جائے۔

اُس کی تلوار کی بجلی نے الحاد کا خرمن جلا ڈالا۔ وہ شمع توحید کا پروانہ تھا۔ بادشاہوں میں اُس جیسا کوئی نہ ہوا۔ اس کی درویشی کا اندازہ کرنا ہو تو اس کا مزار دیکھ لو:

ایک روز عالمگیر سیر کے لیے جنگل میں نکل گیا۔ صرف ایک غلام ساتھ تھا۔ بادشاہ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ عین اس حالت میں شیر نے حملہ کیا۔ عالمگیر نے خنجر سے اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ پھر دوبارہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہو گیا تاکہ نماز پوری کرے، جو مومن کے لیے معراج کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا ہی دل مومن کے سینے میں جگہ پا سکتا ہے۔ غیر اللہ کا خطرہ ہو تو اس سے بڑھ کر اپنی قوت کی نمائش کرنے والا دل کوئی نہ ہوگا۔ عبودیت اور عبادت کا مقام آجائے تو اس سے بڑھ کر عاجز اور درماندہ دل بھی کوئی نہ ملے گا۔ موقع اور محل کے لحاظ سے مومن کا دل ان دو بالکل متضاد خصوصیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف ایمان کے لیے طرازِ عنوان ہے اور غیر اللہ کا خوف پوشیدہ شرک کے سوا کچھ نہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر | گورگاں۔ لغوی معنی عیش و عشرت کے لائق۔ کہتے ہیں کہ یہ تیمور کا لقب تھا اس وجہ سے اس کے خاندان کو خاندان گورگاں کہنے لگے۔

الحاد۔ دین سے پھر جانا، لیکن اس کا اطلاق نسبتاً وسیع ہے۔ دینی معاملات میں بے پروائی، تغافل یا ایسے امور گوارا کر لینا جو آگے چل کر دین کے لیے کمزوری کا باعث ہو جائیں، اس قسم کی تمام چیزیں الحاد میں داخل ہیں۔

احیا۔ زندہ کرنا۔

تجدید۔ نیا یا تازہ کرنا۔

۱۔ شہنشاہ عالمگیر کا رتبہ اتنا بلند تھا کہ آسمان اس کے دروازے کی دہلیز تھا۔ وہی شہنشاہ دودمانِ گورگانی خاند[ان] کے لیے عزت و اعتبار کا باعث تھا۔

۲۔ مسلمانوں کا درجہ اس کی وجہ سے بلند ہوا اور رسول اللہ صلعم کی شریعت کا احترام عام ہو گیا۔

۳۔ کفر اور دین کی کشمکش میں شہنشاہ عالمگیر ہندوستان کے اندر اسلام کے ترکش کا آخری تیر تھا۔

۴، ۵، ۶۔ جلال الدین اکبر نے اپنے دورِ سلطنت میں ایسی روش اختیار کر لی تھی کہ الحاد کا بیج یہاں نشوونما پانے لگا۔ پھر یہی بیج شاہجہاں کے بڑے بیٹے دارا شکوہ کی فطرت میں اُگ آیا۔ سینوں میں دلوں کی شمعیں روشن نہ تھیں اور ہماری ملت فتنہ و فساد سے محفوظ نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ عین اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ہندو[ستان] سے عالمگیر کو چن لیا، وہ عالمگیر جو زہد کے اعتبار سے درویش اور حق و باطل کے معرکے میں بے پناہ شمشیر کا مالک تھا

۷- عالمگیر کو اس غرض سے چُنا کہ ہندوستان میں دین از سرِ نو زندہ ہو جائے اور یقین و ایمان کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگے۔

۸- عالمگیری شمشیر کی بجلی نے الحاد کا خرمن جلا ڈالا اور ہماری مجلس میں دین کی شمع روشن کر دی۔

۹- جو لوگ حقیقت حال کے ذوق سے عاری تھے، انھوں نے عالمگیر کے متعلق عجیب و غریب داستانیں وضع کریں۔ انھیں اس شہنشاہ کی دور اندیشی اور وسیع النظری کا اندازہ نہ ہو سکا۔

اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ عالمگیر کے خلاف الزام تراشی میں جن لوگوں نے بھی سرگرمی دکھائی اور ان میں بدقسمتی سے مسلمان بھی شامل تھے، وہ عالمگیر کے کارناموں کا صحیح اندازہ نہ کر سکے، جو انتہائی دور بینی اور مآل اندیشی پر مبنی تھے۔ کیا آپ کو یہ سُن کر حیرت نہ ہوگی کہ ابھی کل تک تاریخ کا ایک عام سوال یہ تھا کہ اکبر اور عالمگیر کا مقابلہ کرو، اور شاید آج کل بھی طلبہ سے اس قسم کے سوال کیے جاتے ہوں۔ غیروں کی الزام تراشی بھی حقیقت ناشناسی کا ثبوت تھی۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے "رموزِ بیخودی" پر زبان کے سلسلے میں جو اعتراض کیے تھے، ان میں ایک اعتراض "کور ذوق" کی ترکیب پر بھی تھا۔ اقبالؔ نے جواب میں دو مثالیں پیش کیں:

چہ غم زیں عروس سخن را بتر | کہ بر کور ذوقاں شود جلوہ گر | (ظہوری)
کور ذوقاں ز فیضِ تربیتت | چوں مسیحا مزاجدانِ سخن | (ملا طغرا)

دیکھیے اقبال نامہ حصۂ اول صہ ۹۳

۱۰- عالمگیر توحید کی شمع کا پروانہ تھا اور ہندوستان کے بُت خانے میں اس کی حیثیت ابراہیمؑ کی سی تھی۔

۱۱- شہنشاہوں میں اس کا درجہ یگانہ ہے اور اس کی درویشی قبر ہی سے ظاہر ہے:

اورنگ زیب عالمگیر نے احمد نگر میں وفات پائی اور وصیت کے مطابق اسے خلد آباد میں دفن کیا گیا، جو اورنگ آباد کے قریب ایک مقام ہے۔ اس کے اسلاف میں سے تقریباً ہر ایک کے لیے نہایت عالی شان مقبرے بنے، مثلاً بابر کے لیے "باغ بابر" کابل میں، ہمایوں کے لیے دہلی میں، اکبر کے لیے سکندرہ (نزد آگرہ) میں، جہانگیر کے لیے لاہور میں اور شاہجہاں کے لیے آگرہ میں۔ آگرہ کا مقبرہ تاج محل شاہجہاں نے اپنی بیگم ممتاز محل کے لیے بنوایا تھا اور اپنے لیے اس کے بالمقابل ویسا ہی ایک اور مقبرہ بنوانا چاہتا تھا، لیکن موقع نہ مل سکا اور وفات کے بعد اسے ممتاز محل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ عالمگیر کی قبر اس لحاظ سے بالکل یگانہ ہے کہ اس پر کوئی مقبرہ نہیں۔ وصیت کر دی تھی کہ نہ مقبرہ بنایا جائے اور نہ قبر پختہ کی جائے، چنانچہ اصل قبر کچی رکھی گئی۔ البتہ

حفاظت کے لیے اس کے اردگرد پتھر لگا دیا گیا۔ عالمگیر نے یہ وصیت بھی کر دی تھی۔

۱۔ کفن پہنانے کے بعد میرا سر ننگا رکھا جائے۔ کیونکہ مجھے ننگے سر خدا کے حضور حاضری زیادہ پسند ہے۔ اُمید ہے کہ اس طرح میں رحمت کا زیادہ مستحق بنوں گا۔

۲۔ میرے پاس کچھ روپے ہیں جو میں نے ٹوپیاں بنا بنا کر اور بیچ بیچ کر حاصل کیے ہیں۔ ان سے گزی خرید کر مجھے کفنایا جائے۔ ایک رقم میں نے قرآن مجید کے کچھ حصوں کی کتابت کر کے جمع کر رکھی ہے، وہ تمام ضرورتمندوں میں بانٹ دی جائے۔

ظاہر ہے کہ کفن دفن کے معاملے میں ایسا اہتمام کسی نے کیا اور نہ شہنشاہی میں درویشی کا یہ مقام اس کے خاندان والوں یا دوسرے بادشاہوں میں سے کسی کو حاصل ہوا بلکہ اسلامی عقائد و اعمال کے ایسے پاکیزہ نمونے تاریخ میں بہت ہی کم ملیں گے۔

شیر کا واقعہ شرزہ۔ غصے والا۔ غضب ناک۔

نعم۔ لغوی معنی "ہاں" جیسے لا کے لغوی معنی "نہیں"۔ ایک حرف اثبات اور دوسرا حرف نفی۔

۱،۲۔ ایک روز شہنشاہ عالمگیر، جو تاج اور تخت دونوں کے لیے زیب و زینت تھا۔ جو سالار لشکر بھی تھا، شہنشاہ بھی اور درویش بھی، صبح کے وقت ایک جنگل کی سیر کے لیے نکل گیا۔ صرف ایک وفادار غلام ساتھ تھا۔

۳۔ صبح کی تازہ اور پاکیزہ ہوا سے مست ہو کر پرندے ہر درخت پر تسبیح پڑھ رہے تھے، یعنی وہ اپنی اپنی لے میں گا رہے تھے۔

۴۔ حقیقت شناس بادشاہ بھی مصلا بچھا کر نماز میں مصروف ہو گیا اور اس نے عالم مجاز سے نکل کر عالم حقیقت میں خیمہ نصب کر لیا۔ یعنی دنیاداری سے الگ ہو کر خدا سے لو لگا لی۔

مصرع "خیمہ برزد در حقیقت ... از مجاز" پر بھی سید سلیمان نے اعتراض کیا تھا۔ اقبال نے جواب میں سعدی کا شعر لکھا: "صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار" (اقبال نامہ جلد اول ص ۱۸۸)

۵،۶۔ عین اس حالت میں جنگل کے کنارے سے ببر شیر نکلا۔ اس کی دہاڑ کا یہ عالم تھا کہ محسوس ہوتا تھا، آسمان لرز اٹھا ہے۔ انسان کی بو پا کر شیر کو معلوم ہو گیا کہ انسان موجود ہے۔ چنانچہ وہ آیا اور نماز میں مصروف عالمگیر کی کمر پہ پنجہ مارا۔

۷۔ بادشاہ نے آنکھ اٹھائے بغیر خنجر کھینچا اور غضب ناک شیر کا پیٹ چاک کر ڈالا۔

۸۔ اس کے دل میں ہرگز خوف پیدا نہ ہوا اور ایک لمحے میں جنگل کے شیر کو قالین کا شیر بنا دیا۔

دوسرے مصرع میں اقبال نے عجیب نکتہ نوازی کی ہے۔ شیر قالین اسے کہتے ہیں جس کی

تصویرِ قالین پر بنی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ حقیقی شیر نہیں ہوتا۔ ایک نکتہ یہ ہے کہ عالمگیر نے جنگل کے شیر کی وہ تمام خصوصیتیں ختم کر دیں جو اسے شیرِ قالین سے ممتاز کر رہی تھیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ایک ہی وار میں اسے بیجان کر کے زمین پر گرا دیا اور زمین پر گرے ہوئے شیر کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو شیرِ قالین کی ہوتی ہے :

۹۔ شیر کو ختم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کا بے انتہا شوق رکھنے والا شہنشاہ پھر اس بارگاہ میں جا کھڑا ہوا، یعنی از سرِ نو نماز شروع کر دی۔ سچ یہ ہے کہ حضوری کی نماز اس کے لیے معراج تھی۔

۱۰۔ ایسا ہی خود نما اور خود شکن دل مومن کے سینے میں جگہ پاتا ہے۔ خود نما اس لحاظ سے کہ شیر نے حملہ کیا تو بیباکانہ ایک ہی وار سے اسے مار گرایا۔ دلی قوت کی اس سے بڑی نمائش کیا ہو سکتی تھی۔ خود شکن اس لیے کہ شیر کو مار کر گراتے ہی انتہائی عجز و نیاز سے اپنے مولا کی پیش گاہ میں جا کھڑا ہوا، گویا جو قوت شیر کے مقابلے میں بے پناہ تھی، خدا کی بارگاہ میں پہنچتے ہی سراپا عجز و نیاز بن گئی۔

۱۱۔ اقبال کہتے ہیں کہ حق پرست بندہ خدا کے سامنے اپنے آپ کو کاملاً مٹا کر نفی کے آخری درجے پر پہنچ جاتا ہے، لیکن جب باطل سے مقابلہ پیش آ جائے تو "نعم" کا نعرہ لگا کر اپنی جگہ قائم ہو جاتا ہے، یعنی خدا کے سامنے بے حقیقت اور باطل کے سامنے اٹل۔

۱۲۔ مخاطب سے فرماتے ہیں، اے حقیقت ناشناس! تو بھی ایسا ہی دل پیدا کر۔ تیرے پہلو میں جو محبوب ہے، اس کے لیے محل کا سر و سامان ہونا چاہیے اور ایسا محل جو محبوب کی نشست کے لائق ہو۔

۱۳۔ اپنے آپ کو قربان کر دے تاکہ تو اپنے آپ کو پائے۔ نیاز کا جال بچھا اور ناز کا شکار کر۔

اپنے آپ کو قربان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عشقِ حق میں اپنے لیے کوئی چیز اٹھا نہ رکھو۔ یہی خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب تک تو عشقِ حق کی راہ میں زیادہ سے زیادہ نیاز اختیار نہ کرے گا، یعنی قربانی اور فداکاری کے ثبوت نہ دے گا، عزت و برتری کیونکر پائے گا؟

نیاز سے مقصود قربانی اور ناز سے مقصود مقامِ عزت و برتری ہے :

۱۴۔ یہ تیرے دل میں جو دوسرے ہیں، انھیں عشق کی آگ میں جلا دے۔ خدا کے سامنے لوٹی بنا رہ اور غیر حق کے سامنے شیری کے مسلک پر جم جا :

۱۵۔ فرماتے ہیں: نہ ہر خوف بُرا اور نہ ہر خوف اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف ایمان کی دلیل ہے، غیر اللہ کا خوف چھپا ہوا شرک ہے :

آٹھواں باب

دوسرا رکن ——— رسالت

تمہید: حضرت ابراہیمؑ کے دل میں ایک ملّت کی آرزو تھی۔ وہ دعائیں کرتے رہے، پھر انھیں خانۂ کعبہ کی تعمیر کا حکم ہوا؛ چنانچہ انھوں نے ایک ایسے مقام پر کعبہ بنایا، جہاں گرد و پیش کھیتی باڑی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ہم پر اللہ تعالیٰ نے رحمت کی۔ ہمارا جسم پیدا ہوا۔ رسالت نے اس جسم میں جان ڈالی۔ رسالت ہی کی بدولت ہماری ملّت بنی، رسالت ہی سے ہمیں دین اور شریعت ملی۔ ہم اہلِ عالم کے لیے رحمت کا پیغام بن گئے۔ اگرچہ ہماری تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن مقصد و مدّعا میں ایک ہونے کے باعث ہم میں یگانگی پیدا ہو گئی۔ کثرت صرف اس بنا پر زندہ رہ سکتی ہے کہ وہ ایک رشتے میں بندھی ہوئی ہو۔ مسلمان کی وحدت دینِ فطرت یعنی اسلام کی وجہ سے ہے۔ ہم سب رسول اللہ صلعم کی برکت سے ایک ہوئے۔ خدا نے جس طرح ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کی، اسی طرح ہم پر شریعت ختم کر دی۔ روزگار کی مجلس کے لیے رونق کا باعث صرف ہم ہیں۔ جیسے رسولؐ رسولوں کے خاتم تھے اور ہم قوموں کے خاتم ہیں۔ جس طرح ہمارے نبیؐ نے "میرے بعد کوئی نبی نہیں" کا نعرہ لگایا تھا۔ مسلمان غیر اللہ سے رشتہ توڑ لیتا ہے تو "میرے بعد کوئی قوم نہیں" کا نعرہ لگاتا ہے:

رسالت: لم یزل۔ جسے کبھی زوال نہ آئے۔

آرزو لے ملّتے۔ اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی ان آیات کی طرف:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ۔

جب ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کی نیو ڈال رہا تھا اور اسمٰعیلؑ بھی اس کے ساتھ شریک تھا ان کے ہاتھ پتھر چُن رہے تھے اور دل و زبان پر یہ دعا جاری تھی: اے پروردگار! ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور دنیا بھر کی مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! ہمیں توفیق دے کہ سچے مسلم ہو جائیں، اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمّت پیدا کر دے، جو تیری فرمانبردار ہو۔

طہرا بیتی۔ اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی طرف

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝

اور ہم نے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو حکم دیا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا ہے، اسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لیے ٹھہرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے ہمیشہ پاک رکھنا۔

ویرانہ آباد کرد۔ اشارہ ہے سورۂ ابراہیمؑ کی اس آیت کی طرف:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ

اے ہم سب کے پروردگار! ایک ایسے میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں، میں نے اپنی بعض اولاد تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے۔

تُب علینا۔ جس آیت کا ایک ٹکڑا بسلسلۂ آرزوے ملت نقل ہو چکا ہے، اس کا باقی ٹکڑا یہ ہے:

وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اے خدا! ہمیں ہماری عبادت کے سچے طور طریقے بتا دے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر۔ بلاشبہ تیری ذات ہے؛ جو رحمت کی بدولت درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں۔

تکوین۔ پیدا کرنا۔ وجود میں لانا۔

لاینفک۔ جو الگ نہ ہو سکے۔

یہدی من یرید۔ یہ الفاظ سورۂ حج کی اس آیت سے لیے گئے ہیں:

وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يُرِيدُ ۝

اور دیکھو، اس طرح ہم نے یہ کلام روشن دلیلوں کی شکل میں اتارا اور اس لیے اتارا کہ اللہ جسے چاہتا ہے (کامیابی کی راہ پر لگا دیتا ہے۔

بطحا۔ ایسی زمین فراخ جس میں سے سیل گزرے اور جس میں سنگریزے ہوں۔ یہ مکۂ معظمہ میں ایک وادی ہے اور بعض اوقات بطحا سے مکۂ معظمہ مراد لیا جاتا ہے:

۱، ۲۔ زوال پذیر معبودوں کو ٹھکرا دینے والے حضرت ابراہیم خلیلؑ جن کا نقشِ پا نبیوں کے لیے رہنما بن گیا، وہ حضرت ابراہیمؑ جو خدائے لم یزل کا ایک نشان تھے، اپنے دل میں ایک فرمانبردار ملت کی آرزو رکھتے تھے۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ

نے ایک اُمّت کے لیے دعا کی تھی۔ یہاں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ پہلے شعر میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک اہم خصوصیت یہ بیان کی کہ انھوں نے اپنی قوم کے زوال پذیر معبودوں کو ٹھکرا دیا تھا اور فرمایا تھا: میں انھیں دوست نہیں رکھتا جو ڈوب جانے والے ہیں۔ لا احب الآفلین۔۔ اس کے مقابلے میں خدا کی صفت لم یزل بہ طور خاص بیان کی کہ آفل کا جواب ہو سکے۔

۳، ۴ – حضرت ابراہیمؑ کی بے خواب آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہتی رہی تا آنکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے انھیں اور ان کے فرزند اسمٰعیلؑ کو حکم ہوا کہ ایک گھر خدا کے لیے بنائیں اور اسے پاک رکھیں۔۔۔۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک ایسے مقام پر خانۂ خدا تعمیر کیا جہاں دُور دُور تک ویرانہ تھا اور کھیتی باڑی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ یہ گھر اس لیے بنایا کہ طواف کرنے والے، عبادت کی غرض سے ٹھہرنے والے اور رکوع و سجود کرنے والے اس میں مصروفِ عبادت رہیں۔

۵ – جب تبّ علینا کے درخت میں غنچہ پیدا ہوا تو ہماری بہار کے لیے کار فرمائی کی صورت نکل آئی:

مراد یہ ہے کہ خانۂ خدا تعمیر ہوا۔ لوگ گناہوں سے توبہ کر کے وہاں عبادت کے لیے جمع ہونے لگے۔ اس طرح توحید کی صدا دنیا بھر میں گونجی اور دینِ حق کے لیے فصلِ بہار کا انتظام ہوا۔

۶ – اللہ تعالیٰ نے ہماری ملّت کا جسم پیدا کیا اور اس جسم میں رسالت کے ذریعے سے جان پھونکی:

مراد یہ ہے کہ قوم و ملّت کا وجود رسالت کے ذریعے سے ہوا۔

۷ – ہم اس دنیا میں ایسے الفاظ تھے، جن کی آواز کوئی نہ تھی۔ رسالت کی برکت سے ہم نے ایک موزوں مصرع کی شکل اختیار کر لی۔

مراد یہ ہے کہ ہم الفاظ کی صورت میں الگ الگ موجود تھے مگر ان کے درمیان کوئی ربط ضبط نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم بے صوت تھے، یعنی الگ الگ الفاظ سے کوئی مطلب ادا نہ ہو سکتا تھا رسالت نے ہم سب کو ایک خاص ترتیب میں جوڑ دیا۔ اس طرح ہم مصرع بن گئے اور ایک خاص مفہوم ہمارے ذریعے سے واضح ہو گیا۔

۸ – ہمارا وجود اس دنیا میں رسالت سے ہے۔ رسالت ہی سے ہمیں دین ملا۔ رسالت ہی سے شریعت ملی۔

۹ – رسالت ہی کی برکت ہے کہ ہم لاکھوں ہونے کے باوجود ایک ہیں۔ ہمارا ایک جزو دوسرے جزو سے اس طرح جُڑا ہوا ہے کہ اسے کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔

۱۰ – وہ پاک ذات، جس کی شان یہ ہے کہ جسے چاہتی ہے، کامیابی کی راہ پر لگا دیتی ہے، اس نے ہمارے اردگرد رسالت کا حلقہ کھینچ دیا ہے، یعنی ہم سب کو رسالت کے ذریعے سے باہم جوڑ دیا ہے:

۱۱۔ وہ ایسا حلقہ ہے، جس کا محیط ہر لحظہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس کا مرکز وادیِ بطحا ہے۔

وحدتِ ملت | اجم ۔ نیستاں، جنگل۔

حبل الورید ۔ شہ رگ ۔ سورۂ ق کی ایک آیت ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝

ہم نے انسان کو بنایا اور ہم وہ باتیں جانتے ہیں، جو اس کے جی میں آتی ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہیں۔

۱۔ ہم رسول اللہ صلعم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ نسبت کی بنا پر ملت و قوم بن گئے اور دنیا والوں کے لیے رحمت کا پیغام ہیں اس وجہ سے بھی کہ ہم رحمۃٌ للعالمین کی اُمت ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ ہم رحمت کا وہ پیغام دنیا بھر میں تبلیغ اور عمل کے ذریعے سے پھیلانے کے ذمہ دار ہیں، جو رسول اللہ صلعم انسانوں کی ہدایت کے لیے لائے اور جس سے بڑھ کر اولادِ آدم کے لیے سعادت اور نیک بختی کا راستہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ہم رسول اللہ صلعم کے سمندر سے موج کی طرح اُٹھتے ہیں، لیکن خدا کی ہم پر خاص رحمت ہے کہ موج کی طرح بکھر کر نابود نہیں ہوتے۔

۳۔ رسول اللہ صلعم کی اُمت حرم پاک کی پناہ گاہ میں اسی طرح نعرے لگا رہی ہے جس طرح شیر جنگل میں دہاڑتے ہیں۔ اقبالؔ نے خود فرمایا ہے کہ یہ شعر کہنے کے وقت قصیدۂ بُردہ کا مندرجۂ ذیل شعر پیشِ نظر تھا:

اَحَلَّ اُمَّتَهٗ فِیْ حِرْزِ مِلَّتِهٖ ۔۔۔ کَاللَّیْثِ حَلَّ مَعَ الْاَشْبَالِ فِیْ اَجَمِ

رسول اللہ صلعم نے اپنی اُمت کو ملت کے حصار میں بٹھا دیا، جس طرح شیر اپنے بچوں کے ساتھ جنگل میں بیٹھ جاتا ہے۔

۴، ۵۔ اگر تو میری بات پر اچھی طرح غور کرے اور اس کے اندازے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سی نگاہ پیدا کرے تو تجھ پر واضح ہو جائے گا کہ ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے رسول اللہ صلعم کی ذاتِ بابرکات انسان کے لیے قلب و جگر کی قوت بن جاتی ہے اور حضور اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب نظر آتے ہیں۔

دوسرے مصرع کے ظاہری الفاظ پر نہ جانا چاہیے۔ مقصود یہ ہے کہ بہ حکم لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ، دین کا عملی پیکر رسول اللہ صلعم کی ذاتِ بابرکات ہے۔ حضور ہی کے اتباع کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا معیار قرار دیا، جب ارشاد فرمایا: اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ۔ جس حد تک عقیدہ و عمل کا تعلق ہے، ہر لحظہ رسول اللہ صلعم ہی مومن کے سامنے رہتے ہیں۔ مقصود بلا شبہ یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں درجۂ قبول

حاصل ہو، لیکن ہر لحظہ رسول اللہ صلعم کا سہارا لے کر قدم اٹھانا لازم ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے اپنے خیال کے مطابق بہترین شاعرانہ لباس میں پیش کرنے کا طریقہ وہ سمجھا جس پر عمل کیا، اگرچہ ظاہری الفاظ ایک حد تک پریشان کن معلوم ہوتے ہیں اور محبت کے معاملات اکثر پریشان کن ہی ہوتے ہیں۔

۶۔ رسول اللہ صلعم جو کتاب لائے یعنی قرآن مجید، وہ مومن کے دل کے لیے قوت و استحکام کا سامان ہے اور جو حکیمانہ ارشادات حضورؐ کی زبانِ مبارک پر جاری ہوئے، انھیں ملت کی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت حاصل ہے۔

قرآن مجید میں رسول کی تین خصوصیتیں بہ طورِ خاص واضح کی گئی ہیں: اول تلاوتِ آیات دوم تزکیۂ قلوب، سوم تعلیم کتاب و حکمت (یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ) مندرجۂ بالا شعر میں حکمت کا مطلب وہی ہے، جو اس آیۂ شریفہ میں ہے۔

۷۔ رسول اللہ صلعم کا دامن ہاتھ سے دینے کا مطلب یہ ہے کہ موت قبول کر لی جائے اور وہ حالت پیدا ہو جائے، جو موسمِ خزاں میں پھول کی ہوتی ہے، یعنی افسردہ ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ جو شخص اس ذاتِ پاکؐ کے دامن سے جدا ہوا، سمجھ لینا چاہیے، وہ مر گیا یعنی اس کی زندگی زندگی نہ رہی، موت ہو گئی۔

۸۔ قوم نے صرف رسول اللہ صلعم کے دم سے زندگی پائی۔ یہ صبح اسی آفتاب کی روشنی سے جلوہ ریز ہوئی۔

دوسرے مصرعے میں قوم کو صبح اور رسول اللہ صلعم کی ذاتِ بابرکات کو آفتاب قرار دیا ہے۔

۹۔ افراد اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ رہتے ہیں، قوم کی زندگی رسول اللہ صلعم پر موقوف ہے، یعنی قوم اسی سورج کی کرن سے آب و تاب حاصل کرتی ہے۔

مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ قوم اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دائرے سے نکل کر رسالت کے دائرے میں چلی جاتی ہے، معاذ اللہ۔ مراد صرف یہ ہے کہ افراد کو قوم کی شکل میں منظم کرنے کا وسیلہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو قرار دیا ہے۔ افراد بدستور اللہ کے حکم سے مرتے اور جیتے ہیں، لیکن انھیں بنانے اور قائم رکھنے کا وسیلہ رسول اور اس کی تعلیم کے اتباع کے سوا کچھ نہیں۔

۱۰۔ شعر نمبر ۹ کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسالت نے ہمیں ہم نوا اور ہم آہنگ کیا۔ رسالت ہی کی برکت سے ہم ایک دوسرے کے ساتھی، رفیق اور ہمدرد بنے۔ اسی کی برکت سے ہم سب کا نصب العین ایک ہو گیا۔

۱۱۔ جب ایک مدعا، ایک مقصد اور ایک نصب العین والے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ان میں ایک وحدت

آجاتی ہے۔ یہی وحدت پختہ اور پائدار ہو جاتی ہے تو ملت کی شکل اختیار کر لیتی ہے یعنی ہم مقصد افراد کی بڑی تعداد کے اتحاد پر پختہ و استوار ہو جانے کا دوسرا نام ملت ہے۔

۱۲- ہر کثرت صرف وحدت کے بندھن کی بنا پر زندہ ہے اور مسلمان کی وحدت دینِ فطرت یعنی اسلام پر مبنی ہے۔

۱۳- ہم نے رسول اللہ صلعم سے دینِ فطرت سیکھا اور اللہ کے راستے میں مشعل روشن کر کے کھڑے ہو گئے۔

۱۴- یہ وحدت کا راز ایک موتی ہے جو رسول اللہ صلعم کے بے پایاں سمندر سے نکلا ہے۔ ہم۔ جہان میں تو یہ حضورؐ ہی کا احسان ہے۔

خوب غور فرمائیے، اقبالؔ نے ان تین چار شعروں میں مختلف مدارجِ ملت بڑی وضاحت سے پیش کر دیے ہیں، یعنی ہم مقصد افراد ایک رشتے میں منسلک ہو کر اس اتحاد پر پختہ ہو جائیں تو ملت بن جاتے ہیں۔ افراد کی تعداد کتنی ہی بڑی ہو، جب تک ان میں فکر و عمل کی وحدت قائم رہتی ہے، وہ ملت بنے رہتے ہیں۔ مسلمان کی وحدتِ فکر و عمل کی بنیاد دینِ اسلام ہے۔ یہ دین ہمیں رسول اللہ صلعم نے سکھایا اور حضورؐ ہی کے احسان سے ہم سب ایک قوم بنے۔ اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اقبالؔ نے کیوں کہا "فرد از حق، ملت از وے زندہ است"

دوامِ ملت لانبی بعدی۔ خود رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے یعنی یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

لاقوم بعدی۔ میرے بعد کوئی قوم نہیں یعنی جب قوم رسالت سے ہے تو جس طرح رسول اللہ صلعم خاتم انبیاءؑ ہوئے، اسی طرح ملتِ اسلامیہ خاتم اقوام ہے نہ اور کوئی نبی آئے گا نہ اور کوئی قوم بنے گی۔

۱- اگر وحدت کا یہ رشتہ ہمارے ہاتھ سے نہیں چھوٹے گا تو ہماری ہستی بہ حیثیتِ ملت و قوم رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔

۲- خدا نے ہم پر شریعت ختم کر دی اور ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم ہو گئی۔

۳- اب زمانے کی مجلس میں رونق ہمارے ہی دم سے رہے گی۔ ہمارے رسولؐ رسولوں کے خاتم تھے، ہم قوموں کے خاتم ہیں۔

اقبالؔ نے خود ان اشعار کے سلسلے میں قصیدۂ بُردہ کا یہ شعر نقل کیا ہے:

لمّا دعی اللہ داعینا لطاعتہ   بأکرم الرّسل وکنّا اکرم الامم

(جب اللہ تعالیٰ نے ہمارے داعی یعنی رسول اللہ صلعم کو اکرم الرسل (تمام رسولوں سے زیادہ بزرگ) کہہ کر خطاب کیا تو ہم اس ذاتِ پاک کی بدولت بزرگ ترین امت بن گئے)

۴- اللہ تعالیٰ نے محفل روزگار میں ساقی کا منصب ہمارے حوالے کر دیا۔ وہ صلاح و تقویٰ کا جو آخری جام اس دنیا کو عطا کرنا چاہتا تھا، وہ ہمیں عطا کر دیا۔

۵۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ یہ خدا کا احسان ہے اور یہ دینِ مصطفیٰؐ کے ناموس کا پردہ ہے۔

۶۔ قوم کو قوت ملتی ہے تو رسول اللہ صلعم ہی سے ملتی ہے اور ملت کی وحدت کا راز بھی اسی پاک ذات کی بدولت محفوظ ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دعوے کا نقش مٹا دیا اور اسلام کا شیرازہ ابد تک کے لیے باندھ دیا۔

۸۔ مسلمان غیر اللہ سے دل کا تعلق توڑ لیتا ہے تو "لا قوم بعدی" کا نعرہ لگاتا ہے یعنی میرے بعد کوئی قوم نہیں۔

نواں باب

رسالتِ محمدیہؐ کا نصب العین

اس باب میں رسالتِ محمدیہؐ کا مقصد واضح کیا گیا ہے یعنی یہ کہ عالمِ انسانیت کے درمیان حریت، مساوات اور اخوت کے نظام کی تشکیل و تاسیس کی جائے۔

تمہید اس بحث میں سب سے پہلے انسانیت کی حالتِ زار واضح کی گئی ہے یعنی انسان انسانوں کو پوجتے تھے۔ شہنشاہوں نے ان کی گردن میں بند ڈال رکھے تھے۔ مذہبی پیشوا اور حکمران ان سے من مانی رقمیں وصول کرتے تھے۔ غلامی نے فطرت پست کر ڈالی تھی۔ پھر ایک امانت دار وجود پاک اس دنیا میں آیا جس نے حق داروں کے حقوق انھیں واپس دلا دیے۔ اس نے سب کو حریت، اخوت اور مساوات سکھائی، انسانیت میں نئے سرے سے جان پڑی۔ دنیا کا پرانا نظام ختم ہو گیا اور نیا نظام وجود میں آیا۔ ایک نئی اُمت پیدا ہوئی جو اپنے رسولؐ کے پیغام کا پروانہ تھی اور اس نے اپنے رسولؐ کی تعلیم یعنی اخوت، حریت اور مساوات دنیا بھر میں پھیلائی۔

انسانیت کی حالتِ زار کاہن۔ لغوی معنی بزرگِ دین، فال گو، غیب کا حال کہنے والا۔ زمانۂ قدیم کے یونانیوں، رومیوں اور دوسرے مذاہب والوں کا اعتقاد ان لوگوں پر تھا جو مندروں میں بیٹھے رہتے تھے اور لوگ ان سے غیب کی باتیں پوچھا کرتے تھے۔ کہانت کا سلسلہ اسلام کے ظہور تک قائم تھا۔

پاپا۔ پوپ یعنی کیتھولک مسیحیوں کا سب سے بڑا پیشوا۔
نخچیر۔ شکار۔
کنشت۔ آتش کدہ۔ بُت خانے کے لیے بھی مستعمل ہے۔

باج۔ خراج۔
اُسقفِ رضواں فروش۔ وہ مذہبی پیشوا، جو لوگوں کے ہاتھ جنّت کے پروانے فروخت کرتا تھا۔
ایک زمانے میں پوپوں نے یہی پیشہ اختیار کر لیا تھا۔
صیدِ زبوں۔ نکمّا شکار۔
مغ زادہ۔ آتش پرستوں کا مذہبی پیشوا۔

۱۔ انسان دنیا میں انسانوں کو پوجتے تھے۔ ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ ان کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ وہ عاجز و درماندہ تھے۔

۲۔ کسریٰ اور قیصر جیسے شہنشاہوں کا دبدبہ انھیں لوٹ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں، پاؤں اور گردنوں میں بندھن پڑے ہوئے تھے

۳۔ دینی بزرگ، پوپ، بادشاہ اور امیر کس کس کا نام لیا جائے، ایک شکار کے پیچھے سینکڑوں شکاری لگے ہوئے تھے، یعنی سب غریب انسانوں کو لوٹ رہے تھے۔

۴۔ تخت کے مالکوں اور بت خانہ و آتش کدہ کے پیشواؤں نے غریب انسانوں کی اجڑی ہوئی کھیتی سے وصولِ خراج کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

۵۔ جنّت کے پروانے دینے والا پیشوا کلیسا میں بیٹھا ہوا اس پریشان حال اور ناچیز شکار کے لیے جال کندھے پہ ڈالے ہوئے تھا۔ اس پیشوا سے مقصود پوپ ہے:

۶۔ برہمن نے غریب انسانوں کی کیاریوں کے پھول چُن لیے تھے اور آتش پرستوں کے پیشوا نے غریبوں کے خرمن کو آگ کے حوالے کر دیا تھا۔

۷۔ غلامی نے انسانوں کی فطرت بہت پست کر دی تھی۔ ان کی بانسری میں نغمے خون بن کر رہ گئے تھے۔

ظہورِ رحمتِ عالمؐ | خاقان۔ بادشاہ۔ قدیم زمانے میں چین و ترکستان کے بادشاہوں کا لقب تھا۔
شمن۔ بت خانہ۔ بُت پرست۔

۱۔ یہ حالت زار تھی، جب رحمتِ عالم صلعم جیسے امانت دار وجود کا ظہور ہوا۔ تمام حق داروں کو ان کے حق مل گئے اور جن لوگوں کو مختلف اشخاص غلام بنائے بیٹھے تھے، انھیں بادشاہی کی مسند دے دی۔

۲- اُس وجودِ پاک نے ٹھنڈی راکھ سے زندگی کے شعلے پیدا کیے۔ پہاڑ کاٹنے والے مزدور کو پرویز جیسے بادشاہ کے برابر رتبہ دے دیا۔

۳- حضورؐ کی برکت سے مزدوروں کی عزّت بڑھ گئی۔ جو لوگ کارفرما بنے بیٹھے تھے، ان سے آقائی اور برتری کا منصب چھین لیا۔

۴- رحمتِ عالم صلعم نے ہر پرانے ڈھانچے کی قوّت توڑ کر رکھ دی اور عالمِ انسانیت کے گرد ایک نیا حصارِ حفاظت کے لیے قائم کر دیا۔

۵- آدمی کے جسم میں نئی جان ڈالی۔ غلاموں کو ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد کر دیا۔

۶- اس وجودِ پاک کا ظہور پرانی دنیا کے لیے موت کا پیغام تھا۔ آتشکدے سرد ہو گئے۔ بتخانوں کا نام و نشان باقی نہ رہا۔

۷- اس وجود کے پاک ضمیر سے آزادی پیدا ہوئی۔ یہ لذیذ شراب اسی کے انگور سے نکلی۔

۸- عہدِ جدید نے سیکڑوں چراغ پیدا کیے۔ اس عہد کی آنکھ اسی پاک وجود کی آغوش میں کھلی تھی۔

مراد یہ ہے کہ عہدِ جدید میں غور و تحقیق، ایجاد و انکشاف اور قوائے عالم کی تسخیر کے جو کارنامے انجام پائے، ان کی بنیاد حضور صلعم کی تعلیمات کے اصول پر استوار ہوئی۔ جو خرابیاں پیدا ہوئیں، وہ ان برکات کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں اور غلط استعمال ایمان کی کمزوری یا فقدان کا ثبوت ہے۔

اُمّت اور اس کا نصب العین اَکرم و اَتقیٰ۔ اشارہ ہے سورہ حجرات کی اس آیت کی طرف:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ	اے لوگو! ہم نے تم سب کو مرد اور عورت سے
ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ	پیدا کیا اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ باہم پہچانے
قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ	جاؤ۔ بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا
عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ	وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

کُلّ مومن اخوۃ۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں: یہ سورۂ حجرات کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔

قالوا بلیٰ۔ اشارہ ہے اس آیۂ کریمہ کی طرف کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى: (کیا میں تمھارا رب نہیں؟ انھوں نے کہا: ہاں)۔

سیما۔ پیشانی۔

۱- رسول اللہ صلعم نے ایک نیا نقش ہستی کے صفحے پر کھینچا اور ایک ایسی اُمّت پیدا کی، جو دنیا کو فتح کرنے والی تھی۔

۲- اس اُمّت نے اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ایک کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور وہ رسول اللہ صلعم کے

چراغ کے لیے پروانہ بنی ہوئی تھی۔

۳۔ اس اُمّت نے حق کی حرارت سے سینہ گرما رکھا تھا اور اس کا ایک ذرّہ سورج کے گھر کے لیے شمع کی حیثیت رکھتا تھا

۴۔ کائنات پر اُس اُمّت کے نشے نے رنگینی چھا گئی اور چین کے بتخانے اللہ کے گھر بن گئے۔

۵۔ اللہ کے تمام رسول اور نبی اس اُمّت کے آباؤ اجداد تھے اور اس کے سب سے زیادہ پرہیزگار افراد اللہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر عزّت والے تھے۔

۶۔ اس اُمّت کے دل میں یہ پیغام پیوست تھا کہ تمام مومن بھائی بھائی ہیں اور آزادی اس کی محبّتِ گل کا سرمایہ تھی، یعنی اس اُمّت کے بنیادی مقاصد میں اخوّت اور حرّیت داخل تھی۔

۷۔ اس کے نزدیک ہر امتیاز ناقابلِ برداشت تھا اور مساوات اُس کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔

۸۔ اس اُمّت کے افراد اسی طرح آزاد تھے، جس طرح سرو باغوں میں آزاد ہوتے ہیں اور ابتدائے آفرینش میں روحوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد باندھا تھا، اس پر سب قائم و استوار تھے۔

۹۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے مسلسل سجدہ کرنے سے اس کی پیشانی پر پھول کا نقش بن گیا تھا۔ چاند اور سورج اس کے پاؤں کو بوسہ دیتے تھے۔

دسواں باب

ابوعبیدہ اور جابان

اسلامی اخوّت

تمہید اقبال نے گزشتہ باب میں یہ واضح کیا تھا کہ نبوّت کا مقصود اخوّت، مساوات اور حرّیت کی تاسیس و اشاعت ہے، اب انھوں نے یکے بعد دیگرے تین حکایتیں لکھی ہیں، جن میں اخوّت، مساوات اور حرّیت کا نقشہ الگ الگ پیش کیا ہے۔

اخوّت کے سلسلے میں انھوں نے ایک ایرانی سپہ سالار کی حکایت بیان کی ہے، جس نے اپنا نام اور منصب ظاہر کیے بغیر عام ایرانی کی حیثیت میں ایک مسلمان سپاہی سے امان نامہ

حاصل کر لیا تھا۔ جب اس کی حقیقی حیثیت کا علم ہُوا تو اہل فوج نے مطالبہ کیا کہ اسے سزا ملنی چاہیے۔
اوّل وہ مجرم تھا، دوم اس نے دھوکا دے کر ایک سادہ لوح مسلمان سے معافی کا پروانہ لے لیا۔

اسلامی فوج کے سالار ابو عبیدہ ثقفی کے سامنے یہ معاملہ پیش ہُوا تو انھوں نے فرمایا:۔
بھائیو! ہم سب ایک ہیں۔ اگر ایک مسلمان نے کسی کو امان دے دی ہے تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کے پابند رہیں اور ہم پر اس شخص کا خون حرام ہو گیا۔

مسلمان سپاہی اور ایرانی سالار درفشِ کاویانی۔ دُرَفش (بہ ضمّۂ دال و فتح راء) پرچم۔ پرانی ایرانی روایات کے مطابق ضحاک نے ایرانی سلطنت پر قبضہ کر لیا تو اس سلطنت کا اصل دعویدار فریدون کاوہ نام ایک لوہار کے پاس رہا۔ وہیں اس نے جوان ہو کر خفیہ طور پر ایک فوج جمع کی اور کاوہ لوہار کی دھونکنی سے عَلَم تیار کیا۔ کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس عَلَم کو مبارک سمجھ کر بڑی حفاظت سے رکھا گیا اور اسے زر و جواہر سے مزیّن کر لیا گیا۔ اصطلاح میں اس سے مراد ہے ایرانی عَلَم:

وغا۔ جنگ۔ لڑائی۔

معشر۔ گروہ خصوصاً عزیزوں اور دوستوں کا گروہ۔

خیر الانام۔ انسانوں میں سب سے اچھا یعنی رسول اللہ صلعم۔

۱۔ ایران کے بادشاہ یزدجرد کے سالاروں میں سے ایک سالار میدانِ جنگ میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔

۲۔ آتش پرست یعنی ایرانی سالار بڑا تجربہ کار، عیّار، حیلہ باز، چالاک اور مکّار تھا۔

۳۔ اس نے مسلمان سپاہی کو اپنے نام یا رتبے سے آگاہ نہ کیا:

۴۔ درخواست کی کہ میری جان بخشی کی جائے اور مسلمانوں کے شیوے کے مطابق مجھے امان دے دی جائے:

۵۔ مسلمان نے یہ درخواست سنتے ہی تلوار میان میں کر لی اور کہا کہ اب تیرا خون بہانا میرے لیے جائز نہیں:

۶۔ ایران کا قومی جھنڈا درفش کاویانی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ساسانی خاندان کی آگ راکھ بن گئی: یعنی لڑائی ختم ہو گئی۔ ایرانیوں نے ہر میدان میں شکست کھائی اور ساسانی شوکت مٹ گئی:

۷۔ اُس وقت بھید کھُلا کہ یہ سالار، جس نے نام اور منصب بتائے بغیر امان حاصل کر لی تھی، جابان ہے، جو ایران کے جانبازوں کا سالار ہے:

۸۔ چنانچہ مسلمان اپنے سالار کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ قتل کی اجازت دیجیے، ساتھ ہی اس کا فریب واضح کر دیا۔ مراد یہ ہے کہ اس شخص نے دھوکے سے امان حاصل کی اور ایسی امان کی کچھ حیثیت نہیں۔ ہم

کے ہاتھ سے مسلمانوں کو جو دُکھ پہنچے، ان کا تقاضا یہی ہے کہ اسے قتل کیا جائے۔

اسلامی سالار کا فیصلہ | ۱۔ حجازی فوج کے سالار حضرت ابو عبیدہ ثقفی تھے۔ میدانِ جنگ میں ان کا عزم اتنا پختہ اور پائدار تھا کہ انھیں لشکر کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

۲، ۳۔ اُنھوں نے فرمایا: "دوستو! ہم مسلمان ہیں، ہم ایک ساز کے تار ہیں اور ہم میں سے ایک ہی نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ بہ ظاہر ساز کے تار الگ الگ ہوتے ہیں، لیکن جب اسے بجایا جاتا ہے تو تاروں کے زیر و بم سے ایک نغمہ پیدا کر لیا جاتا ہے، گویا معنوی لحاظ سے سب تار ایک ہیں۔ یہی کیفیت ہماری قوم کی ہے۔ ظاہری نظر سے دیکھا جائے تو شاید خیال ہو کہ حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کو آقائی کا مرتبہ حاصل تھا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت قنبرؓ غلام تھے، لیکن ہمارے ہاں ہر امتیاز مٹ چکا ہے۔ کوئی نعرہ یا نوا بلالؓ اور قنبرؓ کے حلق سے بھی پیدا ہو تو ہم اسے علی مرتضیٰؓ کا نعرہ اور ابوذرؓ کی نوا سمجھیں گے۔

۴۔ ہم میں سے ہر شخص کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اسے ملّت کا امانت دار سمجھا جائے۔ ہر شخص کی صلح اور لڑائی، ملّت کی صلح اور لڑائی قرار پائے گی۔

۵۔ جب ملّت ہر فرد کی جان کی بنیاد بن جائے تو اس فرد کا عہد ملّت کا عہد قرار پاتا ہے۔

ملّت جانِ فرد کی بنیاد اُس وقت بنتی ہے، جب فرد کی زندگی صرف ملّت کی خیر و بہبود کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔

۶۔ میں نے مانا کہ جابان ہمارا دشمن رہ چکا ہے، لیکن بھائیو! یہ حقیقت بھی تو پیشِ نظر رکھو کہ ہمارا ایک مسلمان بھائی اسے امان دے چکا ہے۔

۷۔ لہٰذا اے کائنات کے بہترین انسان (رسول اللہ صلعم) کی امّت کے لوگو! اب جابان کا خون مسلمانوں کی تلوار کے لیے حرام ہو گیا ہے، یعنی ہمارے ایک بھائی نے اسے جو امان دی تھی، پورے لشکر کی طرف سے اس کی تصدیق کی جاتی ہے۔

اخوّت کا یہ جذبہ اور یہ شان تھی، جس نے ابتدائی دور کے مسلمانوں کو ہر حصّۂ عالم میں کامگار و سربلند کیا۔

گیارھواں باب

سلطان مراد اور معمار

اسلامی مساوات

تمہید | گزشتہ حکایت میں اسلامی اخوت کا ایک نظارہ دکھایا گیا تھا، اب اسلامی مساوات کا ایک ایمان افروز نقشہ سامنے آتا ہے۔ فرماتے ہیں ایک نامور معمار تھا جس نے سلطان مراد کے حکم سے ایک مسجد بنائی۔ سلطان کو عمارت پسند نہ آئی اور غصے کی حالت میں حکم دے دیا کہ معمار کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ معمار قاضی کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں کسی کا غلام تو ہوں نہیں۔ آپ کی عدالت میں آیا ہوں۔ قرآن مجید کے مطابق میرے مقدمے کا فیصلہ کر دیجیے۔ قاضی نے سلطان کو طلب کیا۔ قرآن کی ہیبت سے سلطان کا رنگ فق ہو گیا۔ اپنے جرم کا اقبال کر لیا اور کہا کہ میں اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوں۔ قاضی نے کہا، یہ تو ہوا لیکن قرآن نے تو بدلے کا حکم دیا ہے اور بدلے ہی کو زندگی بتایا ہے۔ سلطان مراد نے قرآن مجید کی آیت سنتے ہی اپنا ہاتھ پیش کر دیا اور کہا کہ لیجیے، بدلہ چکا دیجیے یہ سن کر مدعی میں ضبط کی تاب نہ رہی اور وہ پکار اٹھا کہ میں نے سلطان کا گناہ خدا اور رسولؐ کے لیے بخش دیا۔

معمار کو سنزا | خجند۔ ترکستان کا ایک شہر جو دریائے سیحوں کے کنارے پر تھا۔

ساعد۔ کلائی۔

سُفتہ گوش۔ غلام۔ پروردہ۔ غلاموں کے کان چھید کر آقا اپنا کوئی نشان ڈال دیتے تھے۔ یہاں سے سُفتہ گوش (چھدے ہوئے کانوں والا) کی اصطلاح پیدا ہوئی۔

گردوں فر۔ آسمان جیسے بلند مرتبے والا۔

فی القصاص آمد حیوٰۃ۔ اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الْأَلْبَابِ

اور اے ارباب دانش! قصاص کے حکم میں اگرچہ بظاہر ایک جان کی ہلاکت کے بعد دوسری جان ہلاکت گوارا کر لی گئی، لیکن دراصل یہ ہلاکت نہیں، تمہارے لیے زندگی ہے اور اس لیے ہے کہ تم برائیوں سے بچو۔

بالعدل والاحسان - اشارہ ہے سورۂ نحل کی اس آیت کی طرف :-

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

سنو! اللہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملے میں انصاف کرو، سب کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ اور رشتہ داروں سے سلوک کرو اور تمھیں روکتا ہے بے حیائی کی باتوں سے، ہر طرح کی برائیوں سے اور ظلم زیادتی کے کاموں سے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو اور نصیحت پکڑو۔

۱- خجند کی ولایت میں ایک معمار تھا، جس نے عمارتیں بنانے میں بڑی ناموری حاصل کر لی تھی۔

۲- اس کاریگر نے جسے کمالِ فن کے اعتبار سے فرہاد کی اولاد کہنا مناسب ہے، سلطان مراد کے حکم سے ایک مسجد بنائی۔

۳- سلطان کو اس کی بنائی ہوئی عمارت پسند نہ آئی اور اس کی کوتاہی پر غصّے کی آگ بھڑک اٹھی۔

۴- سلطان کی آنکھوں سے جلا دینے والی آگ برسنے لگی اور اس نے غریب معمار کا ہاتھ خنجر سے کاٹ دیا۔

۵- معمار کی کلائی سے خون کی ندی بہ نکلی وہ بے بس ہو کر حالتِ زار میں قاضی کے پاس پہنچا۔

۶، ۷، ۸- جس کاریگر کے ہاتھ پتھروں کو ایک دوسرے سے اس طرح پیوست کرتے تھے، جیسے طرح موتی پروئے جاتے ہیں، اس نے سلطان کے ظلم کی داستان قاضی کو سنادی اور کہا کہ تیری زبان پر جو کچھ جاری ہوتا ہے اور وہ پیغامِ حق ہوتا ہے تیرا کام ہی شریعتِ محمدیہ کی حفاظت ہے۔ میں بادشاہوں کی عظمت اور دبدبے کا غلام نہیں۔ میری گزارش یہ ہے کہ جو دعویٰ پیش کر رہا ہوں، اس کا فیصلہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق کر دیا جائے۔

قرآن مجید کا فیصلہ ۱- قاضی انصاف دوست تھا۔ معمار کی درد بھری داستان سنی تو غصّے سے ہونٹ چبائے اور بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔

۲- بادشاہ سن چکا تھا کہ معمار نے قرآنی حکم کے مطابق فیصلہ چاہا ہے۔ قرآن کی ہیبت سے اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور خطاکار کی حیثیت میں قاضی کے سامنے پیش ہوا۔

۳- شرمندگی سے آنکھیں پاؤں پر گڑی ہوئی تھیں اور چہرہ لال ہو رہا تھا۔

۴- قاضی کی عدالت میں ایک طرف فریادی تھا جس نے دعویٰ دائر کر رکھا تھا، دوسری طرف آسمان جیسے بلند مرتبے والا شہنشاہ تھا۔

۵- بادشاہ بولا: "میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں اور اقبالِ جرم کرتا ہوں۔"

۶- قاضی نے کہا: "یہ معاملہ تو قصاص کا ہے اور ارشادِ قرآنی کے مطابق قصاص ہی میں زندگی ہے۔ اسی قانون کے ذریعے سے زندگی استوار ہوتی ہے۔"

۷۔ ظاہر ہے کہ مسلمان غلام درجے میں احرار سے کم نہیں سمجھا جا سکتا اور بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ سُرخ نہیں۔

۸۔ جب سلطان مراد نے قرآن مجید کی یہ محکم آیت سنی تو اپنا ہاتھ آستین سے نکال کر پیش کر دیا۔ اس غرض سے پیش کر دیا کہ قصاص ... لے ... لیا جائے تاکہ حکم قرآنی پورا ہو۔

۹۔ دعویٰ کرنے والے معمار کو اب خاموشی کی تاب نہ رہی۔ حکم قرآنی کے روبرو سلطان کے سر جھکا دینے پر وہ اپنی تکلیف بھول گیا اور اس کی زبان پر قرآن مجید کی وہ آیت جاری ہو گئی جس میں عدل کے ساتھ احسان کی تعلیم فرمائی گئی ہے۔

۱۰۔ اس نے کہا کہ میں نے بادشاہ کو خدا اور رسولؐ کے لیے معاف کر دیا۔ بدلا لینا نہیں چاہتا۔ احسان رکھ کر چھوڑتا ہوں۔

۱۱۔ رسول اللہ صلعم کی شریعت کا رعب و داب دیکھیے کہ ایک کمزور چیونٹی نے سلیمانؑ پر فتح پائی یعنی ایک معمولی معمار سلطان کے مقابلے میں کامیاب ہُوا۔

۱۲۔ حق یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک آقا اور غلام کی حیثیت ایک ہے۔ چٹائی پر بیٹھنے والے درویش اور اطلس کی گدی کو زینت دینے والے بادشاہ میں کوئی فرق نہیں۔

بارھواں باب

حادثۂ کربلا

اسلامی حُرّیّت

تمہید اس باب میں سب سے پہلے عقل اور عشق کا فرق واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حریت عشق کے ناتے کی رہا ہوئی ہے، ساتھ ہی کربلا کا ذکر شروع ہو جاتا ہے، جس میں ایک طرف امام حسینؓ عشق کے علمدار تھے اور دوسری جانب ہوس پرور عقل تھی۔ خلافت کا رشتہ قرآن سے کٹ چکا تھا اور حریت مر چکی تھی۔ اُس وقت حضرت امام حسینؓ نے اور کربلا کی سرزمین میں حریت کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ اسلامی شوکت کی جتنی بھی داستانیں تھیں، وہ نہ ہر لحظہ یاد رکھی جا سکتی تھیں اور نہ یاد رکھی گئیں، لیکن امام حسینؓ کی تکبیر سے ہمارا ایمان اب بھی تازہ ہوتا ہے۔

عقل و عشق ھوالموجود۔ وہ موجود ہے یعنی ہمیشہ زندہ رہنے والا خدا۔

سفاک ۔ خونریز۔ جلاد۔ ظالم۔

پیچاک ۔ پیچ و خم۔

پورِ بتولؓ ۔ پور، بیٹا۔ بتول کے لغوی معنی ہیں قطع کرنے والا، کاٹنے والا۔ بتولؓ سے مراد حضرت فاطمہؓ ہیں کیونکہ انھوں نے دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ پورِ بتولؓ سے مراد امام حسینؓ ہیں۔

ذبح عظیم ۔ اشارہ ہے والصافات کی اس آیت کی طرف:

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ : اور ہم نے ایک بھاری قربانی کو اس کا فدیہ کر دیا۔

خیر الملل ۔ ملل، ملّت کی جمع۔ سب سے اچھی ملّت یعنی ملّتِ اسلامیہ۔

نعم الجمل ۔ ایک روایت کی طرف اشارہ ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلعم امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو دونوں کندھوں پر اٹھائے لیے جا رہے تھے کہ کسی نے کہا: "نعم الجمل کتنی اچھی سواری ہے" فرمایا: "سوار بھی تو اچھے ہیں"۔

استبداد ۔ لغوی معنی ہیں، تنہا کسی کام کا مختار بن جانا اور کسی کے روکے نہ رکنا۔ آج کل یہ ظلم و جور اور مطلق العنانی کے ہر نظام کے لیے مستعمل ہے۔

لاتعد ۔ بے شمار۔ ان گنت۔

پیک ۔ قاصد۔ پیغامبر۔

۱۔ جس نے حاضر و ناظر اور زندہ و قائم خدا سے عبودیّت کا رشتہ استوار کر لیا، اُس کی گردن ہر معبود کی بندش سے آزاد ہو گئی۔

مراد یہ ہے کہ خدا سے رشتہ استوار کر لینے کے بعد انسان تمام آقاؤں کو ٹھکرا دیتا ہے۔

۲۔ مومن کی ہستی عشق پر موقوف ہے، عشق کا وجود مومن پر موقوف ہے۔

مراد یہ ہے کہ مومن عشقِ حق کے بغیر کچھ بھی نہیں اور عشقِ حق کے لیے اگر کوئی مقام ہو سکتا ہے تو وہ صرف مومن کا دل ہے۔ عشق انسانوں میں ایسی قوتیں بیدار کر دیتا ہے کہ جو کام عام نگاہوں میں ناممکن ہوتے ہیں، وہ بھی امکان کے دائرے میں آ جاتے ہیں یعنی انھیں پورا کر لینا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

۳۔ عقل بڑی خونریز ہے، لیکن عشق اس سے بھی زیادہ خونریز ہے، ساتھ ہی عشق کی یہ خصوصیتیں بھی ہیں کہ وہ فراض سے پاک ہوتا ہے۔ کبھی کسی مقصد کے لیے ناجائز تدبیریں گوارا نہیں کرتا۔ راہِ حق میں اس تیزی سے قدم اٹھاتا ہے کہ عقل کبھی وہ تیزی اختیار نہیں کر سکتی۔ سب سے آخر میں یہ کہ عشق ہر خوف اور ڈر سے کاملاً آزاد ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عقل اور عشق دونوں خاص مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ دونوں کو ضرورت پیش آتی ہے تو ان مقاصد کے لیے خونریزی بھی گوارا کر لیتے ہیں اور عشق کی خونریزی عقل کی خونریزی

سے زیادہ وسعت اختیار کر سکتی ہے، لیکن دونوں میں فرق ہے۔ عقل محدود اغراض کے لیے کام کرتی ہے، عشق کے مقاصد ہمیشہ بلند اور ذاتی اغراض سے بالکل پاک ہوتے ہیں۔ عشق کی باقی خصوصیات کی طرف شعر کے دوسرے مصرع کی شرح میں اشارے کیے جا چکے ہیں:۔

۴۔ عقل و عشق کے درمیان فرق کے دوسرے پہلو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔ عقل اپنے مقصد کے لیے قدم اٹھانے سے پہلے اسباب اور وسائل پر غور کرتی ہے، ان کی فراہمی کی فکر میں رہتی ہے، نیز یہ سوچتی ہے کہ فلاں قدم اٹھانے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے برعکس عشق عمل کے میدان کا شہسوار ہے۔ وہ ہمیشہ آگے بڑھتا ہے، سرگرم کار رہتا ہے، نہ اس امر کی پروا کرتا ہے کہ اسباب اور ساتھیوں کا کیا حال ہے، نہ اس جھنجھٹ میں پڑتا ہے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ صرف یہ جانتا ہے کہ فلاں کام ہونا چاہیے اور اس کے لیے میدان میں اتر آتا ہے۔

۵۔ عشق اپنے بازو کی قوت سے شکار کرتا ہے۔ ہیر پھیر اور ایچ پیچ سے کام نہیں لیتا۔ عقل فطرتاً مکار ہے اور وہ مکر و فریب کے جال پھیلاتی رہتی ہے۔

۶۔ عقل کا سرمایہ خوف اور شک کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے برعکس عشق سے عزم اور یقین جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ عقل جدھر قدم اٹھاتی ہے، ڈرتی ہوئی اٹھاتی ہے اور اسے یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ عشق ایسی ہر بات سے آزاد ہے۔ وہ عزم و یقین سے کام لیتا ہے اور ہر اچھے مقصد کے لیے اس انداز میں کام شروع کر دیتا ہے کہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا:۔

۷۔ عقل جو تعمیر کرتی ہے، اس کا نتیجہ ویرانی ہوتا ہے، لیکن عشق اس غرض سے ویران کرتا ہے کہ اسے مستقل طور پر آباد کر دے۔ اس کی مثالیں زندگی میں بے شمار ملتی ہیں، جیسے:۔

ا۔ عقل دولت جمع کرتی ہے، لیکن اس میں سیکڑوں گھرانوں پر بربادی اور تباہی کی آفتیں نازل ہوتی ہیں اور انجام کار عقل کی جمع کی ہوئی دولت بھی اس کے کام نہیں آتی۔ اس کے برعکس عشق خدمتِ عوام کا جذبہ لے کر اٹھتا ہے۔ وہ دولتمندوں سے لیتا ہے اور بہ ظاہر یہ فعل ان کی ویرانی کا مظہر ہے، لیکن حقیقتاً سیکڑوں ضرورت مند گھرانے اسی کی برکت سے آباد ہو جاتے ہیں۔

ب۔ عقل کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتی جو قربانی کا طلبگار ہو۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برباد ہو جاتی ہے۔ عشق ایثار و قربانی کے میدان میں سب سے آگے رہتا ہے۔ اسی وجہ سے کامیابی حاصل کرتا ہے اور جس مقصد و غرض کے لیے اس نے قربانی کی تھی، وہ ہزاروں ہمجنسوں کے لیے راحت و شادمانی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ویرانی آبادی کے لیے تھی اور عقل کی آبادی کا نتیجہ صرف ویرانی تھا۔

ایسی بے شمار مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں:

۸۔ عقل اس دنیا میں ہوا سے بھی زیادہ سستی ہے، عشق بہت کمیاب ہے اور اُس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

۹۔ عقل چون و چند کی بنیاد پر مستحکم ہوتی ہے۔ عشق چون و چند کا روادار ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس لباس سے عاری ہے۔

مراد یہ ہے کہ عقل بال کی کھال نکالنے میں لگی رہتی ہے اور اسی کو سب سے بڑا کارنامہ سمجھتی ہے۔ عشق ہر قدم پر نفع نقصان کے ناپ تول میں نہیں لگا رہتا، وہ ایک بڑا مقصد سامنے رکھ کر ہمت سے اٹھتا ہے۔ اور جب تک اسے پورا نہیں کر لیتا، دم نہیں لیتا۔

۱۰۔ عقل کہتی ہے کہ اپنے آپ کو آگے بڑھا یعنی دولت، عزّت، حکومت اور شہرت حاصل کر۔ عشق کہتا ہے کہ آگے بڑھانے کا کیا مطلب؟ اپنے آپ کو آزمانا چاہیے کہ حق کے لیے قربانی کس قدر کی جا سکتی ہے اور قربانی کا درجہ کیا ہے؟

۱۱۔ عقل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسب سے حاصل کی جاتی ہے اور مشق سے بڑھ سکتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسے غیر سے آشنائی پیدا کرنے میں تامّل نہیں ہوتا، بشرطیکہ کوئی فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔ اس کے برعکس عشق صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے۔ وہ جسے چاہے اس دولت سے نوازدے اور غیر سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت اپنے ہی حساب اور جانچ پڑتال میں مصروف رہتا ہے۔

۱۲۔ عقل انسان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ راحت و شادمانی حاصل کرو اور مزے کی زندگی گزارو۔ اس کے برعکس عشق یہ کہتا ہے کہ خدا کے سچے بندے بن جاؤ اور ماسوا کی ہر غلامی و محکومی سے آزاد ہو جاؤ۔

۱۳۔ عشق کے لیے حرّیت آرام، سکون اور راحت کا باعث ہے۔ اس کے ناقے کی ساربان حرّیت ہے۔

ظاہر ہے کہ اقبال نے اس بیان میں عقل کے جن پہلوؤں کی مذمّت کی ہے، وہ ہر شخص کے نزدیک مذمّت ہی کے لائق ہیں: مثلاً ہر لحظہ ذاتی فائدہ سامنے رکھنا، زندگی کے کاموں میں جائز و ناجائز اور زیبا و نازیبا کا کچھ خیال نہ کرنا، اپنے فائدے کے لیے غیروں سے مل جانا، زندگی کا مقصد صرف ذاتی راحت و آسائش کو قرار دے لینا یا دولت و عزّت حاصل کرنے کے لیے سرگرم کار رہنا۔ جہاں جہاں یہ چیزیں نظر آئیں، سمجھ لینا چاہیے کہ وہی عقل کام کر رہی ہے جس کی مثالیں ابھی بیان ہوئیں۔ یہ انسانوں کے لیے زیبا نہیں بلکہ باعثِ ننگ ہے۔ اس کے برعکس عشق ہمیشہ اعلیٰ مقاصد پر نظر رکھتا ہے۔ بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار رہتا ہے۔ دشمن کے خلاف بھی ناجائز وسیلوں سے کام نہیں لیتا۔ سب کو خدا کی بندگی اور اس کے سوا ہر شے سے آزادی کی دعوت دیتا ہے۔ دنیا کی تعمیر عقلِ ہوس پیشہ پر نہیں بلکہ عشقِ حق اندیش پر موقوف ہے:

امام حسینؓ ۱۔ تُو نے سنا کہ لڑائی کے وقت عشق نے ہوس پرور عقل سے کیا سلوک کیا؟

عشق و عقل کا فرق پوری طرح واضح کر دینے کے بعد واقعہ کربلا کا ذکر شروع کرتے ہیں۔ لڑائی سے مراد جنگ کربلا ہے۔ عشق کے علمبردار حضرت امام حسینؓ ہیں اور عقل ہوس پرور فریقِ مخالف کو کہا گیا ہے۔

۲، ۳۔ وہ عاشقوں کے امام اور پیشوا حضرت فاطمہؓ کے فرزند ارجمند، جنھیں رسول اللہ صلعم کے باغ میں سروِ آزاد کی حیثیت حاصل تھی، ان کے والد ماجد حضرت علیؓ بسم اللہ کی ب تھے اور فرزند یعنی امام حسینؓ قرآن مجید کی آیت وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ کا مطلب و مفہوم بن گئے۔

آخری شعر ان مناقب پر مبنی ہے جو شیعہ حضرات کے نزدیک مسلم ہیں۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علیؓ کو بائے بسم اللہ قاآنی نے کہا۔ اقبال نے مناقب میں اسے بھی شامل کر لیا۔

۴۔ سب سے بہتر امت یعنی ملت اسلامیہ کے اس شہزادے کی شان یہ تھی کہ رسولوں کے خاتم کا دوشِ مبارک اس کے لیے اچھی سواری قرار پایا۔

۵۔ عشق غیور امام حسینؓ ہی کے خون سے سرخرو ہوا۔ انھیں کے مضمون سے اس مصرع میں شوخی پیدا ہوئی۔ یعنی امام حسینؓ نے حق کی شیفتگی میں انتہائی ناسازگار حالات کے تحت شہادت بہ طیب خاطر قبول کر لی، اس طرح عشق غیور کے لیے سرخروئی کا سامان بہم پہنچایا۔ عشق کو غیور اس لیے کہا کہ وہ باطل کے مقابلے میں دبنا یا پیچھے ہٹنا گوارا ہی نہیں کر سکتا اگرچہ حالات بظاہر کتنے ہی ناموافق ہوں۔ غیرت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ پر بھروسا رکھتے ہوئے مقابلے میں قدم جما لے۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم عشق غیور کو ایک مصرع فرض کریں تو اس مصرع میں شوخی امام حسینؓ کے مضمون کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ شوخی سے بظاہر مصرع کی خوبی اور دل آویزی مراد ہے۔

۶۔ امام حسینؓ کا رتبہ بلندی میں آسمان کے برابر تھا۔ امت کے درمیان ان کی حیثیت وہی تھی جو سورۂ اخلاص کو قرآن کے درمیان حاصل ہے۔

ایک صحیح روایت میں آیا ہے کہ سورۂ اخلاص قرآن مجید کے تیسرے حصے کے برابر ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بنیادی طور پر قرآن مجید کے مطالب کو تین عنوانوں کے تحت لایا جا سکتا ہے۔ اول توحید، دوم احکام، سوم ایام اللہ یعنی قصص۔ سورۂ اخلاص توحید کی جامع ہے، اس لحاظ سے اسے قرآن مجید کا ثلث قرار دیا گیا۔ امام حسینؓ توحید کی عزت کے لیے میدان جنگ میں اترے، اس وجہ سے امت میں انھیں سورۂ اخلاص سے مشابہ کہا گیا اور محض تبرک کے طور پر بھی یہ مضمون شاعر کے نقطۂ نگاہ سے موزوں سمجھا جا سکتا ہے یعنی جس طرح سورۂ اخلاص کو قرآن مجید میں ایک خاص حیثیت حاصل

ہے، اسی طرح امام حسینؓ کو ملتِ اسلامیہ میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔

۸،۷۔ موسیٰؑ اور فرعون، شبیرؓ اور یزید خاص افراد تھے، لیکن اصل میں یہ دو متضاد قوتوں کے مظہر تھے۔ ان میں سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت امام حسینؓ حق کے علمدار تھے۔ فرعون اور یزید نے باطل کی پاسداری کی۔ دونوں قوتیں ابتدا سے چلی آتی ہیں اور ان کے درمیان کشمکش بھی ہوتی رہی ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ حق زندہ رہتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت حسینؓ جیسے بزرگ اس کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ باطل آخر حسرت کی موت کا داغ بن جاتا ہے یعنی اس کا انجام ہمیشہ حسرت ناک ہوتا ہے، جیسا کہ فرعون کا ہوا۔

معرکۂ کربلا ۱، ۲، ۳، جب خلافت نے قرآن مجید سے تعلق توڑ لیا، حریت کے حلق میں زہر ڈال دیا گیا تو یہ حالت دیکھ کر سب سے بہتر اُمت کا وہ نمایاں ترین جلوہ یوں اٹھا جیسے قبلے کی جانب سے گھنگھور گھٹا اٹھتی ہے اور اُٹھتے ہی جل تھل ایک کر دیتی ہے۔ یہ گھنگھور گھٹا کربلا کی زمین پر برسی اور چھٹ گئی۔ ویرانوں کو لالہ زار بنا دیا اور چل دی۔

۴۔ قیامت تک کے لیے ظلم و جور اور مطلق العنانی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ امام حسینؓ ہی کی موجِ خوں نے حریت کا گلزار کھلا دیا۔

۵۔ امامؓ موصوف حق کی خاطر خاک و خون میں تڑپے، اس وجہ سے کلمۂ توحید کی بنیاد بن گئے۔

اقبال نے خود حاشیے میں فرمایا ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرع:

پس بنائے لا الہ گردیدہ است

کا مفہوم اس مشہور رباعی سے لیا گیا ہے جس کا چوتھا مصرع ہے:

حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؓ

اور یہ رباعی خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب ہے۔ ارباب تحقیق کے نزدیک یہ انتساب درست نہیں۔ معین الدین معین نامی متعدد شاعر گزرے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رباعی کس کی ہے۔

۶، ۷۔ امام حسینؓ نے یہ جنگ صرف اس لیے گوارا کی کہ خلافت اُن اصول کے مطابق قائم ہو، جو قرآن مجید نے پیش کیے۔ ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ خود سلطنت حاصل کریں۔ اگر وہ سلطنت کے خواہاں ہوتے تو اتنے تھوڑے آدمیوں اور معمولی سر و سامان کے ساتھ کیوں مکۂ معظمہ سے کوفہ کی طرف جاتے؟ ان کے دشمن صحرا کے ذرہ ہائے ریگ کی طرح بے شمار تھے۔ دوستوں اور رفیقوں کی تعداد اُتنی ہی تھی، جتنی یزداں کے اعداد کی ہے۔ یزداں کے عدد بہ قاعدۂ ابجد بہتر ہوتے ہیں۔ امام حسینؓ کے تمام ساتھی بھی کربلا میں اتنے ہی تھے۔

معلوم ہے کہ جب امام حسینؓ مکۂ معظمہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو خلافت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ صوبۂ شام سے

حکمرانی کے بل پر یزید کی بیعت لے لی گئی تھی۔ غالباً بعض اور مقامات پر بھی اموی کارندوں نے یزید کی بیعت کے لیے سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ مصر، حجاز اور یمن نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ عراق کا مرکز امام مسلم بن عقیل کی وساطت سے امام حسینؓ کی بیعت کر چکا تھا۔ نہ لڑائی کا کوئی موقع تھا، نہ ظاہری حالات کی بنا پر امام حسینؓ کو اس قسم کا کوئی اندیشہ تھا۔ لہٰذا معمولی حالت میں اہل و عیال، بعض اعزہ اور احباب کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ خیال یہی تھا کہ کسی جھگڑے کے بغیر مناسب فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن مکہ معظمہ سے کربلا تک سفر کے دوران میں عراق کی حالت بدل گئی۔ عبیداللہ ابن زیاد کے جبر نے سب کو اس عہد سے پھر جانے پر مجبور کر دیا جو حضرت مسلمؓ کے ہاتھ پر امام حسینؓ کے لیے کر چکے تھے۔ جو اپنے عہد پر استوار رہے، انھیں شہید کر دیا گیا۔ امام حسینؓ کوفہ کے قریب پہنچے تو یہ حالات معلوم ہوئے۔ ساتھ ہی ابن زیاد کی طرف سے ایک جیش نے امام کے لیے آزادانہ نقل و حرکت ناممکن بنا دی۔ یہاں تک کہ کربلا کا دردناک واقعہ پیش آ گیا اور امام حسینؓ نے حق کے لیے سب کچھ صابرانہ برداشت کر لیا۔ ایسی مثال ملنا مشکل ہے ——————— حریت کا یہی جذبہ ہے، جس کے لیے اقبال نے واقعۂ کربلا کو منتخب کیا۔

۸۔ امام حسینؓ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے آئینہ دار تھے، یعنی وہ قربانی تو اجمال کی حیثیت رکھتی تھی، اس کی تفصیل امامؓ موصوف نے پیش کر دی۔

مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے غیبی اشارے کی بنا پر جگر بند کی قربانی کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ بھی خوشی خوشی راہِ خدا میں جان دینے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے حضرت ابراہیمؑ کو آخری وقت پر روک دیا اور قربانی کی نوبت نہ آئی۔ اسی واقعے کی یادگار میں عیدالضحیٰ کی قربانیاں ملتِ اسلامیہ کا شعار بن گئیں۔ فَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کے اصل معنی یہی تھے۔

اقبال کہتے ہیں کہ قربانی کی نوبت نہ آئی، اگرچہ پورے سامان جمع ہو چکے تھے اس لیے معاملہ اجمال کی منزل میں رہا۔ امام حسینؓ نے اپنی اور اقربا و رفقا کی جانیں راہِ حریت میں بے دریغ قربان کر دیں۔ یوں اجمال کو تفصیل کے دائرے میں پہنچا دیا۔ وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ کی یہ تفسیر شیعہ حضرات نے کی ہے۔

۹، ۱۰۔ امامؓ موصوف کا عزم پہاڑوں کی طرح پختہ، پائدار، تیز اور کامیاب تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ تلوار صرف دین کی عزت کے واسطے بے نیام ہو سکتی ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ شریعت کی حفاظت ہو یعنی کسی چھوٹی یا بڑی ذاتی غرض کے لیے تلوار نہیں اٹھائی جا سکتی۔ امام حسینؓ کے عزم کی جتنی صفتیں بیان کی گئیں، ان کی غرض یہ تھی کہ امام نے صرف دین کے لیے تلوار اٹھائی، اس میں ان کی ذاتی غرض کوئی نہ تھی۔

۱۱- معلوم ہو جانا چاہیے کہ مسلمان خدا کے سوا کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ اُس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھک سکتا۔

۱۲- امام حسینؓ کے خون نے دینِ حقّہ اسلام کا یہ راز کھول کر بیان کر دیا اور سوئی ہوئی ملّت کو جگا دیا یعنی ملّت اس حق سے غافل تھی۔ امام حسینؓ نے اس کی غفلت زائل کر دی۔

۱۳- انھوں نے "لا" کی تلوار میان سے کھینچی تو خداوندانِ باطل کی رگوں سے خون نکال دیا۔

۱۴- اِلّا اللہ یعنی توحید کا نقش صحرا کے سینے پر بٹھا دیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نقش ہماری نجات کے لیے وصیت نامہ تھا یعنی ہم اسی نقش کی پیروی کرتے ہوئے نجات کی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔

۱۵- ہم نے قرآن مجید کی تعلیمات امام حسینؓ سے حاصل کیں اور انھیں کی روشن کی ہوئی آگ سے شعلے جمع کرتے رہے۔

۱۶، ۱۷- شام کی شوکت مٹ گئی۔ بغداد کا جاہ و جلال رخصت ہو گیا۔ غرناطہ کی شان و عظمت یاد بھی نہ رہی مگر اس کے مقابلے میں امام حسینؓ کی مضراب ہمارے ساز کے تار اب تک بدستور چھیڑ رہی ہے اور ان سے نغمے نکل رہے ہیں۔ اب تک ان کے نعرۂ تکبیر سے ہمارے ایمان تازہ ہوتے ہیں۔

مطلب یہ کہ امام حسینؓ کے واقعے کی اہمیت شام کی شوکت، بغداد کے جلال اور غرناطہ کی عظمت سے بدرجہا زیادہ ہے۔

۱۸- اے صبا! اے دُور افتادہ لوگوں کی قاصد! ہمارے آنسوؤں کا ہدیہ امام حسینؓ کے مرقدِ مقدس تک پہنچا دے۔

تیرھواں باب

ملّتِ اسلامیہ کی آفاقیت

اس باب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ملّتِ محمدّیہ کی بنیاد توحید و رسالت پر رکھی گئی ہے، لہٰذا اسے کسی مقام سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔

__تمہید__ ہماری ملّت کسی مقام سے وابستہ نہیں۔ مختلف ملک اس کے لیے جسم کا کام دیتے ہیں، لیکن ہماری روح کا وطن اسلام ہے۔ حضرت کعبؓ نے اپنے قصیدے میں رسول اللہ صلعم کو "سیف الھند" کہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا "سیف اللہ" کہو، گویا کسی ایک ملک سے نسبت گوارا نہ فرمائی۔ مسلمان کسی ایک سرزمین سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے آقا ...

وطن سے ہجرت کی اور مکے کی بنا پر ملت کی بنیاد رکھی۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضورؐ نے دشمنوں سے ڈر کر وطن چھوڑا تھا۔ حضورؐ کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے لے رکھا تھا۔ ہجرت کا مقصد یہ ہے کہ چھوٹی چیز بڑی چیز کے لیے بے تکلف ترک کر دی جائے۔ مسلمان کو بھی کسی مقام سے وابستہ نہ ہونا چاہیے:۔

ملت اسلامیہ کی بنیاد سفال۔ مٹی۔ مٹی کا برتن:۔

مرز و بوم۔ سرزمین۔ مرز، بے آباد زمین، بوم، آباد زمین:

کعب، قصیدہ بانت سعاد کے مصنف۔ رسول اللہ صلعم کو بہت دکھ دیتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر طائف چلے گئے۔ پھر اسلام قبول کر لیا۔ وہاں سے مشہور قصیدہ بانت سعاد لکھ کر بھیجا اور معذرت چاہی، جس کے صلے میں حضورؐ نے ردائے مبارک عطا فرمائی۔ امیر معاویہ نے یہ ردا بڑی قیمت دے کر لے لی تھی۔ خلفا اسے عیدین کے موقع پر اوڑھا کرتے تھے۔

مسلول۔ سونتی ہوئی۔ کھینچی ہوئی۔ بے نیام

طاعت و طیب و نساء۔ اس شعر میں مشہور حدیث کا مضمون بیان ہوا ہے:۔

حبب الیّ من دنیا کم ثلاث الطیب	مجھے تمھاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں: خوشبو اور
والنساء و قرۃ عینی فی الصلوٰۃ	عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

یاوہ۔ گم۔ ناپدید۔

فراگیر۔ سمیٹ لینے والا۔

جہات۔ جہت کی جمع۔ اطراف۔

فراخا۔ فراخ نائے کا مخفف۔ وسعت

۱۔ ہماری ملت کا جوہر کسی مقام سے وابستہ نہیں۔ یہ ایک تند شراب ہے، اسے کسی خاص پیالے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔

۲، ۳۔ بے شک ہمارے جسم ہندی، چینی، رومی اور شامی مٹی سے بنے ہیں لیکن ہمارے دل ہند، روم اور شام سے نہیں، ان کا وطن تو اسلام کے سوا کوئی نہیں:۔

ظاہر ہے کہ جس ملت کی بنیاد توحید و رسالت ہے، وہ کسی خاص زمین سے وابستہ کیونکر ہو سکتی ہے؟ وہ تو اس کائنات کے تمام افراد اپنے اندر شامل کر لے گی جو توحید و رسالت کے قائل ہیں اور سب یکساں اس ملت کے افراد ہوں گے۔ اسی لیے کہا کہ ہمارے جسم کسی مٹی کے ہوں، دلوں کا وطن صرف اسلام ہے:

۴، تا ۷۔ ہمارے رسولؐ کی خدمت میں حضرت کعبؓ نے جو پاک سرشت تھے، قصیدہ بانت سعاد بطور ہدیہ پیش کیا۔ اس قصیدے میں رسول اللہ صلعم کی مدح و نعت میں بڑے بیش قیمت موتی پروئے۔ اس میں کہا کہ حضورؐ ہندستان کی تلواروں میں سے ایک سونتی ہوئی تلوار ہیں۔ حضورؐ کا مقام آسمان سے بھی بلند تھا اور کسی ایک ولایت سے نسبت پسند نہ آئی۔

فرمایا: "اللہ کی تلواروں میں سے کھنچی ہوئی تلوار کہو۔ تم حق پرست ہو، راہِ حق کے سوا کہیں گامزن نہ ہو۔"

ان اشعار میں جس نکتے پر زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے کسی سرزمین سے نسبت پسند نہ فرمائی۔ اسی طرح حضور ملّت کو کسی مقام سے وابستہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ حضرت کعب نے سیف الھند صرف ہندوستانی تلواروں کی برتری کی بنا پر کہا تھا، حضور نے فرمایا کہ سیوف الہند کی جگہ سیوف اللہ کہو۔

۸، ۹۔ اسی طرح اُس ذاتِ پاک نے، جس پر چھوٹی بڑی چیزوں کے بھید کھُلے ہوئے تھے اور جس کی گردِ پا انبیاء کی آنکھوں کے لیے سرمہ تھی، اُمّت سے فرمایا کہ تمھاری دنیا سے مجھے نماز، خوشبو اور عورتیں پسند ہیں۔

یہاں دو باتوں کی طرف سرسری اشارہ ضروری ہے۔ اوّل انبیاء میں رسول اللہ صلعم کی افضلیت کسی تشریح کی محتاج نہیں، لیکن جو طریقہ اقبال نے اظہارِ افضلیت کا اختیار کیا، وہ دینی نہیں، شاعرانہ ہے۔ دوم حدیث کے متعلق ازروئے اصول گفتگو کی جا سکتی ہے، لیکن جن تین چیزوں کا اس حدیث میں ذکر ہے، ان کے متعلق غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ اوّل نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا، گویا انسان کے لیے اہم ترین اور محبوب ترین مصروفیت خدا کی عبادت ہے۔ دوم خوشبو کی پسندیدگی حسنِ ذوق اور لطافتِ فطرت کی روشن دلیل ہے۔ سوم نساء سے محبت انسانی زندگی کا ایک پاکیزہ وظیفہ ہے۔ عورت ماں ہے یا بیوی یا بیٹی، تینوں حالتوں میں اس سے محبت فطرتِ سلیمہ کا اظہار ہے۔ اعلیٰ زندگی کا راز یہی ہے۔ اسے غلط تاثرات کے تحت غیر مناسب قرار دینا اچھی فکر اور اچھے فہم کا ثبوت نہیں۔

۱۰۔ اقبال نے جس نکتے کو توجہ کا مرکز بنایا وہ "دنیا کم" میں سے حرفِ "کم" ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر معنی کا ذوق تیرا رہنما ہے تو اس حرفِ "کم" یا حرفِ "شما" میں ایک خاص نکتہ چھپا ہوا ہے، یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "تمھاری دنیا میں سے مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔" اقبال کہتے ہیں:

۱۱۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ پاک ذات، جسے ہستی کے شبستان میں شمع کی حیثیت حاصل تھی یعنی جس کی وجہ سے اندھیرے کی جگہ اجالا ہوا، دنیا میں موجود رہی، لیکن دنیا سے کوئی تعلق پیدا نہ کیا۔ اگر تعلق پیدا کیا ہوتا تو دنیا کا ذکر "ہماری" کہہ کر نہ فرماتے۔

۱۲۔ جب آدمؑ آب و گل ہی میں تھے یعنی پیدا نہیں ہوئے تھے اس وقت حضور کا جلوہ فرشتوں کے سینوں میں حرارت پیدا کر رہا تھا۔ یہاں اشارہ اس مشہور عام حدیث کی طرف ہے:

کنت نبیّاً و اٰدم بین الماء و الطّین۔ میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم مٹی

اور پانی کے درمیان تھے۔

لیکن یہ حدیث ثابت نہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، شاعر مناقب میں عموماً حدود و تحقیق کے پابند نہیں رہتے۔

۱۳ - مجھے معلوم نہیں کہ حضورؐ کا وطن کہاں ہے، صرف اتنا جانتا ہوں کہ حضورؐ ہم سے آشنا تھے۔

۱۴ - حضورؐ عناصر کے اس مجموعے کو ہمارا جہان شمار فرماتے تھے اور اپنے آپ کو ہمارا مہمان قرار دیتے تھے۔

بعض اصحاب نے اس سلسلے میں زیادہ باریک بینی سے کام لیا ہے، حالانکہ ان اشعار کا مطلب وہ نہیں، جو انھوں نے سمجھا۔ یقیناً رسول اللہ صلعم اس دنیا میں رہے۔ یہاں رہنے والے انسانوں کی دائمی رہنمائی فرمائی۔ انھیں سکھایا کہ یہاں بہترین زندگی گزارنے کی صورت کیا ہے اور اگلی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور رحمتوں سے کیونکر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن حضورؐ اس انداز میں یہاں رہے گویا مہمان تھے۔ اس دنیا سے تعلق محض اُتنا تھا، جتنا کہ ناگزیر تھا۔ اقبال صرف یہی نکتہ پیش کر رہے ہیں، اگرچہ کسی کے نزدیک شعر میں اس باریکی کے تمام پہلو پوری طرح محفوظ نہ رہے ہوں۔

۱۵/۱۶ - ہمارے سینوں میں جانیں نہیں رہیں اور ہم اپنے آپ کو مٹی کے اس گھروندے میں گم کر بیٹھے۔ اگر تو مسلمان ہے تو دل کسی ایک ولایت سے وابستہ نہ کر اور چون و چند کے اس جہان میں گم نہ ہو۔

۱۷ - مسلمان کسی سرزمین کے اندر نہیں سماتا۔ اس کے دل میں شام و روم خود گم ہو جاتے ہیں۔

۱۸ - دل ہاتھ میں لے کیونکہ دل کی وسعت میں مٹی اور پانی کی یہ دنیا گم ہو جاتی ہے۔

ہجرت کی حقیقت ۱ - ہمارے آقا یعنی رسول اللہ صلعم نے وطن سے ہجرت کی اور اس طرح اسلامی قومیت کا عقدہ کھول دیا۔

مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مکۂ معظمہ کو چھوڑ دیا اور مدینۂ منورہ میں سکونت اختیار فرمائی۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جن اعلیٰ مقاصد کی خاطر حضورؐ خدا کے حکم کے مطابق سعی و جہد فرما رہے تھے، ان کا تقاضا یہی تھا، گویا دین کی راہ میں وطن کی حیثیت کچھ نہیں۔ اسے بے تکلف چھوڑا جا سکتا ہے، لیکن دین، جو انسانیت کے لیے اعلیٰ مقاصد کا حامل ہے، نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ مسلمان کی قومیت دین پر مبنی ہو سکتی ہے، وطن پر نہیں۔ اقبال نے ہجرت سے یہی دلیل اخذ کی:

۲ - رسول اللہ صلعم کی حکمت نے ایک ایسی ملت کی بنیاد رکھی، جو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور یہ بنیاد کلمۂ توحید پر رکھی کیونکہ کلمۂ توحید ہی تمام مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑا اور بنیادی رشتہ ہے۔

۳ - پھر دین کے سلطان یعنی رسول اللہ صلعم کی ایک اور نوازش ملاحظہ ہو اور وہ یہ کہ روئے زمین کو ہماری سجدہ گاہ بنا دیا۔

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم نے اپنی بعض خصوصیات بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا، کہ میرے لیے روے زمین مسجد بن گئی۔ مقصد بہ ظاہر یہ تھا کہ باقی مذہبوں کی عبادت صرف ان مقامات میں ہو سکتی ہے جو خاص اس غرض سے تعمیر کیے گئے ہوں، لیکن مسلمان کے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں۔ جہاں بھی نماز کا وقت آجائے، وہ بے تکلف ادا کر سکتا ہے۔ اقبال نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ روے زمین کو سجدہ گاہ قرار دے دینے سے ملکی انتسابات ختم ہو گئے، گویا اسے بھی اپنے اصل مقصد یعنی ملت کی آفاقیت کا ثبوت بنایا۔

۴ تا ۶۔ رسول اللہ صلعم کی تعریف تو خود قرآن میں آئی ہے، خدا نے آپ سے حفاظتِ جان کا وعدہ کر لیا تھا۔ قرآن مجید میں آیا ہے:

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ اور اللہ تمھیں انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے گا (سورۂ مائدہ)

دشمن آپ کی ہیبت سے بے دست و پا ہو جاتے تھے اور آپ کی فطرت کا شکوہ ان کے جسموں پر لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے باپ دادا کا وطن کیوں چھوڑا؟ کیا تیرے دل میں یہ خیال ہے کہ دشمنوں سے ڈر کر بھاگ گئے؟

قرآن مجید میں حفاظتِ جان کا جو وعدہ آیا ہے، اس کے متعلق مختلف توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ رہیں گے یا یہ کہ اس سے مقصود جسمانی حفاظت نہیں بلکہ رسالت کی حفاظت ہے۔ لیکن بدیہی معنی یہی ہیں کہ تبلیغ رسالت کے سلسلے میں کتنے ہی خطرات پیش آجائیں، آپ کی جان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اگر صرف رسالت کا تحفظ مقصود ہوتا تو قرآن مجید اسے واضح طور پر بیان کر سکتا تھا، استعارے کا رنگ اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اور تبلیغ رسالت کے سلسلے میں حفاظت کے دعوے سے بھی مراد یہی ہے کہ اس پیغام کے آخری منزل پر پہنچنے تک حضورؐ ضرور محفوظ رہیں گے۔

۷۔ اقبال کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے دشمنوں کے خوف سے وطن نہیں چھوڑا۔ قصہ گو واعظوں نے سچی بات ہم سے چھپالی اور ہجرت کے معنی غلط بیان کر دیے۔

۸۔ ہجرت مسلمان کی زندگی کا دستورِ عمل ہے۔ یہ بھی ان اسباب میں سے ہے، جن سے ملت کے قدم مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں۔

۹۔ ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پانی کم ہو، وہاں سے چلے جاؤ۔ شبنم کو چھوڑ دو لیکن اس مقصد سے کہ تم دریا کو قبضے میں لے آؤ۔

مراد یہ ہے کہ ہجرت اعلیٰ مقاصد کے لیے زیادہ منظم طریق پر کام کرنے کا موقع دیتی ہے جو شخص اس موقع سے فائدہ اٹھائے گا۔ وہ مقاصد کی پیشبرد کا ذریعہ بنے گا اور مقاصد جس حد تک پورے ہوں گے، کامیابی و کامرانی کی منزل قریب ہوتی جائے گی۔ اقبال نے اس امر کو شاعرانہ انداز میں یوں پیش کیا کہ شبنم کو چھوڑ کر سمندر کی تسخیر میں مصروف ہو گئے۔ اسی مضمون کو نئی شکل میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

۱۰۔ تو پھول کو چھوڑ دے، انیز نصب العین وہ باغ ہے، جو پھولوں سے لبریز ہو۔ تو پھول کے چھوڑنے کو اپنا نقصان سمجھتا ہے، بے شک بہ ظاہر یہ نقصان ہے، لیکن ایسا نقصان جس کی تراش خراش سے بہت بڑے نفع کا سروسامان ہوتا ہے۔

اب آفاقیت کی چند مثالیں بزمِ کائنات سے پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

۱۱۔ دیکھو، سورج کے لیے عزت و آبرو اسی میں ہے کہ آزاد چلے پھرے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عرصۂ آفاق اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔

۱۲۔ تو ندی کی طرح بارش سے پانی کا سرمایہ نہ لے، جو بہر حال بھیک ہے۔ کناروں سے بے نیاز ہو جا اور حد و نہایت کی طلب نہ کر۔

مطلب یہ کہ ندی اُسی وقت تک ندی ہے، جب تک بارش اس کے لیے پانی بہم پہنچاتی ہے۔ اگر بارش ختم ہو جائے تو ندی کی زندگی بھی ختم ہو جائے۔ دوسری طرف سمندر کو دیکھو کہ دور دور تک اس کے کنارے کا پتا نہیں۔ بارش ہو یا نہ ہو، دریاؤں کا پانی اس میں گرے یا نہ گرے، مگر اس کی موج زنی بدستور قائم رہتی ہے۔ پھر کیوں ندی ہونا گوارا کیا جائے، سمندر کیوں نہ بنا جائے؟

۱۳۔ کبھی سوچا کہ ہیبت ناک سمندر کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک چٹیل میدان تھا۔ جب اس نے ساحل اختیار کر لیا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

یہ سمندر کے متعلق شاعرانہ توجیہ ہے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ حد بندی نہ ہونی چاہیے۔ آفاقیت زیادہ سے زیادہ وسیع ہو۔ سمندر وسیع میدان تھا۔ جب اس نے ایک جگہ ساحل قائم کر لیا اور نظر ڈالی تو اس پر واضح ہوا کہ میری ہستی تو محدود ہو گئی۔ اس پر شرم آئی۔ شرم کا نتیجہ یہی تھا کہ پانی پانی ہو گیا۔

۱۴۔ تجھے چاہیے کہ ہر شے کی تسخیر کا پختہ ارادہ کرے۔ اسی طرح تو تمام چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے کا اہل بن جائے گا۔

۱۵ - مچھلی کی طرح سمندر کو اپنا وطن بنا، یعنی کسی ایک مقام کا پابند نہ رہ۔ مچھلی جہاں چاہتی ہے، چلی جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمان کو بھی مقامیت سے آزاد ہونا چاہیے :

۱۶ - جو شخص اطراف وحدود کی قید سے آزادی حاصل کرے، وہ آسمان کی طرح چھ طرفوں میں آباد ہو جائے گا۔ یعنی آسمان کو جہاں سے بھی دیکھو گے، قائم نظر آئے گا۔ شرق و غرب، شمال و جنوب، تحت و فوق، کوئی سمت ایسی نہیں، جہاں آسمان نہ ہو۔ یہ خصوصیت آسمان کو اس وجہ سے ملی کہ اس نے اپنے آپ کو اطراف کی قید سے آزاد کر لیا۔

۱۷ - خوشبو پھول سے نکلتی ہے تو جولانی اختیار کرتی ہے یعنی ہر طرف پھیلتی ہے اور باغ کی وسعت میں اپنے آپ کو پھیلا دیتی ہے :

۱۸، ۱۹ - اے مخاطب! تُو نے باغ میں اپنے آپ کو ایک جگہ سے وابستہ کر رکھا ہے۔ بلبل کی طرح تُو نے ایک پھول سے عہدِ محبت باندھ لیا ہے۔ تجھے چاہیے کہ صبا کی طرح اپنے کندھے سے قبول کا بوجھ اتار دے یعنی مختلف خوشبوئیں اپنے دامن میں سمیٹنے کی روش ترک کر دے اور پورے باغ کو اپنی آغوش میں لے لے۔

مراد یہ ہے کہ خودی اور خودداری دوسرے کی خوشبوؤں کا حامل بننے میں نہیں بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ پورے باغ کو اپنے حلقۂ اقتدار میں لے لے۔

۲۰ - نئے زمانے میں قدم قدم پر دھوکے اور فریب کی ٹھوکریں ہیں۔ ذرا سوچ سنبھل کر قدم اٹھا یہاں ڈاکے پڑتے ہیں۔ اے چلنے والے! ذرا چوکس ہو کر چل :

عصرِ نو کا ذکر بہ طور خاص اس لیے کیا گیا کہ آج کل مقامی اور جغرافیائی قومیت کا بڑا زور ہے۔ یہ فتنہ یورپ سے اٹھا اور اسلامی ملکوں پر بھی برساتی گھٹا کی طرح چھا گیا۔ جو شخص آفاقیت کی دعوت دے رہا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے مخاطبوں کو نئے دور کے فتنوں سے آگاہ کرے، جن کی حیثیت دھوکے اور فریب کی ہے :

چودھواں باب

وطن بنیادِ ملت نہیں

تمہید | جن لوگوں نے وطن کو تنظیم ملت کا ذریعہ بنایا، انھوں نے بھائی چارے کی جڑ کاٹ دی۔ انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ انسانیت دنیا سے ناپید ہو گئی۔ یہ سلسلہ اہل یورپ سے شروع ہوا۔ وہاں دہریت پیدا ہوئی اور مذہب کو ختم کر دیا۔ اس دور میں میکیاولی پیدا ہوا۔ اس نے بادشاہوں کے لیے ایک کتاب لکھی، جس میں حکومت اور مملکت کو معبود بنا دیا۔ اس طرح باطل پھیلا اور فریب کاری ایک فن بن گئی۔

وطن پر ملت کی تعمیر | بئس القرار اور تا احلوا قومھم دار البوار۔ سورۂ ابراہیم کی آیت ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔

اے پیغمبر کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جنھیں اللہ نے نعمت عطا فرمائی تھی، لیکن انھوں نے کفرانِ نعمت سے اسے بدل ڈالا اور اپنے گروہ کو ہلاکت کے گھر میں جا اتارا یعنی دوزخ میں جس میں وہ داخل ہوں گے اور کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔

مُہرہ از کف بروں افشاندن۔ عاجز ہونا۔

چلیپا۔ صلیب۔

فلارنسادیِ باطل پرست۔ یعنی نکولو میکیاولی اٹلی کا مشہور سیاست دان اور مصنف تھا۔ ۲۔ مئی ۱۴۶۹ء کو فلارنس میں پیدا ہوا۔ بارہ چودہ سال اعلیٰ عہدے پر مامور رہا۔ پھر حکومت کا تختہ الٹ گیا تو نئے حکمران نے اسے قید کر دیا۔ کچھ مدت بعد رہا کر کے مضافات میں بھیج دیا۔ وہیں باقی عمر گزاری۔ ۲۰ جون ۱۵۲۷ء کو وفات پائی۔

متعدد کتابیں لکھیں، لیکن سب سے زیادہ شہرت کتاب الملوک کی وجہ سے ہوئی۔ میکیاولی نے اخلاق کے تمام ضابطے بالائے طاق رکھتے ہوئے بادشاہوں اور حکمرانوں کو تلقین کی تھی کہ وطن کی بہتری کے لیے سب کچھ جائز ہے۔ فریب اور دغابازی میں بھی تامل نہ کرنا چاہیے۔

فرجام۔ انجام۔

خسک۔ گوکھرو جس کے کانٹے بڑے سخت ہوتے ہیں۔

تزویر - فریب - دھوکا۔

۱۔ اقبالؔ بتا چکے ہیں کہ اسلامی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے نہ کہ کوئی جغرافیائی خطہ۔ وہ فرما چکے ہیں کہ اسلامی قومیت آفاقی ہے، اسے کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب کہتے ہیں:۔

اہلِ یورپ نے وطن کی بنا پر قوم کی تعمیر شروع کی، اس طرح اخوت اور برادری کی جڑ کاٹ کر رکھ دی:۔

۲۔ ان لوگوں نے وطن کو اپنی محفل کی شمع بنا لیا اور عالمِ انسانیت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر قبیلے بنا دیا:۔

۳۔ انھوں نے نہایت بُرے ٹھکانے میں بہشت کی تلاش شروع کی، یہاں تک کہ اپنے گروہ کو ہلاکت کے گھر میں جا اُتارا:۔

۴۔ ایک شجرہ وہ تھا، جس نے آدمؑ کو جنت سے نکالا تھا، وطن کی بنا پر ملت کی تعمیر وہ شجر ہے جس کے باعث بہشت اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اللہ اس شجر میں قتل و خون کی تخم کا پھل آنے لگا:۔

۵۔ اس دنیا میں آدمیت افسانہ بن گئی اور آدم کی اولاد نے ایک دوسرے سے بیگانگی اختیار کر لی:۔

۶۔ روح نکل گئی، جسمانی اعضا باقی رہ گئے۔ بیشک قومیں موجود ہیں لیکن آدمیت ختم ہو گئی۔

ان اشعار میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ زیادہ تشریح کا محتاج نہیں۔ یورپ کی حالت زار پر نظر ڈالو، رقبے کے لحاظ سے وہ چھوٹا بر اعظم ہے اور قدم قدم پر وہاں مستقل حکومتیں موجود ہیں۔ ہر حکومت کی ایک جغرافیائی حد ہے، جس کے اندر کے باشندے ایک خاص قوم کہلاتے ہیں۔ گویا چھوٹے سے بر اعظم میں بہت سی قومیں پیدا ہو گئیں اور ہر قوم ایک دوسری کی رقیب اور دشمن ہے۔ اسی وجہ سے بار بار لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ یہ تمام مصیبتیں وطن کی بنا پر تنظیم ملت کے باعث پیدا ہوئیں۔ انسانیت گروہوں میں بٹ گئی۔ انسانوں میں وہ جذبات باقی نہ رہے جو انسانیت کے لیے باعثِ شرف تھے۔ لڑائیوں کی حالت پیشِ نظر لائیے، ہر قوم کس بیدادی اور سنگدلی سے دوسری قوم کو موت کے گھاٹ اتارنے کے درپے رہی۔ جرمنی کے ہوائی جہازوں نے انگلستان و روس میں اور روس و انگلستان کے ہوائی جہازوں نے جرمنی میں جس وسیع پیمانے پر بربادی پھیلائی، اس کا صحیح اندازہ پیش کرنا مشکل ہے۔ بالکل یہی کیفیت ان خطوں میں پیش آئی، جہاں وطن بنیادِ قومیت تھا۔ مثلاً جاپان نے چین یا دوسرے ملکوں میں، اسی طرح امریکہ نے جوہری بموں کے ذریعے ایک ایک لمحے میں ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالات آدمیت گم ہو جانے کے روشن ثبوت تھے۔ قومیں بے شک باقی ہیں، لیکن جن قوموں کے افراد کو بنیادی غلطی نے درندوں سے زیادہ وحشی اور خونخوار بنا دیا، ان سے عالمِ انسانیت کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سچ کہا اقبالؔ نے کہ مذہب حق نے انسانوں کو صلح و امن اور عدل و حق رسی کی تعلیم دے کر اس دنیا میں بہشت کا سروسامان کیا تھا، لیکن یورپ کی ملعون قومیت اس

بہشت کو بھی کھا گئی اور امن کی جگہ خونریزی کی تلخی چھوڑ گئی۔ ۱۸۹۰ء سے یورپ اور امریکہ کے دانشمند اس بنیادی غلطی کی تلافی کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔ پہلے جمعیت اقوام بنائی گئی۔ اب پندرہ سال سے انجمن اقوام متحدہ بنی ہوئی ہے۔ لیکن وطنی قومیت ایک ایسی لعنت ہے کہ ان کوششوں کو بھی بار آور نہیں ہونے دیتی اور آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ برپا رہتا ہے۔

۷۔ جب یورپ میں مذہب کی پکڑ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ سیاست نے لے لی تو یہ درخت جس نے دنیا کو جنت سے محروم کیا تھا، یورپ کے باغ میں جا لگا۔

۸۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسی مذہب کا دور دورہ باقی نہ رہا اور کلیسا نے جو چراغ جلایا تھا، اس کا شعلہ بجھ گیا۔

۹۔ پوپ کا اقتدار باقی نہ رہا اور وہ بے دست و پا اور عاجز ہو کر بیٹھ گیا۔

۱۰۔ مسیحیت کے پیروؤں نے کلیسا کو ٹھکرا دیا اور صلیبی دین کے سکے کھوٹے قرار پائے۔

میکیاولی کی تعلیم

۱۔ دہریت نے مذہب کا لباس پارہ پارہ کر دیا اور شیطان کی بارگاہ سے ایک قاصد آ پہنچا۔

۲۔ یہ قاصد کون تھا؟ فلارنس کا وہ باطل پرست میکیاولی، جس کے سُرمے نے انسانوں کی آنکھیں پھوڑ کر رکھ دیں۔

۳۔ اس باطل پرست نے کتاب الملوک کے نام سے بادشاہوں کے لیے ایک کتاب لکھی اور ہماری زمین میں جنگ و خونریزی کا بیج بو دیا۔

۴۔ اُس کی فطرت انسانیت کے قافلے کو تاریکی کی جانب لے گئی حق اس کے قلم کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

۵۔ آذر کی طرح اس کا پیشہ بھی یہی تھا کہ بت بنائے اور مجسمے تراشے۔ چنانچہ اس کی فکر نے ایک نیا نقشہ تیار کیا۔

۶۔ وہ نقشہ کیا تھا؟ ایک نیا دین پیدا کیا، جس میں مملکت کو معبود بنا دیا یعنی خدا کی جگہ مملکت کو دے دی۔ اس کی حق ناشناس فکر نے نہایت بُری چیز کو نہایت اچھی چیز بنا کر پیش کیا۔

۷۔ اس معبود کے پاؤں چومنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے نقدِ حق کو نفع کی کسوٹی پر کسنا شروع کیا۔

مراد یہ ہے کہ انسانوں کے تمام اعمال میں بنیادی حیثیت حق کو حاصل تھی اور ہر عمل و حرکت کا فیصلہ اسی کی بنا پر ہوتا تھا لیکن میکیاولی نے سیاست کا ایک ایسا مسلک پیش کیا، جس میں مملکت کو مرکزی حیثیت دے دی یعنی اسی کو معبود بنایا اور حق کے بجائے مملکت کے نفع اور فائدے کو اچھائی برائی کا معیار قرار دیا۔

۸۔ میکیاولی کی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے باطل کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ حیلہ گری اور فریب کاری ایک فن بن گئی۔

ظاہر ہے کہ یورپ میں سب سے بڑا سیاست دان اسی کو سمجھا جاتا رہا جو بہت بڑا حیلہ گر ہوتا اور موقع پر بے تکلفی سے جھوٹ بول لیتا۔ چونکہ معیارِ فیصلہ حق نہیں، بلکہ مملکت کا فائدہ تھا، اس لیے حیلہ گری کو نہ صرف درست سمجھا جاتا، بلکہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔

۹۔ میکیاولی نے ایک ایسے مسلک کی بنیاد رکھی، جس کا انجام بہت برا تھا، گویا اس نے زمانے کے راستے پر گوکھرو بکھیر دیے تاکہ ہر چلنے والے کے پاؤں لہولہان ہو جائیں۔

۱۰۔ اس نے اہلِ عالم کی نگاہوں کے سامنے رات کی تاریکی پھیلا دی۔ دھوکے اور فریب کا نام مصلحت رکھ دیا۔

جس حد تک اشعار کے مفہوم کا تعلق تھا، وہ پیش کر دیا۔ لیکن اقبالؔ کی دور اندیشی اور تفکر کی گہرائی نے جو نکتے پیدا کیے، ان کی تشریح ایک دفتر کی محتاج ہے۔ انسان اس خداداد دماغ کی دقیقہ سنجی پر یقیناً حیران رہ جاتا ہے، جو مرحوم کو عطا ہوا تھا۔ واضح رہے کہ یہ سب کچھ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کے لیے کہا گیا۔ اقبالؔ اسلام کی پیروی میں انسانیت کی صحیح تعمیر کے لیے مضطرب تھا۔ البتہ ان قوتوں کو وہ اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے، جو انسانیت کی صحیح تعمیر میں بری طرح خلل انداز تھیں، خواہ وہ قومیں تھیں یا افراد یا عملی نظام۔ اقبالؔ کے نزدیک وہ سب ابلیس و شیطان کے آلۂ کار تھے۔ افسوس کہ وہ اپنی قوم کو جس مقام بلند پر پہنچا کر انسانیت کے لیے رہنما بنانا چاہتے تھے وہ قوم خود فکر و عمل کے اعتبار سے ان قوتوں کے پیچھے لگ گئی جنھیں اقبالؔ عمر بھر راہِ حق سے منحرف قرار دیتے رہے۔

پندرھواں باب

ملّتِ اسلامیہ کی ابدیّت

اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی زمانی حد بھی کوئی نہیں اور اس ملّت کے دوام کا خدا کی طرف سے وعدہ ہو چکا ہے۔

تمہید باغ اور بزم کائنات کے مختلف مناظر پیش کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مناظر بدلتے رہتے ہیں، لیکن باغ اور بزم کائنات اپنی جگہ باقی ہے۔ یہی کیفیت افراد اور ملّت کی ہے۔ افراد مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور ملّت صاحبدل کے دل سے پیدا ہوتی ہے۔ قوم صرف اس وقت مرتی ہے، جب زندگی کا نصب العین چھوڑ دیتی ہے۔ ملّتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کا ایک نشان ہے۔ وہ موت سے بے پروا ہے۔ خدا کا وعدہ موجود ہے کہ اس امّت کا چراغ کبھی نہ بجھے گا۔ پھر تاتاریوں

کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہماری فطرت ابراہیمی ہے۔ ہم نے تاتاریوں کی آگ کو گلزار بنا دیا یعنی وہ ہم پر حملہ کرنے آئے اور خود حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ سب قومیں یکے بعد دیگرے مٹ گئیں، ہماری ملت باقی رہے گی۔ اگر ہم باقی نہ رہے تو کائنات بھی باقی نہ رہے گی:

فنا و بقا | نسترن۔ ایک قسم کا خوشبودار سفید پھول۔ سیوتی۔

پے سپر۔ راستہ چلنے والا۔

ارتباط۔ ربط۔ تعلق۔ میل جول۔

نحن نزلنا۔ اشارہ سورۂ حجر کی اس آیت کی طرف ہے

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ — بلا شبہ خود ہم نے الذکر (قرآن) اتارا ہے اور بلا شبہ خود ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔

ان یطفؤا۔ یہ سورۂ توبہ کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ — یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، حالانکہ اللہ یہ روشنی پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں، اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔

اہرام۔ ہرم کی جمع، مینارہ۔ اہرام مصر کے ان قدیم مثلثی مقبروں کو کہتے ہیں، جن میں سے بڑے بڑے مقبرے دریائے نیل کے کنارے قاہرہ سے قریب ہیں۔

امتزاج۔ ملنا۔ ملانا۔ آمیزش۔

سالمات۔ اجزاء۔ عناصر

۱۔ تو نے بہار کے موسم میں دیکھا ہوگا کہ بلبلیں کس جوش سے گاتی ہیں۔ باغ میں ہر طرف کلیوں اور پھولوں کی کثرت کا یہ عالم ہوتا ہے گویا طوفان آ گیا۔

۲۔ کلیاں دلہنوں کی طرح آراستہ ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا زمین سے ستاروں کی پوری بستی نکل آئی۔

۳۔ سبزے کی کیفیت عجیب ہے۔ نہر کا پانی لوریاں گا گا کر اسے سلاتا ہے۔ صبح کے آنسو یعنی شبنم اس کا منہ دھوتی ہے۔

۴۔ ایک غنچہ شاخ سے پھوٹ کر نکلتا ہے تو نسیم اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

۵۔ ایک غنچہ پھول چننے والے کے ہاتھ سے ٹوٹتا ہے اور خوشبو کی مانند باغ سے باہر نکل جاتا ہے۔

۶۔ قمری گھونسلا بنا لیتی ہے، بلبل اڑ جاتی ہے، شبنم کا قطرہ آ جاتا ہے اور خوشبو رخصت ہو جاتی ہے۔

۷۔ اسی طرح ہزاروں گل لالہ پیدا ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے لیے چمن کی رونق بنتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔

تاہم اس وجہ سے فصلِ بہار کی رونق نہیں گھٹتی ۔

۸۔ نقصان کے باوجود اس کے خزانے میں پھولوں کا وہی عالم رہتا ہے اور مہکنے والے پھولوں کی محفل بدستور سجی رہتی ہے ۔

۹۔ سیوتی، گلاب، چمبیلی کے پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ بہار کی فصل ان سب سے زیادہ پائدار ہوتی اور باقی رہتی ہے :

۱۰۔ جس کان میں گوہر بنتے اور پرورش پاتے ہیں، وہ ایک گوہر کے ٹوٹ جانے سے قدر و قیمت میں گھٹ نہ جائے گی اور اس کی گوہر آفرینیوں میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

۱۱۔ مشرق سے صبحیں اور مغرب سے شامیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ زمانے کے خُم سے سیکڑوں دنوں کا جام نکل جاتا ہے

۱۲۔ لوگ آئے، شراب پی گئے، لیکن شراب بدستور باقی رہی۔ دوش یعنی گزشتہ کل ختم ہو گئی لیکن آنے والی کل باقی ہے۔

۱۳۔ اسی طرح افراد زندگی کی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں اور قومیں اپنی جگہ باقی ہیں بلکہ افراد کی آمد و رفت سے قوموں کا استحکام زیادہ پائدار ہوتا ہے :

فرد اور قوم ۱۔ دوست سفر میں ہیں اور محفل قائم رہتی ہے۔ افراد آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں، ملت کے قیام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

۲۔ فرد کی ذات الگ ہے اور ملت کی صفات الگ ہیں۔ ان دونوں کی موت و حیات کے قواعد و اصول بھی الگ الگ ہیں، پھر خود ہی اس کی مزید توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

۳۔ فرد مٹی کی مٹھی سے پیدا ہوتا ہے اور قوم ان مقاصد و اصول کی بنا پر ترکیب پاتی ہے جو ایک صاحبدل کے قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں صاحبدل سے مراد نبی ہے۔ مثنوی کے تیسرے باب کا عنوان ہی یہ ہے کہ قوم افراد کے میل جول سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت نبوت کی آغوش میں کمال پر پہنچتی ہے چنانچہ عالمِ انسانیت کی ابتدائی غیر متمدن حالت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بعثتِ انبیاؑ کا ذکر یوں فرماتے ہیں:

تا خدا صاحبدلے پیدا کند کو ز حرفے دفترے املا کند

از نفِ او مِلّتے مثلِ سپند بر جہد شورِ افگن، ہنگامہ بند

۴۔ فرد و ملت کا مزید فرق یوں واضح کرتے ہیں کہ فرد کی عمر عموماً ساٹھ ستر سال کی ہوتی ہے اور قوم کی زندگی میں سو سال بھی زیادہ سے زیادہ ایک سانس کی حیثیت رکھتے ہیں :

۵۔ پھر فرد کی زندگی اس امر پر موقوف ہے کہ جان اور جسم کے درمیان ربط و تعلق اور میل جول قائم رہے۔ اس تعلق میں خلل پیدا ہوتے ہی فرد کی زندگی ختم ہو جائے گی، لیکن قوم کی زندگی جان و تن کے ربط پر نہیں بلکہ قدیم روایات کی حفاظت پر موقوف ہوتی ہے۔ وہ جب تک ان مقاصد کو محفوظ رکھے گی، جن کے لیے وجود پذیر ہوئی تھی، اس کی زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، البتہ ان مقاصد سے انحراف کے بعد وہ ختم ہو جائے گی، اگرچہ اس کے افراد کتنی ہی بڑی تعداد میں زندہ ہوں :

۶۔ فرد زندگی کی ندی خشک ہوتے ہی مرجاتا ہے، لیکن قوم جب تک اپنی زندگی کے مقاصد نہ چھوڑے موت کے گھاٹ نہیں اترتی :

۷، ۸۔ اگرچہ افراد کی طرح قومیں بھی مر جاتی ہیں، ان کے لیے بھی قدرت کی طرف سے ایک خاص وقت مقرر ہے، لیکن امتِ اسلامیہ ہرگز نہیں مرے گی۔ یہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس کا وجود اُس وقت سے چلا آتا ہے جب ابتدائے آفرینش میں کائنات کی روحوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد باندھا تھا۔ اشارہ اس عہد کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا "الست بربکم ؟ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں سب نے یک آواز ہو کر کہا: بلیٰ، بیشک تو ہی ہمارا پروردگار ہے" ؛

ملتِ اسلامیہ ۱۔ ملتِ اسلامیہ موت سے بالکل بے پرواہ ہے۔ اسے موت آ ہی نہیں سکتی کیونکہ خدا نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کی بشارت کے ذریعے سے ہماری پائداری اور استواری کا وعدہ کر رکھا ہے۔ خدا کا فرمان ہے کہ ہمیں نے ذکر اتارا اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔ اُس ذکر کی حفاظت ہمارے سپرد ہوئی۔ جب تک ذکر باقی ہے، اُس کی نگہبانی اس دنیا میں ہمیں کرتے رہیں گے۔ یہ ہماری پختگی، پائداری اور استواری کی دلیل ہے۔ سوال یہ نہیں کہ اُس قوم کا تعلق کس خطے سے ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہی قوم ہوگی، جو اُس ذکر پر ایمان لا چکے گی اور اس کی حفاظت کے واجبات پورے کرے گی۔ ظاہر ہے کہ وہی ملتِ اسلامیہ ہوگی اور اس کے دوام کا وعدہ ہے :

۲۔ "ذکر" اُسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے، جب تک ذاکر یعنی ذکر کرنے والا موجود ہو۔ جب ذکر کے دوام کا وعدہ ہو چکا تو یہ مان لینے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی کہ ذاکر کے دوام کا بھی وعدہ ہو چکا :

۳۔ جب قرآن مجید میں واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ دینِ حق کی روشنی پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں، اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہماری ملت کا چراغ بجھنے سے بالکل محفوظ ہو گیا، یعنی وہ ہمیشہ روشن رہے گا، کبھی نہ بجھے گا :

۴۔ ہم وہ امت ہیں جس نے حق پرستی میں درجۂ کمال حاصل کر لیا اور جو ہر نبی کو محبوب و عزیز تھی۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے اس جوہر دار تلوار کو حضرت ابراہیمؑ کی آرزوؤں اور دعاؤں کے نیام سے نکالا۔

مراد یہ ہے کہ یہ وہی اُمّت ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے دعا کی تھی کہ ہماری اولاد میں ایسی امت پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو (وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ)۔

۶۔ یہی امت ہے جس کے دم سے حق و صداقت زندہ ہوتے ہیں اور اس سے جو بجلیاں پے در پے کوندرہی ہیں، وہ غیر حق یعنی باطل کو جلا کر خاک کر دیتی ہیں۔

اقبال کی شاعری کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی یعنی جب ملّت کے اصل اوصاف بیان کرتے ہیں تو انھیں دعوت کا رنگ دے دیتے ہیں۔ کہنا تو یہ مقصود تھا کہ ملّتِ اسلامیہ کے یہ اوصاف و خصائص تھے، تاہم مخاطب مسلمانوں کو یہ بھی بتا دیا کہ اگر اپنے آپ کو اس ملّت سے منسوب کرتے ہو تو لازم ہے کہ اپنے اندر اصل اوصاف پیدا کرو۔ تمھارے دم سے حق و صداقت زندہ ہونے چاہئیں تمھاری بجلیوں سے باطل کو فنا ہو جانا چاہیے۔ تم اللہ کی یعنی قرآن مجید کے داعی ہو۔ اس دعوت کا اپنے آپ کو اہل بناؤ تاکہ خدا کے وعدۂ حفاظت کے حقدار ہو۔ اقبال کی یہ خصوصیت یوں تو جا بجا نمایاں ہے مگر اس کا بہترین اظہار "شکوہ" میں ہوا ہے کہ اس کا ہر بند صرف سرگذشت نہیں بلکہ نہایت پُرتاثیر دعوت بھی ہے۔

ملّتِ اسلامیہ کا دوام | ۱۔ ہم ملّتِ اسلامیہ، خدا کی توحید کے لیے دلیل و حجّت ہیں۔ ہمیں خدا نے کتاب اور حکمت کے بھیدوں کا محافظ بنا دیا ہے۔

۲۔ آسمان کو ہم سے ہمیشہ دشمنی رہی، اس وجہ سے ہم پر بعض اوقات خوفناک مصیبتیں بھی نازل ہوئیں، جنھوں نے عارضی طور پر ہمارے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ انھیں میں سے ایک مصیبت تاتاریوں کی بھی تھی۔ آسمان ایک خاص وقت تک اس مصیبت کو اپنی آغوش میں پالتا اور پرورش کرتا رہا۔

۳۔ پھر یکایک اس فتنے اور اس خوفناک مصیبت کے پاؤں کے بند کھول دیے اور اسے ہم پر نازل کر دیا، گویا اسے یہ دیکھنا منظور تھا کہ ہم اسے برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں۔

۴، ۵۔ یہ فتنہ ایسا ہولناک تھا کہ خود محشر بھی اس کی راہ میں روندا ہوا اور اس کی تیغ نگاہ سے ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ سیکڑوں طوفان اس کی گود میں سوئے ہوئے تھے۔ اس کی گذشتہ کل کی یہ کیفیت تھی کہ اس سے امروز کی صبح پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

مراد یہ کہ جہاں وہ فتنہ پہنچا، ہر چیز کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کر دیا۔ نہ زندگی رہی نہ امید، نہ گذشتہ کل کے بعد امروز کے پیدا ہونے کا کوئی امکان رہا۔

۶۔ اس فتنے نے ملّتِ اسلامیہ کی قوت کو خاک و خون میں تڑپا دیا۔ بغداد کو، جو ملّت کا مرکز تھا، وہ کچھ دیکھنا پڑا، جو روم نے بھی نہیں دیکھا۔ دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ روم پر وحشی قبیلوں نے پے در پے خوفناک حملے کیے،

لوٹ مار اور تباہی میں یورپ نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن چنگیز کے پوتے ہلاکو نے ایک ہی حملے میں بغداد کے اندر وہ تباہی پھیلائی، وہ خونریزی کی کہ زمانے نے خواب و خیال میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔

۷ تا ۸ - فرماتے ہیں کہ یہ تو سب کچھ ہو چکا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے دوام کا وعدہ کر رکھا تھا، دیکھو، وہ وعدہ کیونکر پورا ہوگا۔ اے مخاطب! یہ آسمان جس کی چال ہمیشہ ٹیڑھی رہی، جس کی عقل بہت پرانی اور پختہ ہے، ساتھ ہی دم نئے نئے حیلے اور نئے نئے ہتھکنڈے تجویز کرتا رہتا ہے، یہی ہمارا دشمن تھا جس نے تاتاری فتنہ ہم پر چھوڑا، مگر اس سے پوچھو تاتاریوں کی جلائی ہوئی آگ کس کا گلزار بنی اور اس کے شعلے پھول بن کر کس کی زینتِ دستار ہوئے؟

۹، ۱۰ - ہماری فطرت میں حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت موجود ہے۔ خدا سے ہماری نسبت بھی وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی تھی کیونکہ بحکم مِلّتَ اَبِیکُم اِبرَاہِیمَ حنیفاً ہم الخلیل کی ملت ہیں، لہٰذا جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لیے آگ گلزار بن گئی تھی، اسی طرح ہم ہر آگ کے نیچے سے پھول پیدا کر لیتے ہیں اور ہر نمرود کی آگ کو گلزار بنا لیتے ہیں:

۱۱ - بلاشبہہ زمانے کے پاس انقلاب کے شعلے موجود ہیں، لیکن یہ شعلے ہمارے باغ میں پہنچتے ہیں تو بہار بن جاتے ہیں۔

اس پورے واقعے سے مقصود یہ ہے کہ ہم بہ حیثیت ملت مر نہیں سکتے، ہم پر مصیبتیں آسکتی ہیں، مگر وہ ہمیں ختم نہیں کر سکتیں۔ اس کے برعکس ہم ان مصیبتوں کو اپنے لیے فروغ و ترقی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ وہی تاتاری اور ترک جنھوں نے ہماری سات سو سال کی سطوت و عظمت خاک میں ملائی، خود اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور کچھ صدیوں سے اسلام کی حفاظت کے لیے سربکف اور سینہ سپر کھڑے ہیں۔ یہ مضمون اقبال کے "جواب شکوہ" میں بھی آیا ہے:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے — نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

۱۲ تا ۱۵ - ایک زمانہ تھا جب رومیوں کا بازارِ حکومت گرم تھا۔ انھوں نے بہت بڑی سلطنت پیدا کر لی تھی، اور اس میں نظم و نسق کا نہایت اچھا جاری کر دیا تھا، مگر اب وہ رومی باقی نہیں رہے۔ ان کا کوئی نشان کہیں نظر نہیں آتا، صرف تاریخ کے صفحات پر ان کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ ساسانیوں کا شیشہ شراب کی جگہ خون سے بھر گیا، یعنی وہ بھی ختم ہو گئے۔ یونان کے شراب خانے کی رونق بھی جاتی رہی۔ مصر بھی امتحان میں ناکام رہا اور اس کی ہڈیاں قدیم مقبروں میں پڑی رہ گئیں، یعنی یہ بڑی بڑی قومیں دنیا میں بروئے کار آئیں۔ چونکہ انسانیت کا کوئی بڑا مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔ حق و صداقت کی حفاظت سے انھیں کبھی سروکار نہ ہوا، لہٰذا وہ مٹ گئیں

اور صرف ان کے افسانے باقی رہ گئے۔ ان کے برعکس ملّتِ اسلامیہ پہلے بھی تھی اور اب بھی موجود ہے۔ اذان کی صدائے حق دنیا کی فضا میں پہلے بھی بلند ہو رہی تھی، اب بھی بلند ہے۔

۱۶ ا ۱۷ ا - ہمارے دوام کا سبب کیا ہے۔ دیکھو! اس دنیا کی زندگی کا دستور عشق ہے اور عشق ہی کی بدولت اس کے مختلف اجزاء و عناصر میں میل جول اور ربط ضبط قائم ہے۔ عشق ہمارے دل ہی کی حرارت کے باعث زندہ ہے۔ کلمۂ توحید کی چنگاری سے اس میں چمک دمک ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک ہم ہیں، یہ دنیا قائم ہے۔ جب ہم نہ ہوں گے، یہ بھی ختم ہو جائے گی کیونکہ اس کے ذرّوں میں وہ کشش اور جاذبیت باقی نہ رہے گی، جو ان کے درمیان ربط ضبط کی موجب اور زندگی کی بقا کی ضامن ہے۔

۱۸ - اگرچہ ہم کلی کی طرح ملول و دلگیر ہیں، تاہم اگر ہم مرجائیں تو پورا گلستاں مرجائے گا۔

مطلب یہ کہ آج ہماری حالت اچھی نہیں۔ مصیبتوں کا ہم پر ہجوم ہے، جن کے بوجھ سے ہم دبے ہوئے ہیں لہٰذا ہمارے لیے خوشی اور شادمانی کی کوئی وجہ نہیں۔ غم و ملال نے ہمارے دل پر قبضہ کر رکھا ہے۔ بایں ہمہ آج بھی وہ مقصد صرف ہماری وجہ سے پورا ہو سکتا ہے، جو عالمِ انسانیت کے لیے باعثِ نجات ہے۔ اگر ہم ختم ہو جائیں تو کائنات ختم ہو جائے گی۔

سولھواں باب

نظامِ ملّت ——— قرآن

ملّت کا نظام شریعت اور دستور کے بغیر ترتیب نہیں پا سکتا اور ملّتِ اسلامیہ کا دستور قرآن مجید ہے۔

تمہید | اس باب میں سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ ہر وجود کے لیے ایک آئین ہے۔ مسلمان کا آئین قرآن مجید ہے، جس میں نہ شک کی گنجائش ہے، نہ تبدیلی ہو سکتی ہے۔ یہ خدا کا آخری پیغام ہے۔ جن لوگوں کا پیشہ رہزنی تھا، وہ قرآن مجید کی بدولت رہبر بن گئے۔ اس ایک کتاب نے انھیں سینکڑوں علوم کا جلوہ زار بنا دیا۔ پھر اس نادر انقلاب کا ذکر کرتے ہیں، جو قرآن مجید کی بدولت عربوں کو نصیب ہوا۔ آخر میں دورِ حاضر کے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ قرآن کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن ہے۔ افسوس کہ ہمارے صوفی اور واعظ قرآن کو چھوڑ بیٹھے اور انھوں نے صوفیوں کے دیوانوں یا روایات کی عامیانہ کتابوں کو مدار بنا لیا، حالانکہ مسلمانوں کو ضرورت کی ہر چیز قرآن مجید سے مل سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اسے پڑھیں بلکہ

آئین کی ضرورت | ریب - شک - یہاں اشارہ ہے - لَا رَیْبَ فِیْہِ کی طرف یعنی قرآن مجید وہ کتاب ہے، جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

تبدیل - بدلنا - اشارہ ہے سورۂ انعام کی اس آیت کی طرف:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ج

اور یہ واقعہ ہے کہ تم سے پہلے بھی خدا کے رسول جھٹلائے گئے، سو انھوں نے لوگوں کے جھٹلانے اور دکھ دینے پر صبر کیا یہاں تک کہ ہماری مدد آ پہنچی اور (یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے) کوئی نہیں اس کی ٹھہرائی ہوئی باتوں کو بدل دینے والا ہو

خود اقبال نے مثنوی کے حاشیے میں آیت کے جس ٹکڑے کا حوالہ دیا ہے وہ جو سورہ یونس میں ہے یعنی لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ (اور نہیں بدلتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں)

تاویل - پھیرنا - نتیجہ - مآل - چونکہ الفاظ کے معانی بھی ان کی دلالت کا مآل و مصداق ہوتے ہیں اس لیے معانی پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔ لیکن آج کل قرآنی مطالب کو الٹ پھیر کر اپنے حسب منشا بنانے کو بھی تاویل سمجھا جاتا ہے۔

آنکہ دوش کوہ ... الخ - اس میں سورۂ احزاب کی آیت کی طرف اشارہ ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

ہم نے دکھائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو، پھر کسی نے قبول نہ کیا اس کو کہ اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے یہ ہے بڑا بے ترس، نادان۔

سورۂ حشر کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھ لینی چاہیے:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط

اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا، پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔

آمال - امل کی جمع - امیدیں - آرزوئیں۔

جگرتاب - وہ چیز جس سے جگر گرم ہو جائے۔ محاورے میں پھرنے والا۔

جمازہ - تیز رفتار سانڈنی۔

نخیل - کھجور کا درخت۔

رحیل ۔ کوچ

زُبُر ۔ اشارہ ہے سورہ مومنون کی آیت کی طرف:

فَتَقَطَّعُوٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۚ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ	لیکن لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر الگ الگ ہو گئے اور اپنا دین الگ الگ کر لیا۔ اب جو جس کے پلے پڑ گیا ہے، اسی میں مگن ہے۔

الی شیء نُکُر ۔ اشارہ ہے سورہ قمر کی آیت کی طرف:

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ	سو تو ہٹ آ ان کی طرف سے، جس دن پکارے پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف

ضعیف ۔ حدیث کی ایک قسم جس کے اسناد میں راوی معتد بہ نہ ہوں۔

شاذ ۔ حدیث کی ایک قسم۔ ایک راوی ثقہ کے خلاف دوسرے راوی ثقہ کی روایت۔ ان میں سے جس روایت کو مختلف وجوہ سے ترجیح دی جائے اسے محفوظ کہتے ہیں اور جو روایت مرجوح ہو وہ شاذ کہلاتی ہے۔

مرسل ۔ حدیث کی ایک قسم جس کا راوی تابعی ہو اور صحابی تک سلسلہ نہ پہنچے۔

۱۔ جب کسی ملت کے ہاتھ سے آئین و دستور جاتا رہتا ہے تو مٹی کی طرح اس ملت کے اجزا ایک دوسرے سے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

۲۔ مسلمان کی ہستی بھی دستور و آئین پر موقوف ہے۔ رسول اللہ صلعم کے دین کی حقیقت و معنویت یہی ہے۔

۳۔ اچھا ذرا کائنات پر نظر ڈالیے۔ ایک چھوٹی سی پتی یا پنکھڑی ایک آئین و دستور کی پابند ہوئی تو پھول بن گئی، پھولوں نے اپنے آپ کو آئین کا پابند بنا لیا تو گلدستہ ہو گئے۔

۴۔ ایک اور مثال سامنے لائیے اور غور کیجیے کہ نغمے کی حقیقت کیا ہوتی ہے۔ جب انسان آواز کو ایک خاص طریقے پر ضبط میں لے آتا ہے اور ایک خاص پابندی کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو نغمہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ضبط اور یہ پابندی رخصت ہو جائے تو نغمہ جاتا رہے گا اور اس کی جگہ بے معنی شور و غل رہ جائے گا۔

۵۔ ہمارے گلے میں جو سانس آتا جاتا ہے، وہ ہوا کی ایک لہر کے سوا کیا ہے؟ یہی ہوا بانسری میں خاص طریق پر پابند ہو جاتی ہے تو نوا بن جاتی ہے۔

غرض یہ تینوں مثالیں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ کائنات کا کاروبار صرف آئین و دستور کی پابندی سے چل رہا ہے۔ یہاں کی ہر چیز اسی وقت تک قائم ہے جب تک مقررہ آئین کے مطابق کام

کر رہی ہے :

۷،۶ - اب مسلمان سے پوچھتے ہیں، کیا مجھے معلوم ہے کہ تیرا آئین کیا ہے اور اس آسمان کے نیچے تیرا قیام اور ٹھہراؤ کس پر موقوف ہے؟ ہاں، تیرا دستور وہ زندہ کتاب ہے، جو قرآن حکیم کے نام سے معروف ہے۔ اس کی حکمتیں باعتبارِ آفرینش بے مسلم، ازلی اور ابدی ہیں اور ان پر کبھی زوال نہ آئے گا۔

قرآن مجید | ۱- قرآن مجید کیا ہے؟ ایک ایسی کتاب ہے، جو زندگی کے وجود پذیر ہونے کے راز بتاتی ہے۔ جس شے میں قیام اور جماؤ کی کوئی خصلت نہ ہو، وہ اس کتاب کی قوت سے قائم و ثابت ہو جاتی ہے۔

۲- قرآن مجید وہ کتاب ہے، جس میں نہ شک کی گنجائش ہے، نہ کوئی ردوبدل ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا دعویٰ ہے، اللہ کے کاموں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی اس کی آیتیں واضح اور روشن ہیں اور ان کے مطلب کے لیے ہیر پھیر اور داؤ پیچ کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔

۳- اس کے زور و قوت کا یہ عالم ہے کہ کسی کے دل میں خام آرزو ہو تو اس کی بدولت پختہ اور پائیدار ہو جاتی ہے اور اس کے بل پر جام پتھر سے بھڑ جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

۴- قرآنِ مجید کی پابندی غلاموں کو آزادی کی نعمت بخشتی ہے۔ جو لوگ دوسروں کا شکار کرنے کی فکر میں ہوں انھیں قرآن مجید آہ و فریاد پر مجبور کر دیتا ہے۔ دوسروں کا شکار وہی کرنا چاہتے ہیں، جو ظالم اور حق ناشناس ہوں۔ قرآن مجید کے اصول ایسے لوگوں کے لیے کہیں ٹھہرنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا ان کے لیے آہ و فریاد کے سوا کیا باقی رہ سکتا ہے؟

۵- قرآنِ مجید انسانوں کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے۔ یہ کتاب اُس ذاتِ پاک کے ذریعے سے ہم تک پہنچی، جو جہانوں کے لیے ابرِ رحمت تھی۔

۶- ناکس اور بے حقیقت لوگ قرآن مجید کی برکت سے صاحب قدر و منزلت بن جاتے ہیں۔ یہ کتاب پاک انسان کو سجدے کے ذریعے سے سربلندی عطا کرتی ہے۔

قرآن مجید نے جس توحید کی دعوت دی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا کا فرمانبردار بندہ بن جائے۔ صرف اس کے آگے جھکے۔ صرف اسے سجدہ کرے۔ یہ بندگی، یہ فرمانبرداری اور یہ سجدہ ریزی اسے خدا کے سوا ہر وجود کی غلامی اور محکومی سے آزاد کر دیتی ہے۔ اس سے بڑی سربلندی انسان کے لیے کوئی نہیں ہو سکتی۔

۷- یہی کتاب پاک ہے جس نے ڈاکوؤں اور لٹیروں کو انسانیت کے رہنما بنا دیا۔ اسی کتاب مقدس کی بدولت بھولوں نے علوم کے دفتر تیار کر دیے۔

۸- اس ایک چراغ کی روشنی نے صحرا نوردوں کے دماغ میں علوم کی سیکڑوں تجلیاں پیدا کر دیں۔

۹، ۱۰، ۱۱۔ یہی کتاب ہے، جس کا بوجھ پہاڑ نہ سنبھال سکے۔ جن کے دبدبے اور ہیبت سے آسمان کا پتا پھٹ گیا، لیکن خدا کی رحمت ملاحظہ ہو کہ ہماری خواہشوں اور آرزوؤں کا یہ سرمایہ ہمارے بچوں کے سینوں میں سمایا ہوا ہے۔

وہ آیت اوپر لکھی جا چکی ہے، جس کی طرف شعر ۱۰ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ گراں قدر ذمہ داری کا بار پہاڑ، زمین اور آسمان نہ اُٹھا سکے، وہ مسلمان بچوں کے سینوں نے قبول کر لیا۔ اس میں اشارہ مسلمان بچوں کے حفظِ قرآن کی طرف ہے۔ یعنی اتنا بڑا بار مسلمان بچے اپنے سینوں میں اٹھائے پھرتے ہیں۔

عرب اور قرآن ۱ تا ۴۔ وہ بے آب بیابان میں پھرنے والا عرب، جس کی آنکھیں سورج کی حرارت سے سرخ تھیں، اُس کی سانڈنی کا چلنا ہرن کے چلنے سے بھی زیادہ پسندیدہ تھا بلکہ اس کی سانڈنی کا سانس آگ کی طرح گرم تھا۔ وہ کھجوروں کے نیچے بستر بچھا کر سو رہنے کا عادی تھا۔ علی الصباح کوچ کی صدا بلند ہوتی تو جاگ اٹھتا۔ رات دن صحرا میں پھرتا رہتا تھا۔ نہ کبھی گھر بنایا، نہ دروازے کی شکل دیکھی۔ برابر اِدھر اُدھر چکر لگاتا رہتا۔ کبھی کسی جگہ جم کر نہ بیٹھتا۔

۵۔ جب قرآن مجید کی حرارت سے عرب کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی تو اس کی بے قرار موج میں اسی طرح آسودگی پیدا ہو گئی، جس طرح موتی میں آب و تاب کی موج آسودہ ہوتی ہے۔

۶۔ اس نے قرآنِ مجید کی واضح اور روشن آیتوں کا سبق لیا۔ وہ خدا کے سامنے غلام آیا تھا، آقا بن کر رخصت ہوا۔

۷۔ اس کے ساز سے جہانبانی کے نغمے اٹھنے لگے۔ جمشید کا تخت اس کے لیے پائدان بن گیا۔

۸۔ وہ جس طرف سے نکلا، اس کے پاؤں کی گرد سے شہر پیدا ہوتے گئے۔ اس کے ایک پھول سے سینکڑوں باغوں کا ظہور ہوا۔

مسلمانوں سے خطاب ۱، ۲، ۳۔ پھر اپنے عہد کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہیں کہ اے مسلمانو! تمھارا ایمان تو رسموں میں جکڑا ہوا ہے اور تم خود کافرانہ طور طریقوں کے قید خانے میں بند ہو۔ یعنی تمھارا ایمان رسمی ہے اور تمھارے طور طریقے غیر اسلامی۔ تم تو خود ایک دوسرے سے کٹ کر الگ الگ ہو گئے اور ایک نہایت ناگوار شے کی طرف چلے جا رہے ہو۔ اگر تم مسلمان کی حیثیت میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو یاد رکھو ایسی زندگی قرآن کے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی۔

۴، ۵، ۶۔ تمھارے صوفیہ اور مشائخ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے پشمینہ پہن رکھا ہے۔ اپنے حال میں مست ہیں۔ قوالوں کے نغموں کی شراب پی کر سر دھن رہے ہیں۔ عراقی کے شعر سن کر اُن کے دل میں حرارت اور تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اُن کی مجلسوں کو قرآنِ مجید سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ لوگ بوریے کے فرش اور درویشی کی کلاہ کو تخت و تاج

سمجھ رہے ہیں اور ان کی درویشی خانقاہوں سے خراج وصول کرتی ہے:

۷، ۸ - واعظوں کی حالت پر نظر ڈالیے۔ وہ منبروں پر چڑھ کر گاتے اور افسانے سناتے ہیں۔ وہ الفاظ تو بڑے بڑے استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا مطلب کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے وعظوں میں بار بار خطیب اور دیلمی جیسے محدثوں کا ذکر سننے میں آئے گا اور وہ حدیث کی مختلف قسموں کا ذکر کریں گے کہ فلاں ضعیف ہے، فلاں شاذ ہے، فلاں کا سلسلہ صحابی سے نہیں ملتا۔

صوفی اور واعظ ہمارے دین کی باطنی اور ظاہری معنویت کے نگہبان تھے، لیکن اقبال نے ان کی جو تصویر کھینچ دی، اس میں شاید ہی کسی کے لیے کلام کی گنجائش ہو۔ صوفیوں نے عراقی یا حافظ وغیرہ کے کلام کو اپنے ذوق کا سرچشمہ بنا لیا۔ واعظوں نے یا تو قصہ گوئی شروع کر لی یا معمولی حدیثوں کی بحث چھیڑ لی، لیکن قرآن مجید سے کسی نے سروکار نہ رکھا، حالانکہ دین کا اصل سرچشمہ وہی تھا۔

ان شعروں سے یہ مطلب سمجھنا بھی سراسر غلط ہوگا کہ اقبال نے احادیث و آثار کے ذریعے سے قرآن مجید کی تفسیر سے اختلاف کیا ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہے کہ ہر شخص اقبال کا کلام لے کر اسے اپنے اختیار کیے ہوئے مسلک کی تائید میں استعمال کرتا ہے، اگرچہ کتنی ہی کھینچ تان کرنی پڑے۔ جس شخص کا عقیدہ یہ تھا کہ ابتدائی دور کے مسلمان زیادہ پرہیزگار اور زیادہ محتاط تھے، اس سے ویسا عقیدہ منسوب کرنا کیونکر مناسب ہے، جیسا کہ بعض اصحاب نے انتہائی جسارت سے کام لیتے ہوئے منسوب کیا۔ قرآن کے سمجھنے میں عربی زبان، محاورے، نزولِ قرآن کے ماحول، خود رسول اللہ صلعم کے ارشادات سے مدد لینا حد درجہ ضروری ہے، البتہ یہ درست ہے کہ نہ صرف تفسیر بلکہ تمام معاملات میں وہی ارشادات معتبر سمجھے جائیں گے جو مستند ہوں گے۔ اسی طرح صحابہؓ یا تابعین نے جس طرح قرآن کو سمجھا، اسے ایک ایسی روشنی ماننا چاہیے جو مزید فہم و نظر کے لیے مشعل کا کام دے سکتی ہے:

۹ - اقبال کس درد سے کہتے ہیں کہ اے مسلمان! قرآن مجید کا تجھ پر حق ہے کہ تو اس کی تلاوت کرے اور تو جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے، اُسی سے حاصل کر، یعنی اس زندگی میں تیری ہر ضرورت قرآن مجید سے پوری ہو سکتی ہے:

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآنِ مجید کے علاوہ جن دینی ماخذوں پر اُمّت کا اتفاق ہے، انھیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ہمارے عہد کے علمدارانِ دین نے قرآنِ مجید کی جگہ دوسری چیزوں کو دے دی۔ یہاں صرف قرآن مجید کی اہمیت اور مرکزیت پر زور دیا گیا ہے:

سترھواں باب

اجتہاد و تقلید

اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب زوال وانحطاط کا دور آ جائے تو اجتہاد کے بجائے تقلید پر کاربند رہنا بہتر ہوتا ہے۔

تمہید فرماتے ہیں کہ دورِ حاضر بڑا فتنہ انگیز ہے۔ یہ ہمارے دل سے عشقِ حق کی حرارت نکال کرے گا۔ جب کوئی قوم کمزور ہو جائے تو اس کے لیے بہتر یہی ہوتا ہے کہ تقلید پر کاربند رہے تاکہ اس کی وحدت کو نقصان نہ پہنچے۔ اس سلسلے میں یہودیوں کی مثال سامنے رکھنی چاہیے۔ ان پر بڑی آفتیں آئیں، لیکن وہ زندہ رہے کیونکہ اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلتے رہے۔ اے مسلمان! تیرے لیے بھی اچھا یہی ہے کہ اس دورِ حیات میں تقلید پر کاربند رہے۔ بزرگوں کا تقویٰ اور ان کی کاوش باقی نہیں رہی۔ ہر فرومایہ دین کا رازدار بن گیا ہے۔ اگر تقلید کی پابندی نہ کی تو مسلمانوں کی وحدت باقی نہ رہے گی۔

عہدِ حاضر نا پروا۔ بیباک۔

اقتدا ۔ پیروی۔

ورع ۔ پرہیزگاری۔

نباض ۔ بہت بڑا نبض شناس۔

اعتصام ۔ پکڑنا۔ چنگل مارنا۔

حبل اللہ ۔ اللہ کی رسّی، جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا — اور سب لوگ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو۔

۱۔ موجودہ زمانے کے سر کے نیچے بہت سے فتنے ہیں۔ اس کی طبیعت بیباک اور نڈر ہے اور ہر وقت آفتیں بپا کرتی رہتی ہے۔ موجودہ زمانے سے مراد وہ زمانہ اور وہ دور ہے جو مغربی قوموں نے دنیا میں پیدا کیا اور جس میں انھیں کے تمدن، انھیں کی تہذیب، انھیں کے علوم اور انھیں کے اخلاق و سیاست نے فروغ پایا۔

۲۔ اس نے پرانی قوموں کی . . . مجلس درہم برہم کر ڈالی اور زندگی کی شاخ کو نمی سے محروم کر دیا۔

۳۔ اس زمانے کے جلوے نے ہمیں ہماری حقیقت سے بیگانہ کر دیا اور ہمارے ساز میں نوا پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہ چھوڑی۔

۴۔ ہمارے دل میں بہت مدت سے عشقِ حق کی آگ سلگ رہی تھی، وہ اس زمانے کی نذر ہو گئی۔ ہمارے سینے کلمۂ توحید کی حرارت اور اس کی برکتوں کے نور سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ حرارت اور وہ نور باقی نہیں رہے۔

تقلید: ۱۔ جب زندگی کا ڈھانچا سست اور کمزور ہو جاتا ہے تو ملت تقلید کے ذریعے سے جماؤ اور ٹھہراؤ حاصل کرتی ہے۔

۲۔ تو باپ دادا کے راستے پر چل۔ جمعیت اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔ تُو نے تقلید کا مطلب سمجھا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملت ایک رشتے میں منسلک رہے اور اس کے ضبط و نظم میں فرق نہ آئے۔

۳۔ جب خزاں کا موسم آ جائے تو اس شاخ کو، جو پتوں اور پھلوں سے خالی ہو چکی ہو، درخت سے ٹوٹ کر الگ نہ ہونا چاہیے اور بہار کی امید رکھنا چاہیے کیونکہ جب بہار آئے گی، درخت کے رگ و ریشہ میں تازگی پیدا ہو گی۔ سوکھی ہوئی شاخ بھی نئے سرے سے ہری ہو جائے گی۔

یہ تشبیہ تمام ہے، یعنی زوال و انحطاط کے دور کو خزاں سے تعبیر کیا۔ شاخ کو تلقین کی کہ شجر سے کٹ کر الگ نہ ہو، یعنی جو مسلک پہلے سے چلا آ رہا تھا، اس پر پختگی سے قائم رہنا چاہیے۔ اسی کو تقلید قرار دیا۔ امیدِ بہار یہ کہ زوال کے بعد پھر ترقی اور عروج کا دور آ جائے۔ بہار کی برکتوں سے وہی شاخ فائدہ اٹھائے گی جو درخت سے پیوستہ ہو گی۔ اسی طرح آنے والے دورِ اقبال سے وہی افراد فائدہ اٹھائیں گے، جو ملت سے پیوستہ ہوں گے۔

۴۔ اے مخاطب! تو سمندر ہاتھ سے دے چکا ہے، اب اپنے نقصان کا خوب خیال رکھ۔ تیرے پاس جو تھوڑے سے پانی کی ندی باقی رہ گئی ہے، اس کی حفاظت پوری طرح کر۔

مراد یہ کہ وہ دور تو باقی نہ رہا، جس میں ملت کی حیثیت ایک متلاطم اور بے کراں سمندر کی تھی۔ اب تو سمندر کی جگہ ایک چھوٹی سی ندی رہ گئی ہے، جس میں پانی بھی زیادہ نہیں۔ اسے محفوظ رکھنے کی صورت یہی ہے کہ اپنے نفع نقصان پر پوری نظر رکھے۔

۵۔ یہی ایک صورت ہے، جس سے دم لیتا رہے تو شاید وقت آ جائے کہ پہاڑی سیل تیری ندی کا رخ کرے، پھر اس کی آغوش میں طوفان پرورش پانے لگیں۔

پہاڑی سیل سے اشارہ اسی حالت کی طرف ہے، جس کی طرف پہلے بہار کی شکل میں اشارہ کیا گیا یعنی زوال کے بعد عروج۔

واضح رہے کہ اس شعر میں "قہستان" کاتب نے غلط لکھا ہے، یہاں "کہستان" ہونا چاہیے، جو

"کوہستان" کا مخفف ہے۔ "قہستان" خراسان کا ایک علاقہ ہے، اسے یہاں سے کوئی مناسبت نہیں۔

یہودیوں کی مثال ۱۔ اگر تیرے جسم میں بصیرت رکھنے والی جان ہو تو یہودیوں کی سرگزشت سے عبرت حاصل کر۔

۲۔ دیکھ، انھوں نے زمانے کا کیا کیا سرد و گرم دیکھا۔ کشمکش میں اُن کی جان گھلتی گئی، مگر اب تک زندہ ہیں اور مرے نہیں۔

۳۔ اُن کی رگوں میں خون کی روانی بہت ہی سست ہو گئی۔ ایک اُن کی پیشانی ہے اور سیکڑوں آستانے ہیں، جن پر جبہ سائی جاری ہے۔

۴۔ آسمان کے پنجے نے انھیں انگور کی طرح نچوڑ ڈالا، مگر یہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارونؑ کی یادگار اب تک موجود ہے۔

۵۔ اُن کے آگ بھرے نغموں سے سوزش اور حرارت ختم ہو گئی، تاہم ان کے سینے میں سانس اب تک باقی ہے۔

۶۔ کیا کبھی سوچا کہ اُن کی بقا کا سبب کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ جب اُن کی جمعیت درہم برہم ہو گئی اور دنیا کے طول و عرض میں انھیں بکھر جانا پڑا تو انھوں نے اپنے باپ دادا کے راستے کے سوا کسی راستے پر محمل نہ باندھا یعنی کوئی دوسرا راستہ اور مسلک اختیار نہ کیا، اسی وجہ سے اب تک باقی چلے آتے ہیں۔

اقبالؒ ایک مکتوب میں خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم کو لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی آج وہی حالت ہے جو اسلامی فتوحات ہند کے وقت ہندوؤں کی تھی۔

ہندو قوم کو اس زمانے میں منو کی شریعت کی کورانہ تقلید نے موت سے بچا لیا۔ اپنی شریعت کی حفاظت ہی کی وجہ سے یہودی قوم اس وقت تک زندہ ہے، اور اگر فیلو (پہلا یہودی متصوف) قوم کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تو آج یہ قوم دیگر اقوام میں منجذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔

(مکاتیب اقبال ص ۲-۳)

مسلمانوں سے خطاب ۱۔ اے مسلمان! تیری پرانی مجلس بھی بکھر گئی اور تیرے سینے میں زندگی کا جو چراغ جل رہا تھا، وہ بھی بجھ گیا۔

۲۔ تُو اپنے دل پر توحید کی حقیقت کا نقش ثبت کر اور جو مصیبت آپڑی ہے، اس کا علاج تقلید کے ذریعے سے کر۔

۳۔ زوال و انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے تو قوم کے نظم و اتحاد کی بساط لپیٹی جاتی ہے، یعنی نظم و اتحاد باقی نہیں رہتا۔

۴۔ کوتاہ نظر عالموں کے اجتہاد پر چلنے کے بجائے بزرگوں کے راستے کی پیروی زیادہ قرین صواب ہے۔

۵، ۶۔ یاد رکھو کہ تیرے بزرگوں کی عقل ذاتی اغراض سے متاثر نہیں تھی اور یاد رکھ کہ پاک آدمیوں کے کام کاج اغراض سے آلودہ نہیں ہوتے۔ اُن کی فکر بڑی باریک بینیاں کرتی رہی اور ان کی پرہیزگاری میں رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک کا رنگ غالب تھا۔

اقبال کا مدعا یہ ہے کہ جو بزرگ رسول اللہ صلعم کے بعد قریبی دور میں ہوئے، اُن کی سوچ بچار اغراض سے آلودہ نہ تھی وہ جو نکتے پیدا کرتے تھے، اخلاص سے پیدا کرتے تھے اور مقصد یہ تھا کہ دین کے حقیقی جوہر بروے کار آجائیں، وہ بڑے باریک بین تھے اور زہد و تقویٰ میں ان کا درجہ بہت بلند تھا کیونکہ وہ رسول اللہ صلعم کے عہد سے قریب تر تھے۔ بعد کے دور میں یہ حالت قائم نہ رہ سکی سوچی عالم غرضوں میں اُلجھ گئے۔ ان میں اخلاص باقی نہ رہا اور زہد و تقویٰ کی حالت بھی بدل گئی۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں دینی نقطۂ نگاہ سے ترجیح پہلے گروہ کو ہوگی نہ کہ دوسرے کو۔

۷، ۸۔ پہلی حالت زائل ہوگئی۔ امام جعفر صادق کا سا دینی ذوق اور امام رازی کی سی چھان بین جاتی رہی، عربی ملت کی آبرو قائم نہ رہی۔ ہم پر دین کا راستہ تنگ ہوگیا اور ہر فرومایہ آدمی دین کی رازداری کا دعویدار بن گیا۔

۹۔ اے مسلمان! تو دین کے رازوں سے ناواقف ہے۔ اگر تیرے دماغ میں عقل اور سمجھ کا شمّہ بھی باقی ہے تو ایک آئین ایک دستور، ایک دینی ضابطے پر قائم رہ۔

۱۰۔ میں نے زندگی کی نبض پہچاننے والے سے سنا ہے کہ اگر اختلاف پیدا ہُوا تو وہ قینچی کی طرح تیری زندگی کو کاٹ کر رکھ دے گا۔

۱۱۔ مسلمان آئین وضابطہ کی وحدت کے بل پر زندہ ہے اور ملتِ اسلامیہ قرآن کی بنا پر زندہ رہ سکتی ہے۔

۱۲۔ ہم سب خاک ہیں۔ رازوں کو جاننے والا دل قرآن ہے۔ اسے مضبوطی سے تھامے کیونکہ اللہ کی رسّی وہی ہے اسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کا حکم ہمیں ملا ہے۔

۱۳۔ جس طرح موتی دھاگے میں پرویا جاتا ہے، تو بھی اسی طرح قرآن کے رشتے میں پرو دیا جا۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو یاد رکھ کہ تو گرد و غبار کی طرح پریشان ہو کر فنا ہو جائے گا۔

آخر میں غلط فہمی کی پیش بندی کے لیے یہ بتا دینا چاہیے کہ اقبال نے نہ اجتہاد کا دروازہ بند کیا ہے، نہ اندھی تقلید کی عام حمایت کی ہے، صرف علم، اخلاق اور سیاسی اقتدار کے دورِ زوال میں اس امر پر زور دیا کہ جو مسلک انحطاط سے پیشتر چلا آ رہا تھا، اسی پر قائم رہنا چاہیے! اس لیے کہ انحطاط کے دور میں اجنبی قوتیں برسرِ اقتدار آجاتی ہیں۔ چونکہ لوگوں میں پہلے کی سی پرہیزگاری، اخلاص اور کاوش باقی نہیں رہتی، اس لیے ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اجنبی قوتیں ان سے کام لے کر نظامِ ملت کو درہم برہم کردیں گی۔ یہی حالت تاتاریوں سے پیشتر غلط اندیش حکمرانوں کے زمانے میں تھی، یہی حالت تاتاریوں کے بعد جابجا رونما ہوئی۔ یہی حالت ہمارے زمانے میں انگریزوں کے ماتحت پیش آئی۔ مفتی اور خانقاہ نشین ایسے ایسے فتوے صادر کرتے رہے جو ملت کے لیے مصیبت خیز تھے یہاں تک کہ انگریزی سلطنت کو شرعی اولو الامر ماننے میں بھی تامل نہ کیا گیا۔ اس حالت سے پریشان ہو کر اقبال نے یہ اشعار لکھے تھے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تلقین ان حالات میں تعدد جد ضروری نہ تھی۔ ہمارے زمانے میں مختلف افراد نے دین

کے اجارہ دار بن کر جو کام شروع کر رکھے ہیں، ان کے لیے اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے:

ہر لئیمے راز دارِ دیں شد است

اقبال نے اور مقامات پہ بھی یہ خیال دُہرایا ہے، مثلاً:

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے، مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام

نیز:

ہے کس کو یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حرّیتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

اٹھارھواں باب

اِتباعِ شریعت اور پختگیِ سیرت

اس باب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ قومی سیرت میں پختگی پیدا کرنے کا وسیلہ صرف یہ ہے کہ آئینِ الٰہیہ (شریعت) کی پیروی کی جائے۔

تمہید | مطالب کا مفاد یہ ہے کہ شریعت میں ظاہر و باطن کوئی نہیں۔ جس طرح موتی کے اندر اور باہر یکساں چمک ہوتی ہے، وہی کیفیت شریعت کی ہے۔ اسلام کا آغاز اور انجام شریعت ہے۔ پھر شریعت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: یکھو اگر کوئی قوت اسلام کے ایسے مسئلے میں، جس کی حیثیت مستحب کی ہے، رکاوٹ ڈالے تو مستحب فرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور مسلمانوں پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس رکاوٹ کو مٹا دیں۔ شریعت مسلمانوں میں قوت اور قدرت پیدا کرنے کے لیے آئی، لیکن مسلمان رسول اللہ صلعم کے طریقے سے الگ ہو گیا اور عجمیت نے اسے اسلامی جوہروں سے خالی کر دیا۔ آخر میں شیخ احمد رفاعی کی یہ نصیحت پیش کی ہے کہ عجمی خیالات

سے پرہیز کرنا چاہیے۔

شریعت اسلام | **ضَو**۔ روشنی۔ چمک دمک۔

بطون۔ بطن کی جمع بھی ہے یعنی شکم۔ یہاں اس کے معنی ہیں پوشیدہ ہونا، باطن۔

مرقات۔ زینہ۔ سیڑھی۔

مزاحم۔ روکنے والا۔ مزاحمت کرنے والا۔

مستحب۔ شریعت میں وہ فعل جس کا کرنا ثواب ہو اور نہ کرنا گناہ نہ ہو۔

صعوہ۔ ممولا۔

عصب۔ عصبہ کی جمع، پٹھے۔

۱، ۲۔ شریعت میں دوسرے معنی تلاش نہ کر۔ کیا تجھے موتی کے اندر چمک دمک اور روشنی کے سوا کچھ ملے گا؟ شریعت ایسا موتی ہے، جسے خود خدا نے بنایا۔ اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی۔

بعض لوگوں، خصوصاً ہمارے زمانے کے بعض غلط اندیش صوفیوں نے یہ نکتہ نکالا کہ شریعت کا ظاہر الگ ہے اور باطن الگ۔ اس طرح اپنے لیے شریعت سے بچ نکلنے اور اس پر عمل نہ کرنے کا ایک حیلہ پیدا کر لیا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ شریعت میں ظاہر و باطن کی کوئی تمیز نہیں۔ وہ ایک چیز ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ جو کچھ اُس میں آچکا ہے، اس پر بے چون وچرا عمل کرنا چاہیے۔

۳۔ یہ جو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں؛ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ واضح رہے کہ علمِ حق شریعت کے سوا کچھ نہیں۔ شریعت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلعم نے انسانوں تک پہنچائی اور تجھے معلوم ہے کہ سنّت کی اصلیت کیا ہے؟ محض اللہ اور اس کے رسولِ پاک کے حکم و عمل سے محبّت۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی شریعت اور رسول اللہ صلعم کی سنّت کے لیے جذب و کشش اپنے اندر نہیں رکھتا، اس کی زبان سے محبّت کا دعویٰ جھوٹا سمجھا جائے گا۔ رسولؐ کی پیروی کا درجہ اتنا بلند ہے کہ خدا نے قرآن مجید میں فرمایا، رسولؐ کی پیروی خدا کی محبّت کا وسیلہ ہے۔ کسی نے خدا کو نہیں دیکھا۔ رسول اللہ صلعم کو لاکھوں افراد نے دیکھا۔ حضورؐ نے سب کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔ جو اُس پر چلے گا، وہ رسول اللہ کے نقشِ قدم پر چلے گا، اور نہ خطا کار و گمراہ ہوگا۔

۴۔ فرد کے لیے شریعت کے سوا کوئی ایسا زینہ نہیں، جو اسے یقین کی بلندی پر پہنچادے۔ شریعت ہی کی پیروی سے یقین کے مقامات پختہ اور مستحکم ہوتے ہیں۔

۵۔ ملّت خدا کے مقرر کیے ہوئے دستور کے مطابق نظم و ترکیب پاتی ہے۔ یہ نظم پختہ ہو جاتا ہے تو ہمیشہ کے لیے قائم رہتا ہے۔

۶ ۔ یہاں صالح نظام پیدا کرنے کے لیے دو چیزیں لازم ہیں، اوّل علم، دوم قوت ۔ علم وہ، جو خدا کی عطا کردہ شریعت کے بارے میں صحیح معلومات پر مبنی ہو۔ وہی علم خدا کی طرف سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قوت وہ، جس کی بنا پر وہ تمام قاعدے رائج کیے جاسکیں، جو شریعت کے مطابق ہوں اور ان تمام قوتوں کو دبایا جاسکے جو اس ترویج میں رکاوٹ پیدا کرنے کی موجب ہو سکیں۔ یہ دو چیزیں حضرت موسیٰؑ کے خاص معجزات کے ذریعے سے بھی واضح ہوئیں یعنی ایک ید بیضا، دوسری عصا۔ یدِ بیضا سے مراد علم شریعت تھا اور عصا قوتِ نفاذ کا نشان تھا۔

غور فرمایئے، ایک ایک شعر میں کتنے نادر اور صحیح اسلامی اصول پیش کیے جارہے ہیں!

۷ ۔ میں تجھے اسلام کا بھید بتاتا ہوں۔ یہ شریعت کے سوا کچھ نہیں۔ شریعت ہی اسلام کا آغاز اور شریعت ہی انجام ہے۔ جو شخص جتنا شریعت سے ہٹا، اتنا ہی اسلام سے ہٹ گیا۔

نسخۂ قدرت ۱، ۲، ۳ ۔ اے مخاطب! تو دین کی حکمت کا امانت دار ہے، میں تجھے اسلام کی روشن شریعت کا ایک نکتہ بتاتا ہوں۔ جب کوئی فرد یا گروہ بے وجہ مسلمان کو کسی مستحب فعل سے روکتا ہے تو وہ مستحب مستحب نہیں رہتا بلکہ فرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جسے بجا لانا مسلمانوں کے لیے لازم ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ زندگی قوت و قدرت کے سوا کچھ نہیں۔

۴، ۵، ۶ ۔ اگر لڑائی کے دن دشمن کا لشکر اس خیال سے بے فکر ہو جائے کہ صلح ہو رہی ہے، حفاظت کے لیے اس نے جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، انھیں ڈھیلی کر دے اور دفاعی تدابیر سے کنارہ کش ہو جائے تو جانتے ہو کہ اسلام کا کیا حکم ہے؟ یہ کہ جب تک اس کے تمام حفاظتی انتظامات پہلی شکل پر نہ آجائیں، اس کی مملکت پر لشکر کشی حرام ہے۔

> خان نیاز الدین خاں مرحوم کے نام ایک مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ مثنوی کا یہ حصہ ۲۶ فروری ۱۹۱۸ء کو لکھا گیا تھا۔ فرماتے ہیں: افسوس مثنوی کا دوسرا حصہ (اسرار خودی کا دوسرا حصہ) ابھی تیار نہیں ہو سکا۔ کل کچھ فرصت مل گئی تھی (۲۶ فروری)، فقہ کا وہ مسئلہ نظم کیا، جس کے رو سے مسلمانوں کے لیے اس دشمن پر حملہ کرنا حرام ہے ہے جو صلح کی امید میں اپنے حصار وغیرہ گرا دے۔ اس مسئلے کا ذکر کر کے اس کی حقیقت کا فلسفہ لکھا ہے کہ شرع نے کیوں ایسا حکم دیا ہے، عجیب عجیب باتیں ذہن میں آتی ہیں، مگر قلب کو یکسوئی میسر نہیں (مکاتیب ص ۴۷)۔

۷ ۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ خدا کے اس فرمان میں کیا راز چھپا ہوا ہے؟ یہ کہ خطروں کے گھمسان ہی میں جینا اصل زندگی ہے۔

۸ ۔ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ جب مسلمان جنگ کے لیے نکلے تو شعلہ بن کر ہر طرف لپکے اور پتھروں کے سینے چیرتا جائے۔

۹، ۱۰ ۔ شریعت تیرے بازو کی قوت آزمانے کی غرض سے الوند جیسا پہاڑ سامنے ڈال دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اسے

پیس کر سرمہ بنا دے اور اپنے خنجر کی حرارت سے اسے پگھلا کر رکھ دے۔

۱۱۔ کمزور اور دبلی بھیڑ اس لائق نہیں ہوتی کہ نر شیر اسے شکار کرے اور پنجہ مارنے کی زحمت اٹھائے۔

۱۲۔ اگر باز مموے کے شکار کا عادی ہو جائے تو آہستہ آہستہ وہ اپنے شکار سے بھی زیادہ کمزور اور بے دست و پا ہو جائے گا۔

۱۳۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت ترتیب دینے والی پاک ذات نے جو اچھے برے کی حقیقت سے خوب واقف تھی، تیرے (مسلمان کے) لیے ایک ایسا دستور تیار کر دیا، جو قوت کا طلبگار ہے اور قوت پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

۱۴۔ یہ دستور عمل کی قوت سے تیرے پچھلے لوہے کے بنا سکتا ہے اور اس دنیا میں تجھے عمدہ مرتبے پر پہنچا سکتا ہے۔

۱۵۔ اس دستور میں یہ صلاحیت ہے کہ اگر تو کمزور اور ناتواں ہو گا تو تجھے قوی اور پہاڑ کی طرح پختہ کر دے گا۔

۱۶۔ یاد رکھ کہ رسول اللہ صلعم کا دین زندگی کا دین ہے اور حضورؐ جو شریعت لائے، وہ زندگی کے دستور کی تفصیل ہے۔

۱۷۔ اگر تو پستی میں زمین کے برابر ہے تو یہ دین تجھے آسمان کی بلندی عطا کر دے گا اور خدا جو کچھ تجھے بنانا چاہتا ہے، وہی بنا دے گا۔

۱۸۔ اس دین کی صیقل سے پتھر آئینہ بن جاتا ہے اور لوہے کے دل سے زنگار کی آلائش نکل جاتی ہے۔ یعنی اسلام جو تبدیلی لاتا ہے، وہ ظاہر تک محدود نہیں رہتی بلکہ باطن تک کو پاک کر دیتی ہے۔

مسلمانوں کی کیفیت ۱۔ جب تک قوم رسول اللہ صلعم کے طریق پر قائم تھی، قدرت اس کی زندگی کی ضامن تھی۔ جب اس نے یہ طریق چھوڑا، زندگی کا بھید گم کر بیٹھی۔

۲، ۳، ۴۔ صحرا میں رہنے اور اونٹ پر سوار ہونے والا مسلمان ایک بلند اور پائدار درخت کی طرح تھا۔ اس نے وادیٔ بطحا میں جڑ پکڑی، صحرا کی گرم آب و ہوا میں نشو و نما پائی۔ افسوس کہ عجم کی ہوا نے اس کی قوت چھین لی۔ اب وہ نے بنا ہوا ہے جو اندر سے بالکل خالی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب تک مسلمان عربی طور طریقوں اور اسلامی شیووں پر کاربند تھے انھیں دنیا بھر میں سربلندی حاصل تھی، لیکن جب عجمیوں کے طور طریقے اختیار کر لیے، ان میں سختیاں برداشت کرنے کی قوت نہ رہی تو ان کی پہلی حیثیت زائل ہو گئی اور وہ خود نے کی طرح کمزور و بے طاقت رہ گئے۔

۵۔ جو مسلمان شیروں کو بھیڑوں کی طرح بے حقیقت سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے، اب ان کا یہ حال ہے کہ ایک چیونٹی بھی پاؤں کے نیچے روندی جائے تو ان کا دل درد سے تڑپ اٹھتا ہے۔

۶۔ جن مسلمانوں کی تکبیر سے پتھر پانی بن کر بہ نکلتا تھا، وہ اب ایک بلبل کی آواز سن کر بے قرار ہو جاتے ہیں۔

۷۔ جن مسلمانوں کا عزم اتنا بلند تھا کہ وہ پہاڑوں کو گھاس کے تنکے سمجھتے تھے، اب ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھے ہیں۔

اور انھوں نے اس کا نام توکل رکھ لیا ہے۔

۸ - جن مسلمانوں کی ضربیں دشمنوں کی گردنیں توڑتی تھیں، وہ اپنے سینوں پر ضربیں لگاتے لگاتے دلوں کو زخمی کر چکے ہیں۔

۹ - جن مسلمانوں کے نقشِ قدم سے سیکڑوں ہنگاموں کا سر و سامان ہو جاتا تھا، اب علیحدگی کے کونے میں پاؤں توڑے بیٹھے ہیں۔

۱۰، ۱۱ - جن مسلمانوں کے فرمان دنیا کے لیے اٹل ہوتے تھے اور جن کے دروازوں پر سکندر و دارا جیسے بادشاہ بھیک مانگا کرتے تھے، ان مسلمانوں نے اب جد و جہد چھوڑ دی اور قناعت اپنالی، یہاں تک کہ وہ بھیک کے کاسے پر فخر کر رہے ہیں۔

شیخ احمد کی نصیحت ۱، ۲، ۳ - شیخ احمد رفاعی، جن کی بارگاہ بلندی میں آسمان کے برابر تھی، سورج ان کے ضمیر سے نور حاصل کرتا تھا۔ ان کے مقدس مزار پر جو پھول ہیں، وہ لاالہٰ کہتے ہوئے زمین سے سر باہر نکالتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مرید سے فرمایا، بیٹا! عجمیوں کے خیالات سے پرہیز لازم ہے۔

۴ - اگرچہ عجمیوں کی فکر آسمان سے بھی آگے نکل گئی، لیکن افسوس کہ رسول اللہ صلعم کے دین کی حد کے اندر نہ رہی، یعنی اس فکر کو اسلام سے کوئی مناسبت نہیں۔

۵ - اقبالؔ کہتے ہیں، بھائی! ملت کے اُس مخدوم کی نصیحت غور و توجہ سے سُن۔

۶ - یہ سچی بات ہے، اس سے دل کو مضبوط بنا۔ عرب سے تعلق پیدا کر تاکہ تُو مسلمان ہو جائے۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ عرب و عجم کی اصطلاحات سے مقصود ملک عرب اور ملک ایران یا سامی نسل اور آریائی نسل نہیں۔ اقبالؔ نے یہ اصطلاحیں خاص معنی میں استعمال کی ہیں، عرب سے ان کا مقصود وہ پاک دین ہے جو رسول اللہ صلعم اس دنیا میں لائے اور بالکل ابتدائی دور کے مسلمانوں نے اس پر عمل پیرا ہو کر ایک دنیا کے لیے ہدایت کا سر و سامان بہم پہنچا دیا۔ وہ دین سراپا حق اور سراپا زندگی تھا، اس سے قلب و نظر کا تزکیہ ہو گیا۔ جن مقاصد کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا، ان کی تکمیل کے وسائل مہیا ہو گئے۔ عجم سے مقصود اسلام کا وہ ڈھانچا ہے جو عجمی تصورات و نظریات کے سانچے میں تیار ہُوا اور جسے اصل اسلام سے چنداں مناسبت نہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی، ایمانی اور عملی قوت کو اسی عجمیت نے سلب کر لیا۔ اس میں اسلامی اصطلاحات اور اسلام کا ظاہری نظام قائم رکھا گیا، لیکن اس کے اندر عجمی روح داخل کر دی گئی۔ اسی لیے شیخ احمد رفاعی نے فرمایا تھا کہ عجمی فکر دینِ رسولؐ کے دائرے سے باہر نکل گئی، عرب یا غیر عرب میں سے جو بھی خالص اسلام کو نصب العین بنائے گا، اقبالؔ کے نزدیک وہ "عرب" سے تعلق پیدا کرے گا اور حقیقی مسلمان بن جائے گا۔ وہ خود ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

وہ ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے زیر اثر رہے ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی (اسرار و رموز) میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں، جس کی اشاعت رسول اللہ سے ہوئی"۔ —— پھر اسرار خودی پر مختلف طبقوں کے اعتراضات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے — انشاء اللہ دوسرے حصے (رموز) میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے، جن کا تصوف حامی ہے" (اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۴)۔

اُنیسواں باب

اسوۂ حسنہ کی پابندی

اس باب میں اقبال نے یہ واضح کیا ہے کہ ملت میں حسن سیرت پیدا کرنے کے لیے آدابِ محمدیؐ کی پابندی لازم ہے۔

تمہید اقبال نے رسول اللہ صلعم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی میں اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک درویش بار بار صدائیں لگاتا تھا۔ مجھے غصہ آیا اور اسے مارا۔ والد دیکھ رہے تھے، انھیں افسوس ہوا اور فرمایا کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلعم کے سامنے یہ درویش پیش ہو کر شکایت کرے گا تو میں کیا جواب دوں گا؟ اسی سلسلے میں بتایا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے اسوۂ حسنہ اور حضورؐ کے اخلاق کریمانہ کی پیروی کس قدر ضروری ہے۔

درویش کا واقعہ مبرم - اٹل۔

شکیب - صبر۔

پیرامون - گرد و پیش۔

۱- ایک بھکاری اٹل قضا کی طرح ہمارے دروازے پر بار بار صدائیں لگانے لگا اور گھر والوں کی بات سنتا ہی نہ تھا۔

۲- مجھے غصہ آگیا اور فقیر کے سر پر ایک ڈنڈا رسید کیا۔ بھیک مانگ کر جو کچھ اس نے جھولی میں جمع کیا تھا، وہ

زمین پر گر پڑا۔

۳ - دورِ جوانی کا آغاز تھا اور معلوم ہے کہ اس دور میں عقل نیک و بد اور درست و نادرست نہیں سوچا کرتی چنانچہ مجھ سے بھی سوچے سمجھے بغیر یہ حرکت سرزد ہوئی۔

۴ - میرے مزاج کی یہ کیفیت دیکھ کر والدِ ماجد بہت آزردہ ہوئے۔ ان کے چہرے کا لالہ زار پژمردہ ہو گیا یعنی ان کے رخساروں کی سرخی پر افسردگی چھا گئی۔

۵ - ان کے لبوں سے ایک جگر سوز آہ نکلی اور دل سینے میں تڑپ اٹھا؛

۶ - ایک آنسو، جس کی شکل ستارے کی تھی، ان کی آنکھوں سے نکلا۔ کچھ دیر مژگان پر جھکا اور گر گیا؛

۷، ۸ - میری کیفیت یہ تھی کہ ڈر کے مارے جان میرے بدن میں لرز اٹھی، جیسے پرندہ خزاں کے موسم میں گھونسلے کے اندر بیٹھا ہوا صبح کی ہوا سے لرز اٹھتا ہے۔ میں اس نتیجے سے بالکل غافل تھا۔ والد کی کیفیت دیکھ کر صبر کی لیلیٰ میرے محل سے نکل گئی، یعنی مجھ میں صبر کی تاب نہ رہی۔

والد کے ارشادات

۱ - والد نے فرمایا کہ کل رسول اللہ صلعم کی اُمّت اس ذاتِ پاک کے سامنے جمع ہو گی جسے سب کی آقائی کا درجہ حاصل ہے یعنی رسول اللہ صلعم؛

۲، ۳، ۴ - ان میں ملّتِ بیضا کے غازی بھی ہوں گے، وہ لوگ بھی، جو اسلام کی حکمتِ رعنا کے حافظ تھے، یعنی بلند پایہ اصحاب علم و بصیرت۔ شہید بھی ہوں گے جو دینِ حق کے لیے دلیل ہیں اور ملّت کی فضا میں تاروں کی مانند چمک رہے ہیں۔ زاہد بھی ہوں گے، عالم بھی ہوں گے، دلفگار عاشق بھی اور شرمسار گنہگار بھی۔

۵ - اس مجمع میں بھکاری کے حلق سے آہ و فغاں بلند ہو گی جسے تیرے ہاتھ سے دُکھ پہنچا؛

۶، ۷، ۸ - بیٹا! سواری کے بغیر تیرا راستہ تو طے ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب رسول اللہ صلعم مجھ سے فرمائیں گے، خدا نے ایک مسلمان نوجوان کو تیرے سپرد کیا کہ اسے صحیح تعلیم و تربیت دے، لیکن اس نوجوان نے میری ادب گاہ سے تو کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ حضورؐ فرمائیں گے کہ تُو تو اس آسان کام کو بھی پورا نہ کر سکا یعنی مٹی کے انبار کو آدمی نہ بنا سکا۔ بتا، میں اُس وقت کیا جواب دے سکوں گا؟

مسلمان اور خلقِ نبیؐ

۱ - والد لطف و کرم کا پیکر تھے۔ اگرچہ مجھے ملامت کر رہے تھے، لیکن گفتگو میں بڑی نرمی ملحوظ تھی۔ میں شرم کے مارے پانی پانی ہو رہا تھا اور امید و بیم میں مبتلا تھا۔

۲، ۳ - والد نے فرمایا، بیٹا! ذرا رسول اللہ صلعم کی امّت کا جمع ہونا تو پیش نظر لا۔ پھر میری سفید ڈاڑھی دیکھ اور یہ سوچ کہ امید و بیم کے لرزے سے میری حالت کیا ہو گی۔

۴ - دیکھ، اپنے باپ پر یہ نازیبا ظلم نہ کر اور غلام کے لیے آقا کے روبرو رسوائی کا سامان بہم نہ پہنچا؛

۵ - تُو رسول اللہ صلعم کی شاخ کا غنچہ ہے۔ حضوؐر ہی کی نسیم بہار سے شگفتہ ہو کر پھول بن۔

۶ - تجھے حضوؐر ہی کی نسیم بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا چاہیے، یعنی حضوؐر ہی کے خُلق سے حصّہ لینا لازم ہے۔

۷، ۸ - دیکھ، مولانا رومؒ کیا اچھی بات کہہ گئے ہیں! وہ مولانا رومؒ جن کے ہر قطرے میں حقائق کا سمندر سمایا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:
اپنی زندگی کا رشتہ رسول اللہ صلعم سے نہ توڑ۔ اپنے علم و فن اور روش پر بھروسا نہ کر۔

۹ - مسلمان کی فطرت سر سے پاؤں تک شفقت ہے۔ اِس دنیا میں اُس کا ہاتھ اور اُس کی زبان رحمت کا پیغام ہے۔

۱۰، ۱۱ - وہ پاک ذات، جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا، کیا یہ معلوم نہیں کہ وہ سب کے لیے رحمت تھے اور ان کا لقب ہی رحمۃ للعالمین تھا! پھر ان کے اخلاق سب سے اعلیٰ تھے اور خود قرآن مجید نے کہا ہے وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (سورۂ قلم) اگر تُو حضوؐر کے مقام سے دُور رہا تو جان لے کہ ہمارے گروہ میں سے خارج ہے۔

۱۲، ۱۳، تُو ہمارے باغ کا پرندہ ہے، ہمارا ہم صفیر و ہم زبان ہے۔ اگر تیرے اندر نغمے کی صلاحیت ہے تو ہمارے باغ کی شاخ پر بیٹھ کر گا، ہم سے الگ ہو کر نغمہ سرا نہ ہو۔

۱۴ - اِس دنیا میں جو بھی شے زندگی کے سرمایے سے بہرہ ور ہے، جب کسی ناسازگار فضا میں پہنچتی ہے تو مر جاتی ہے۔

۱۵ - تُو بلبل ہے، تیرے لیے باغ کی فضا سازگار ہے۔ باغ ہی میں پرواز کا شوق پورا کر اور اپنوں کے ساتھ مل جل کر گا۔ یہاں باغ سے مراد رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارکہ ہے۔

۱۶ - اگر تُو عقاب ہے تو دریا کی تہ میں زندگی بسر نہ کر، تیرے لیے صحیح مقام صحرا کی تنہائی ہے۔

۱۷ - کیا تُو ستارہ ہے؟ پھر اپنے آسمان کے سوا کہیں نہ چمک۔ اپنے گرد و پیش سے قدم باہر نہ رکھ۔

ایک مثال ۱، ۵ - جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے، اُس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تو ابرِ بہار سے پانی کا ایک قطرہ لے اور اسے باغ کی فضا میں پرورش کرے، یہاں تک کہ بہار کے فیض سے ایک کلی شبنم کے قطرے کی طرح اسے اپنی گود میں لے لے۔ صبح کے وقت جو کرن آسمان پر روشنی پھیلاتی ہے اور اس کے منتشر غنچہ و درخت بن جاتا ہے۔ تو اُس کرن سے کام لے کر قطرے کے جوہر سے نمی باہر کھینچ لے اور اس کے بیتاب اجزائے ترکیبی میں حرکت کا ذوق باقی نہ چھوڑے۔ اس طرح جو جوہر تو تیار کرے گا صرف پانی ہوگا اور تیری کوشش کی حیثیت سراب سے زیادہ نہ ہوگی۔

اس مثال سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہر شے اپنے اصل ماحول میں صحیح شکل اختیار کرتی ہے ماحول سے باہر نکال کر کتنی ہی کوششیں کی جائیں، وہ مطلوب نتیجے پیدا نہیں کرے گی، مثلاً اگر ابرِ بہار کا کوئی قطرہ باغ میں رکھا جائے اور پرورش کی مختلف صورتیں عمل میں لائی جائیں تو وہ ہرگز

موتی نہ بنے گا، قطرہ ہی رہے گا ۔

۶۔ اگر تو اُسے موتی بنانا چاہتا ہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ قطرہ سمندر میں پہنچے اور صدف کی گود میں پرورش پائے ۔ پھر اُس کی چمک دمک تارے کی چمک دمک اختیار کرے گی کیونکہ وہ اپنے اصل ماحول میں پہنچ جائے گا اور قدرت کے مقرر کیے ہوئے اصول کے مطابق پرورش پائے گا۔ خدا نے جو اصول اور قواعد و قوانین مقرر فرما دیے ہیں، اُن میں ردّ و بدل یا آگا پیچھا ممکن ہی نہیں۔ وہ مشینری کی طرح کام میں لگے ہوئے ہیں اور جو قانون جس مقصد کے لیے بنا ہے، اسے پورا کر رہا ہے۔ یہی معنی ہیں وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا اور لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ کے۔

۷۔ ابرِ بہار کا جو قطرہ سمندر سے دُور رہ جائے گا، وہ شبنم کے قطروں کی طرح خس و خاشاک کی نذر ہو جائے گا۔ جو چیز اپنے ماحول سے الگ ہو جاتی ہے، اس کا انجام یہی ہوتا ہے ۔

۸، ۹۔ مسلمان کی سرشت بھی موتی کی طرح پاک ہے، اُسے رسول اللہ صلعم کے سمندر سے آب و تاب ملتی ہے۔ اگر تو ابرِ بہار کا قطرہ ہے تو اُس سمندر کی آغوش میں پہنچ اور اُس کی تہ سے موتی بن کر باہر نکل۔

۱۰۔ پھر دنیا میں سورج سے بھی زیادہ روشن ہو بلکہ دائمی تابانی و درخشانی کا مالک ہو جا۔

بیسواں باب

ملّتِ اسلامیّہ اور بیت الحرام

اس باب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ قومی زندگی ایک محسوس مرکز کی طلبگار ہے اور ملّت اسلامیہ کا مرکز کعبہ ہے۔

تمہید یہ باب کسی طویل تمہید کا محتاج نہیں۔ اس کے دو بند ہیں، پہلے بند میں زندگی کی حیثیت واضح کی گئی ہے؛ دوسرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے تو قوم وجود میں آجاتی ہے۔ افرادِ قوم کے درمیان ضبط و نظم مرکزیت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا مرکز بیت الحرام ہے۔ اُسی کی بدولت ہم تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود ایک ہیں۔ مسلمانوں کو یہودیوں کے حال سے عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ ان کے ہاتھ سے مرکز

چھننا تو سب کچھ چھن گیا۔ مسلمان کو چاہیے کہ اس مرکز سے وابستگی پیدا کرے۔ خدا کا سچا بندہ بن جائے۔ ہمارے اسلاف اسی بندگی کی بدولت اوجِ کمال پر پہنچے تھے۔

زندگی کی کیفیت حدوث - پیدا ہونا۔ یہ اُن وجودوں کی کیفیت ہے جو فانی ہیں یعنی پیدا ہوتے اور مرجاتے ہیں۔

قِدم - قدیم ہونا۔

سیلی - تھپڑ۔ طمانچہ۔

بناگوش - کنپٹی۔

التباس - شک وشبہہ۔ دھوکا ہونا۔ ابہام۔

۱ - میں تیرے سامنے زندگی کے کاروبار کی گتھی کھولتا ہوں اور اس کے بھیدوں سے تجھے آگاہ کرتا ہوں۔

۲ - زندگی بھی خیال کی طرح بیتابانہ اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ہے اور اطراف سے دامن بچاتی ہوئی چلتی ہے۔
مطلب یہ کہ زندگی کسی جگہ یا مقام کی پابند نہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے:

۳ - کہ اس دنیا میں وہ کیونکر آتی ہے، جو دیر و زود کی پابند ہے؟ اور زندگی کا وقت گزشتہ کل اور آئندہ کل پیدا کرتا ہے؟

۴ - مذکورہ سوال کے جواب میں مخاطب سے فرماتے ہیں کہ اگر تیرے پاس حقیقی نظر ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اپنی حالت دیکھ اور اُس پر غور کر۔ تو بھی تو اسے بے خبر! ہر لحظہ بدلتا اور وقفِ خرام رہتا ہے۔
مراد یہ ہے کہ اگرچہ انسان کو اپنے اندر کوئی تغیر محسوس نہیں ہوتا، مگر حقیقت میں تغیر کا عمل ہر لحظہ جاری ہے، ورنہ انسان بچے سے طفل، طفل سے جوان اور جوان سے بوڑھا کیونکر ہو؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں ردّ و بدل برابر جاری رہتا ہے۔

۵ - جب زندگی چاہتی ہے کہ اپنی اُن تابانیوں اور درخشانیوں کو نمایاں کرے، جو نظر نہیں آتیں تو اس کا شعلہ اپنے دھوئیں سے اردگرد پردہ تیار کر لیتا ہے۔ بہ ظاہر شعلے سے مراد جان اور پردۂ دود سے مراد جسم ہے، یعنی زندگی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر کے اپنے اُن جوہروں کا تماشا دکھاتی رہتی ہے جو پہلے نمایاں نہیں ہوئے۔

۶ - جب زندگی سیر و گردش اور حرکت کے بجائے سکون و قیام اختیار کر لیتی ہے یا کہنا چاہیے کہ جب نظر اس کی سیر کو سکون کی حالت میں دیکھتی ہے تو زندگی کی ندی میں جو لہر ہے، وہ بندھ کر اور پیوستہ ہو کر موتی بن جاتی ہے۔
مراد یہ کہ موتی کی آب و تاب بھی زندگی ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی نے تھوڑی دیر کے لیے سکون گوارا کیا اور اس کے پانی کی لہر آب و تاب بن کر موتی کی شکل اختیار کر گئی۔

اس میں بیتابی و بیقراری نہ رہی اور چمک پیدا ہو گئی۔

۷، ۸، ۹ ۔ زندگی آگ تھی؛ پھر اس نے دم سادھا اور لالے کا پھول بن کر ایک شاخ سے باہر نکل آئی، لیکن اے مخاطب! تیری نگہ خام ہے۔ بیدار ہونے میں سست ہے اور لنگڑی ہے۔ تو نے رنگ کی پرواز پر پھول کی تہمت لگا دی، حالانکہ زندگی ایسا پرندہ نہیں، جو کسی جگہ گھونسلا بنا کر بیٹھ جائے۔ وہ تو رنگ کا طائر ہے، جو ہر وقت اڑتا رہتا ہے۔

واضح یہ کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی دور و سیر میں مختلف شکلیں اختیار کر لی جاتی ہے۔ انسان اسے سکون کی حالت میں دیکھتا ہے تو کبھی موتی بتاتا ہے کبھی پھول، حالانکہ زندگی سکون سے بالکل ناآشنا ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت پرواز میں رہتی ہے۔ انسان نگہ و نظر کی خامی سے اُسے ساکن سمجھ لیتا ہے۔

۱۰ ۔ زندگی عاجزی اور بیچارگی کی حالت میں قید بھی ہوتی ہے، ساتھ ہی آزاد بھی۔ وہ گیت بھی گاتی ہے اور آہ و نالہ بھی کرتی ہے۔

۱۱ ۔ اُس کے پروں سے لحظہ بہ لحظہ پرواز کی قوت گھٹتی جاتی ہے، پھر وہ خود ہی اپنی ان کوتاہیوں کے علاج میں لگی رہتی ہے۔

۱۲ ۔ وہ خود ہی اپنے کاموں کے رشتے میں گرہیں ڈالتی ہے۔ پھر جتنی مشکلات جمع ہو جاتی ہیں، انھیں آسان بھی کر لیتی ہے۔

۱۳ ۔ زندگی بہت تیز رفتار ہے، لیکن کبھی کبھی زمین میں گڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ چلنے پھرنے کا شوق دوگنا ہو جائے۔

۱۴ ۔ اُس کے سوز میں ساز سویا ہوا ہے اور جب وہ "آج" کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو گزشتہ کل اور آئندہ کل بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

۱۵ ۔ ہر لحظہ مشکلات بھی پیدا کرتی ہے تاکہ جد و جہد کا جذبہ ابھارے، ساتھ ہی آسانیاں بھی پیدا کر لیتی ہے۔ غرض وہ ہر وقت نئی نئی اور تازہ چیزیں پیدا کرنے میں مصروف ہے۔

۱۶ ۔ اگرچہ زندگی خوشبو کی مانند ہر وقت تگ و تاز میں لگی رہتی ہے، تاہم جب کسی سینے میں ٹھہر جاتی ہے تو سانس بن جاتی ہے۔

۱۷ ۔ وہ اپنے ممکنات کے رشتوں کا جال اپنے آپ پر تنتی رہتی ہے۔ کبھی گرہ کھا کر گھنڈی بن جاتی ہے۔

۱۸ ۔ جس طرح ایک بیج کے اندر درخت کے پتے اور پھول پوشیدہ ہوتے ہیں، اسی طرح زندگی جب اپنے آپ پر نگاہ ڈالتی ہے تو درخت بن جاتی ہے۔

۱۹، ۲۰ ۔ پھر مٹی اور پانی سے جسم کا خلعت تیار کرتی ہے۔ اس میں ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور دل وجود میں لاتی ہے۔

اس طرح جسم تیار ہو جاتا ہے تو اس کی خلوت میں زندگی جا بیٹھتی ہے۔ اس خلوت میں ہزاروں انجمنیں اپنے ساتھ لاتی ہے:

ان تمام اشعار میں زندگی کی مختلف کیفیتیں بیان کی گئی ہیں اور بعض مقامات پر یہ کیفیتیں متضاد بھی ہیں مثلاً فرمایا کہ زندگی مقید بھی ہے اور آزاد بھی۔ گاتی بھی ہے اور آہ و زاری بھی کرتی ہے۔ سب سے آخر میں انسان کے وجود کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ فرد زندگی ہی کے بل پر تمام ہنگامے بپا رکھتا ہے اور اس کائنات میں جو کچھ ہمارے سامنے آ رہا ہے، اسے ہم زندگی ہی کی کرشمہ آرائی قرار دے سکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف آتے ہیں:

قومی مرکزیت

۱، ۲۔ فرماتے ہیں: قوموں کے پیدا ہونے کا دستور بھی اسی طرح ہے۔ زندگی ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے۔ مرکز کی حیثیت دائرے کے لیے وہی ہے، جو جسم کے لیے جان کی ہے۔ دائرے کا پورا خط، اس کے نقطے یعنی مرکز سے رشتہ جوڑا ہوتا ہے:

۳۔ قوم کا ربط ضبط بھی ایک مرکز ہی پر موقوف ہے اور اس کے کاروبار میں دوام مرکز ہی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ ہماری زندگی کے بھیدوں کا حامل اور خود بھید بیت الحرام یعنی کعبہ ہے۔ ہمارا سوز اور ساز، ہمارا رنج اور راحت، ہمارا دکھ اور سکھ اسی سے وابستہ ہے۔

۵۔ ہم کعبے کو سینے میں سانس کی طرح محفوظ رکھتے ہیں۔ وہ ہماری جانِ شیریں ہے اور ہم اس کا جسم ہیں۔ اس سے کعبے کی حقیقی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اس سے ذرا بھی روگردانی اختیار کریں تو ظاہر ہے کہ ہمارے سینے میں سانس باقی نہ رہے گا اور جان بدن سے نکل جائے گی، گویا ہماری ہستی کعبے ہی پر موقوف ہے:

۶۔ ہمارا باغ اس لیے تر و تازہ اور شاداب ہے کہ کعبے کی شبنم سے اسے برابر فیض حاصل ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا کھیت اسی کے زمزم سے پانی لیتا ہے، یعنی کھیت کی آبیاری اسی کے زمزم سے ہوتی ہے:

۷۔ اسی کے ذروں سے سورج کو آب و تاب حاصل ہوتی ہے۔ اسی کی فضا میں وہ غوطہ زن رہتا ہے:

۸۔ کعبے کے دعوے کے لیے دلیل کی ضرورت ہو تو ہم سراپا دلیل ہیں، حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی برہانوں میں سے ہم بھی ایک برہان ہیں:

۹۔ کعبے ہی نے ہماری شہرت دور دور پہنچا دی اور ہمارے حدوث کا رشتہ قدم سے جوڑ دیا، یعنی ہم فانی ہیں، تاہم جب تک یہ دنیا باقی ہے، ہمارے لیے بقا کا انتظام کعبے ہی کی وجہ سے ہوا:

۱۰۔ اگرچہ ہماری ملت جگہ جگہ بکھری ہوئی ہے لیکن کعبے کے گرد گھومنے اور طواف کرنے کے باعث ہم سب ایک ہیں،

متحد ہیں۔ ہماری حیثیت اُس صبح کی ہے، جس کے پنجرے میں سورج بند ہوتا ہے :

۱۱ - اے مسلمان! تیری کثرت کعبے کی وجہ سے وحدت بنی ہوئی ہے اور اسی رشتۂ وحدت کی بدولت تیری خودی پختہ اور پائدار ہے :

۱۲ - تُو کعبے سے وابستگی کے باعث زندہ ہے۔ جب تک اس کا طواف کرتا رہے گا، قائم و استوار رہے گا :

۱۳ - اس دنیا میں جمعیت کو قوموں کی جان سمجھا جاتا ہے۔ جب تک جمعیت نہ ہو، قومیں وجود میں نہیں آ سکتیں۔ اے مسلمان! آنکھیں کھول کر دیکھ، کعبہ تیری جمعیت کا راز ہے، یعنی اسی پر تیری جمعیت موقوف ہے :

یہودیوں کا انجام | ۱، ۲ - اے مسلمان! تیرا ضمیر روشن ہے تو امتِ موسیٰ یعنی یہودیوں کے انجام سے عبرت حاصل کر۔ اُس قوم نے مرکز کھو دیا، ساتھ ہی قومی جمعیت کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔

دیکھیے، پہلے یہودیوں کی پابندی شریعت نہیں بلکہ تعلید کو ان کی بقا کا راز بتایا تھا۔ اب مرکز کے چھن جانے کو ان کا شیرازہ بکھر جانے کی علت قرار دیا ہے۔

۳، ۴ - اُس قوم یعنی قومِ یہود نے انبیاؑ کی آغوش میں نشوونما پائی۔ اس میں ایسے لوگ بھی ہوئے جو تمام بھیدوں سے واقف تھے، لیکن جب مرکز اُس کے ہاتھ سے نکلا، جمعیت کا رشتہ ٹوٹا تو زمانے نے اس کی کنپٹی پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ اس کی زندگی خون ہو کر رہ گئی اور آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک گئی۔

انبیاؑ کی آغوش میں نشوونما پانے کا معاملہ زیادہ تفصیل کا محتاج نہیں۔ مدتِ دراز تک حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ یہودیوں کے ہادی و رہنما رہے۔ پھر ہر دور اور ہر عہد میں قوم یہود کی ہدایت کے لیے نبی مبعوث ہوئے، جیسا کہ بائیبل سے واضح ہوتا ہے :

۵ - وہ قوم انگور کی بیل تھی۔ اس کے رگ و ریشہ سے نمی زائل ہو گئی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ اُس کی خاک سے بید کا درخت بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی ایک دور وہ تھا کہ اُس میں انگور جیسا قیمتی اور لذیذ پھل لگتا تھا، اب وہ درخت بھی نہیں اُگتا جس میں کوئی پھل نہیں لگتا، گویا نمو کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی۔

۶ - وہ قوم بے وطنی میں بکھر کر جگہ جگہ جا بیٹھی۔ اس کی زبان بھی ختم ہو گئی۔ اس میں قومی دم خم بھی باقی نہ رہا اور اس کا وطن بھی نابود ہو گیا۔

نوا سے بہ ظاہر مراد قومی خصائل اور آشیاں سے مراد وطن ہے۔

۷ - شمع بجھ گئی، پروانہ اُس کا ماتم کر رہا ہے۔ جب میں اس قوم کی سرگزشت پر غور کرتا ہوں تو میرا بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

یہودیوں کو یہ تمام مصیبتیں اس لیے پیش آئیں کہ ان کا قومی مرکز نہ رہا جو جمعیت اور وحدت کا ذریعہ تھا۔

مسلمان سے خطاب | ۱ - اے مسلمان! تیرا جسم جورِ فلک کی تلوار سے زخمی ہو رہا ہے۔ تو شک و شبہہ اور وہم و گمان

کا قیدی بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تو اپنے مرکز سے غافل ہو گیا اور جمعیت کے اس وسیلے کی طرف سے آنکھ بند کر لی۔ تو اپنے لباس کو جامۂ احرام بنائے اور شام کے غبار سے صبح پیدا کرے۔ یعنی کعبے کی مرکزیت بحال کر۔ اس کے بعد ہی تیری پریشانیوں اور مصیبتوں کی شام ختم ہو گی اور امید و آرزو کی صبح طلوع کرے گی۔

۲۔ اپنے باپ دادا کی طرح سجدہ ریزی اور عبادت گزاری میں غرق ہو جا۔ اس طرح غرق ہو جا کہ تو خود سراپا سجدہ اور عبادت بن جائے۔

مراد یہ ہے کہ پورا دینی نظام اختیار کرے۔ وہی خدائی نظام ہے۔ اسی کی پابندی انسانوں کو فرمانبردار بندے بناتی ہے۔ اسی کی بدولت خدا کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

۳، ۴۔ دیکھ! ابتدائی زمانے کے مسلمانوں نے عبودیت، بندگی اور فرمانبرداری کا ایسا نقشہ پیش کیا کہ وہ زمانہ بھر کے لیے فخر و ناز کا سامان بن گئے۔ انھیں وہ درجہ حاصل ہوا جس سے اونچا درجہ اس دنیا میں کسی کو نہ ملا۔ انھوں نے خدا کی راہ میں پاؤں کانٹوں سے زخمی کر لیے اور پاؤں کو دستار کے گوشے میں باندھ لیا۔ لوگ امتیاز کے لیے ایک پھول دستار پر لگاتے ہیں، لیکن ابتدائی دور کے مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیے، وہ اس درجہ پُرفخر تھے کہ پورا باغ ان کی دستار کے لیے سامانِ زینت و امتیاز بن گیا۔

آخر میں مضمون کی مناسبت کا تقاضا ہے کہ اقبال نے مولانا اکبر الٰہ آبادی کو کعبے کی مرکزیت کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اسے بھی یہاں نقل کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں:

"کعبہ و کاشی کے سوا کوئی اور مقام بھی ہو گا مگر خدارا آج کل صرف کعبہ ہی بتائیے، ورنہ مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس وقت اسلام کا دشمن سائنس نہیں (جیسا کہ بعض لوگ نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں، اسلام کی پوزیشن سائنس کے خلاف نہایت مضبوط ہے) مگر اس کا دشمن یورپ کا ٹیریٹوریل نیشنلزم (علاقائی قومیت) ہے، جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اُکسایا۔ مصر میں "مصر مصریوں کے لیے" کی آواز بلند کی اور ہندوستان کو پان انڈین ڈیموکریسی (کل ہند جمہوریت) کا بے معنی خواب دکھایا۔ آپ تو گروہ بندی پر طرّہ زن ہوتے ہیں بلکہ ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے: "مذہب کیا ہے، گروہ بندی ہے فقط" مذہب اسلام کا ایک نہایت ضروری پہلو قومیت ہے، جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے۔ اگر آپ کے نزدیک مذہب کا مقصد صرف گروہ بندی ہے اور کچھ نہیں جیسا کہ مذکورۂ بالا مصرع سے معلوم ہوتا ہے تو آپ کے قلم و زبان سے یہ بات زیب نہیں دیتی کہ کعبہ و کاشی کے سوا

کوئی اور مقام بھی ہے۔ آپ کے نزدیک تو کعبے کے سوا کوئی اور مقام نہ ہونا چاہیے[۱]۔

اکیسواں باب

حفاظت و اشاعتِ توحید

اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حقیقی جمعیت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی،
جب تک قومی نصب العین مضبوطی سے تھام نہ لیا جائے اور اُمت محمدیہ کا
نصب العین توحید کی حفاظت و اشاعت ہے۔

تمہید فرماتے ہیں کہ زندگی صرف مقصد و نصب العین کی بنا پر قائم رہتی ہے۔ مقصد و نصب العین کے لیے جد و جہد ہی قوموں کی رگوں میں خون کو گرم رکھتی ہے۔ اے مسلمان! اگر تُو اپنے نصب العین سے غافل ہو جائے گا تو منزل سے بہت دُور جا پڑے گا۔ ملّتِ اسلامیہ کا نصب العین توحید کی حفاظت و اشاعت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اس کائنات کو تمام آلودگیوں سے پاک کر دیا تھا۔ دنیا ان کے دین سے وابستہ ہے۔ انسان ہمیشہ بُت پرستی کرتا رہا۔ اب اُس نے رنگ، نسل اور مُلک کے بُت کھڑے کر لیے ہیں۔ مسلمان کو چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اسوے کی پیروی کرتے ہوئے ان تمام بتوں کو ملیامیٹ کر ڈالے۔

اگر ایسا نہ کیا اور قیامت کے دن رسول اللہ صلعم نے باز پرس کی کہ جو پیغام تیرے حوالے کیا گیا تھا، تو نے دوسروں تک کیوں نہ پہنچایا؟ بتا، اُس وقت کیا جواب دے گا؟

مقصد و نصب العین **مہمیز** ۔ کانٹا ۔ ایڑ ۔ لوہے کی وہ میخ جو سواروں کی ایڑی میں لگی ہوتی ہے اور اس سے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہیں۔

شبدیز ۔ سیاہ رنگ گھوڑا۔ دراصل یہ خسرو پرویز شہنشاہِ ایران کے گھوڑے کا نام تھا، جس کا رنگ سیاہ تھا۔

جاذب ۔ جذب کرنے والا۔ کھینچنے والا۔

فرسنگ ۔ تین میل کا فاصلہ۔

امّہات ۔ اُم کی جمع ۔ مائیں ۔ یہاں مراد عناصر ہیں۔

---

[۱] "اقبال نامہ" حصّہ دوم ص۵

ادوار۔ دور کی جمع۔ گردشیں۔ چکّر۔

ھَوٰی۔ اشارہ سورۂ نجم کی اس آیت کی طرف ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی o اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے۔ یہ تو وحی ہے بھیجی ہوئی۔

مَا غَوٰی۔ سورۂ نجم کی ایک اور آیت:

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی۔ بھٹکا نہیں تمہارا رفیق اور نہ بے راہ چلا۔

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوَ۔ نہیں موجود سوا اُس کے۔

۱۔ اے مخاطب! میں تجھے کائنات کی زبان سکھاتا ہوں۔ وہ حروف و الفاظ کی زبان نہیں، بلکہ زندگی کے اعمال کی زبان ہے۔

۲۔ جب زندگی کسی مدّعا سے وابستہ ہو جاتی ہے تو ایک پختہ، موزون اور برمحل مطلع بن جاتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی سستی اور ڈھیل نہیں رہتی اور مضمون بہت عمدہ و مفید ہوتا ہے، جسے سُنتے ہی بے اختیار مرحبا اور احسنت کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ زندگی کو بھی برجستہ اور موزون بنانے کے لیے لازم ہے کہ اسے کسی مدّعا سے وابستہ کیا جائے۔ اوپر بتا چکے ہیں کہ زبان الفاظ و حروف نہیں بلکہ اعمال ہیں۔ مدّعا پیش نظر ہوگا تو اس کے لیے جد و جہد شروع ہو جائے گی۔ یہی عمل ہے، یہی کائنات کی زبان ہے۔

۳۔ اگر مدّعا ہماری ایڑ بن جائے تو ہمارا گھوڑا آندھی کی طرح چلنے لگے۔

۴۔ مدّعا زندگی کے حفظ و بقا کا بھید ہے۔ اسی کی برکت سے زندگی کی قوتوں کی بیقراری دُور ہوتی ہے اور وہ ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ زندگی کی قوتوں کی عام کیفیت پارے کی سی ہے، لیکن مدّعا اُس پارے میں بستگی اور یکجائی پیدا کر دیتا ہے۔ مدّعا سامنے نہ ہو تو قوتیں پارے کی طرح بکھری رہیں گی۔ مدّعا سامنے آ جائے گا تو سب اکٹھی ہو کر اس کے لیے جدّ و جہد شروع کر دیں گی۔

۵، ۶۔ جب زندگی ایک مقصد سے آشنا ہو جاتی ہے تو اس دُنیا میں اسے حاصل کرنے کے جتنے اسباب ہیں انھیں نظم و ضبط میں لے آتی ہے۔ اپنے آپ کو اُس مقصد کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ اس کے حصول میں جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے، اس سے کام لیتی ہے۔ جو معاون بن سکتی ہے، اسے چُن لیتی ہے۔ جو مضر نظر آتی ہے، اسے ٹھکرا دیتی ہے۔

۷۔ زندگی کے عام حالات پر نظر ڈالو تو کوئی بھی کام بے مقصد نظر نہ آئے گا۔ مثلاً ملاح سمندر میں جہاز چلاتا ہے تو صرف اس مقصد سے کہ ساحل پر پہنچ جائے۔ مسافر راستے طے کرتے ہیں تو اس لیے کہ منزل پر فائز ہوں۔

۸ - پروانے کے دل پر ذوقِ سوز نے ایک داغ لگا رکھا ہے، اسی لیے وہ چراغ کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جل مرتا ہے:

۹ - قیس صحرا میں اس لیے آوارہ و سرگرداں پھر رہا ہے کہ اسے لیلیٰ کے محمل کی تلاش ہے۔

۱۰ - اگر ہماری لیلیٰ شہر ہی میں رہنے لگے اور صحرا کی طرف نہ جائے تو ہمارے پاؤں کبھی صحرا کی طرف نہ اٹھیں۔

۱۱ - غرض کوئی بھی عمل پیشِ نظر لاؤ اور غور کرو، صاف معلوم ہو جائے گا کہ کسی نہ کسی مقصد کو اس کے تعلق میں جان کی حیثیت حاصل ہے۔ عمل کی سرگرمی و وسعت کا فیصلہ مقصد ہی کی بنا پر ہوتا ہے، یعنی مقصد جتنا ضروری اور اہم ہوگا، اتنا ہی عمل تیز و سرگرم اور وسیع ہوگا۔ اس کے علاوہ عمل کی اچھائی بُرائی کا فیصلہ بھی مقصد ہی کی بنا پر ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی دولتمند کسی قومی ضرورت میں سو روپیہ دیتا ہے تو یہ فعل باعتبار کیفیت اچھا، لیکن مقدار کا معاملہ قابلِ غور ہے گا کہ آیا اس کی دولت کے لحاظ سے یہ صرف کافی تھا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی ذاتی راحت کے لیے رقم خرچ کرتا ہے تو عمل کی اچھائی کا معاملہ راحت کے جائز ہونے کی بنا پر ہوگا۔ یہ بالکل درست ہے کہ عمل کے کیف و کم کا پیمانہ صرف مقصد ہے:

۱۲ - ہماری رگوں میں خون کی جو گردش ہے، وہ حصولِ مدعا کے لیے سرگرمی ہی کی بنا پر تیز ہوتی ہے:

۱۳ - مدعا کی حرارت سے زندگی اپنے آپ کو جلا دیتی ہے اور لالے کی طرح آگ فراہم کر لیتی ہے:

اپنے آپ کو جلا دینے سے حقیقتاً جلا دینا مقصود نہیں بلکہ اس اسلوبِ بیان سے سعی و کوشش کی انتہائی سرگرمی کا تصور پیدا کرنا منظور ہے۔

۱۴ - مدعا سازِ ہمت کے لیے مضراب ہے۔ یہی مرکز ہے جو ہر قوتِ عمل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، یعنی حصولِ مدعا کے لیے انسان کی تمام کوششیں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں:

۱۵ - مقصد ہی قوم کے ہاتھ پاؤں میں حرکت پیدا کرتا ہے اور بیک وقت سینکڑوں آنکھیں اسی کے اشارے پر گردش کرنے لگتی ہیں۔

۱۶ - اے مخاطب! تو بھی اپنے مقصد کے محبوب کے لیے دیوانگی اختیار کر اور مقصد کو شمع بنا کر پروانے کی طرح اس کا طواف شروع کر دے:

۱۷، ۱۸، ۱۹ - عجم کے نغمہ ساز یعنی مشہور شاعر ملک قمی نے ایک نہایت اچھا ترانہ سنایا ہے، گویا حقیقت کا زخمہ تار پر لگایا ہے۔ فرماتے ہیں: جب تک مسافر اپنے تلوے سے کانٹا نکالے، محمل نظروں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ اگر تو ایک دم کے لیے بھی غافل ہوگا تو منزل سے سینکڑوں فرسنگ دور ہو جائے گا۔

ان شعروں میں ملک قمی کے مندرجہ ذیل شعر کا مضمون باندھا گیا ہے:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر　　یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

میں اپنے پاؤں سے کانٹا نکالنے لگا۔ قافلہ چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ نگاہوں سے چھپ گیا،
یعنی بہت دُور نکل گیا۔ گویا ایک لمحے کے لیے غفلت ہوئی اور میں اتنی دُور پیچھے رہ گیا کہ سینکڑوں
سال راستہ طے کرنے میں لگیں گے ؛

مسلمان کا فرض ۱ - یہ پُرانا پیکر، جس کا نام دنیا ہے، عناصر کے ربط و ضبط سے بنا ہے اور اس میں ابتدا ہی سے لاقفا کا عمل جاری ہے ؛

۲ - اس نے سینکڑوں نیستاں بوئے اور ان میں سے ایک نالہ پیدا کیا۔ سینکڑوں باغوں کا خون کر کے ایک لالہ اُگایا ؛
مطلب یہ کہ مختلف چیزیں بنتی اور بگڑتی چلی آئیں، جو خلقِ خدا کے لیے کار آمد نہ رہیں مٹ
گئیں۔ جو کار آمد تھیں، ان میں بھی تغیرات پیدا ہوتے رہے ؛

۳ - نقشوں کے خاکے تیار ہوئے اور بٹھائے گئے، پھر انھیں مٹا دیا گیا۔ اے مسلمان! بناؤ بگاڑ کا یہ سلسلہ اس لیے جاری رہا کہ زندگی کی تختی پر تیرا نقش بٹھایا جا سکے ؛

۴ - جانوں کے کھیت میں آہ و فغاں کی کاشت جاری رہی، یہاں تک کہ ایک اذان کی صدا نے فروغ پایا ؛

۵، ۶ - یہ دنیا مدت تک احرار سے لڑتی رہی، اسے جھوٹے معبودوں سے محبت تھی، آخر ایمان کا بیج مٹی میں بویا گیا۔ وہ اُگا، بڑھا، پھولا پھلا اور اے مسلمان! تیری زبان سے اس دنیا نے توحید کا کلمہ پڑھا ؛

۷ - تو لا الٰہ یعنی کلمۂ توحید کی حقیقت جانتا ہے؟ جہان کے ہر دور و گردش کا مرکزی نقطہ لا الٰہ ہے اور اس جہان کے کام کی انتہا بھی لا الٰہ ہی ہے۔

۸ - آسمان اُسی کے زور سے گھوم رہا ہے۔ سورج کو اُسی کی بدولت استواری اور آب و تاب حاصل ہے،

۹ - سمندر نے لا الٰہ ہی کی چمک دمک سے موتی پیدا کیے اور دریا کے اندر موج کو اسی نے تڑپ سے بہرہ یاب کیا ؛

۱۰ - مٹی لا الٰہ کی بادِ نسیم سے پھول بن جاتی ہے اور مُٹھی بھر پَر اس کے سوز سے بلبل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ؛

۱۱ - انگور کی رگوں میں اُسی کے سوز کی بدولت آگ گردش کر رہی ہے۔ صراحی کی مٹی میں بھی اسی کے سوز کی بدولت چمک دمک ہے۔

۱۲ - عالمِ ہستی کے ساز میں لا الٰہ کے نغمے سوئے پڑے ہیں۔ اے زخمے والے ہاتھ! آج عالمِ ہستی کا ساز تیری تلاش میں ہے تاکہ تو زخمہ لگائے اور سوئے ہوئے نغمے جاگ اٹھیں،

۱۳، ۱۴ - تیرے پاس سینکڑوں نغمے ہیں جو خون کی طرح تیرے بدن میں دوڑ رہے ہیں۔ اٹھ اور اس کے تار کو مضراب سے چھیڑ دے کیونکہ تکبیر ہی میں تیری ہستی کا راز چھپا ہوا ہے اور جان لے کہ تیرا اصل مقصد توحید کی حفاظت و اشاعت ہے۔

۱۵ - اگر تو مسلمان ہے تو تجھے اُس وقت تک ایک دم کے لیے بھی آرام نہ لینا چاہیے جب تک زمانہ بھر سے حق

کی آواز نہ سننے لگے۔

ملتِ اسلامیہ کا مقام ۱، ۲۔ اے ملتِ اسلامیہ! کیا قرآن مجید کی وہ آیت تجھے معلوم نہیں، جس میں مجھے اُمّتِ عادل کا خطاب ملا۔ زمانے کے چہرے کی رونق اور تازگی تیرے ہی دم سے ہے۔ تُو اس دنیا میں تمام قوموں کے لیے گواہی دینے والی ہے۔

اس میں اشارہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف ہے :-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا	اور ہم نے تمھیں نیک ترین اور عادل ترین اُمّت
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ	ہونے کا درجہ عطا فرمایا تاکہ تمام انسانوں کے لیے گواہی دینے
شَهِيْدًا ؕ ۱۴۳ (بقرہ)	والے ہو اور تمھارے لیے اللہ کا رسول گواہی دینے والا ہے

۳۔ جو نکتہ شناس ہیں، انھیں دعوتِ عام دے اور اُمّی نبیؐ کے علوم سے آگاہ کر۔

۴۔ وہ اُمّیؐ، جس کی گفتگو قرآنی ارشاد کے مطابق نفس کی خواہش سے پاک تھی اور جو کچھ اس کی زبانِ مقدس پر جاری ہوتا تھا، وحی کے ذریعے سے پہنچا ہوا آسمانی پیغام تھا۔ وہ اُمّیؐ جس کے ارشادات ما اوحیٰ کی شرح تھے یعنی ان میں بے راہی کی کوئی بات نہ تھی۔

۵۔ اُس اُمّی نبیؐ نے کائنات کی نبض اپنے دستِ مبارک میں لی تو زندگی کی پختگی کے تمام بھید کھول کر رکھ دیے۔

۶۔ اس چمن میں لالوں کی قبا پر جتنی آلودگیاں پرانے زمانے سے چھائی ہوئی تھیں، ان سب کو دھو کر صاف کر دیا۔

مطلب یہ کہ اس دنیا میں انسانوں نے گمراہی اور نامرادی کے جتنے مذہب سوچے اور اختیار کیے، ان سب کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ہدایت کو گمراہی سے، سعادت کو نامرادی سے، نور کو ظلمت سے الگ کر دیا اور کسی کے لیے دونوں میں تمیز مشکل نہ رہی۔

۷۔ اس دنیا میں زندگی اُسی اُمّی نبیؐ کے دین سے وابستہ ہے اور یاد رکھو کہ اس کی شریعت اور اس کے مقرر کیے ہوئے قاعدوں کے بغیر جینا ممکن ہی نہیں۔

۸۔ اے ملت! اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید تیرے پاس ہے۔ اس کے نور سے فائدہ اٹھا اور عمل کے میدان میں چلنا شروع کر دے۔

رنگ، ملک اور نسل کے بت ۱، ۲، ۳۔ انسان کا شیوہ ابتدا سے یہ رہا کہ بت بنائے اور انھیں پوجے۔ وہ ہر گھڑی کسی نئے بت کی تلاش میں رہتا ہے۔ اب اُس نے پھر آزر کا طریقہ اختیار کر لیا ہے اور نئے بت بنا کر کھڑے کر دیے ہیں۔ وہ بہت خون بہا کر خوشی سے ناچتے ہیں۔ ان کے نام ہیں "رنگ"، "ملک" اور "نسل"۔ ملک کا بت یورپ نے پیدا کیا۔ رنگ کا بت بھی یورپ ہی سے آیا، اگرچہ ہندوستان کے آریہ پہلے ہی سے اسے پوج رہے تھے۔ نسل کا بت بھی دورِ حاضر ہی کی پیداوار ہے۔ ان بتوں نے عالمِ انسانیت کو چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور جگہ جگہ ایک دوسرے

سے دشمنی کی آگ بھڑکادی۔ جنوبی افریقہ میں جو دردناک حالات رنگ اور نسل کے بُت نے پیدا کیے، ان پر دنیا ماتم کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ جیسے ملک بھی اس لعنت سے پاک نہیں، جو حریت اور آزادی میں سب سے آگے سمجھے جاتے ہیں

ذرا اسلام کی دعوت مساوات و اخوت پر غور کیجیے، کیا تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے کہ کسی اسلامی خطے میں آج تک چھوت چھات، ذات پات یا رنگ و نسل کا کوئی سوال پیدا ہوا ہو؟ اسلام نے آج سے چودہ سو سال پیشتر یہ اور اس قسم کے دوسرے تفرقہ انگیز مسئلے ختم کر دیے تھے لیکن مغربی اور مشرقی دنیا کے مدّعیان تہذیب و علم آج بھی اسی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ لطف یہ کہ انھیں دین سے چنداں دل دلبستگی نہیں، گویا مذہبی تعصب کا سوال سامنے آ ہی نہیں سکتا۔

۴۔ اقبال نے کیا خوب فرمایا کہ دیکھو، ان نامراد بتوں کے پاؤں میں انسانیت بھیڑ بکری کی طرح بیدردی سے ذبح کر ڈالی گئی۔

۵، ۶۔ اے ملّتِ اسلامیہ! تُو نے ابراہیمؑ کی صراحی سے شراب پی ہے۔ تیرے خون میں اسی شراب کی حرارت دوڑ رہی ہے۔ اُٹھ اور اس باطل کا سر جس نے حق کا لباس پہن رکھا ہے، لاموجود الا ھو کی تلوار چلا کر قلم کر دے۔

۷۔ اس دنیا کے طول و عرض میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ اُٹھ اور اجالے کا سر و سامان کر دے۔ جو دین تجھ پر کامل ہوا، اسے چپے چپے میں پھیلا دے:

دوسرے مصرع میں سورۂ مائدہ کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔	آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمھارے لیے پسند کر لیا کہ دین اسلام ہو:

۸، ۹۔ میں تو شرم کے مارے کانپ اٹھتا ہوں جب سوچتا ہوں کہ قیامت کے دن۔ وہ پاک ذات جو ہماری کائنات کی آبرو تھی، اے ملّت! تجھ سے پوچھے گی کہ تجھے ہماری پیش گاہ سے ایک پیغام دیا گیا تھا، تُو نے اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچایا؟

بائیسواں باب

نظامِ عالم کی تسخیر

اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کر لینے ہی پر قومی زندگی کی توسیع موقوف ہے۔

تمہید | اقبال فرماتے ہیں: انسان کی تخلیق کا مقصد ہی یہ تھا کہ نظامِ عالم میں جتنی قوتیں کار فرما ہیں، انھیں قابو میں لائے یہ مقصد کسی بھی حال میں نگاہوں سے اوجھل نہ رہنا چاہیے۔ ساقی نامے ہی مسلمان کو دعوت دیتے ہیں کہ تو افیون کھا کر سو گیا ہے اور اس عالمِ اسباب کو ہیچ سمجھتا ہے۔ اُٹھ، آنکھیں کھول اور اپنی ممکنات کا امتحان لے۔ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق نیک بندوں کی میراث ہے۔ اس کے بعد پورا ایک بند تسخیر کی مختلف صورتوں ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

دعوتِ تسخیر | عرصہ۔ ڈھال۔ سپر۔

سنداں ۔ اہرن۔

فرہ ۔ زیادتی۔ غلبہ۔

شگرف ۔ زیبا۔ خوب۔

شیرِ برف ۔ برف کے وہ شیر جو بچے راستوں پر بنا دیتے ہیں اور گھوڑے انھیں دیکھتے ہی خوف زدہ زدہ ہو کر بھاگتے ہیں۔

سنگِ زور ۔ ورزش کرنے کا پتھر۔ ایران کے پہلوان ایک پتھر سے کر ورزش کی غرض سے گھمایا کرتے تھے۔ اسے سنگِ زور کہتے تھے۔

دُلدُل ۔ گھوڑا۔ اصل میں اُس گھوڑے کا نام تھا جو مقوقس حاکمِ مصر نے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں بہ طورِ نذر بھیجا تھا۔

پہناور ۔ فراخ ۔ چوڑا۔

اندام گرفتنِ کار ۔ کام کا آراستہ ہونا۔

مابارہ ۔ مہار۔ نکیل۔

آغوش۔ لونڈی۔ کنیز۔
اَنفُسُ۔ نفس کی جمع۔
آفاق۔ افق کی جمع۔
علم اسماء۔ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف:
وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا۔ اور آدمؑ نے تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام (حقائق) معلوم کر لیے

۱۔ اے مسلمان! تُو نے ان دیکھی ذات سے بندگی کا عہد باندھ رکھا ہے، یعنی تُو غیب پر ایمان لا چکا ہے اور تیری حیثیت وہی ہے جو سیل کی ہوتی ہے اور وہ کناروں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔

۲۔ تُو درخت کی طرح باغ کی مٹی سے نکل کر سربلند ہو۔ دل ذاتِ غائب سے پیوستہ رکھ اور جو حاضر و موجود ہے، اُس سے جنگ شروع کر دے۔

غائب سے اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور حاضر سے کائنات کی طرف ہے۔ کائنات سے لڑنے کا مقصد یہ ہے کہ اسے زیرنگیں کیا جائے۔

۳۔ حاضر کی ہستی غیب کی تفسیر ہے اور اسے مسخر کر لینے کے بعد غیب کی تسخیر کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے اور حاضر کی تسخیر غیب کی تسخیر کا دیباچہ ہے:

۴۔ خدا کے سوا جو موجودات ہے، وہ اسی لیے ہے کہ اسے تسخیر کیا جائے اور اس کا سینہ تیروں کا نشانہ ہے:

۵۔ اللہ تعالیٰ نے کُن کہا اور یہ دنیا پیدا ہو گئی۔ اس لیے پیدا ہوئی کہ تیرا پیکان اہرن کو توڑتا ہوا نکل جائے، یعنی ماسوا اہرن ہے اور انسان کا پیکان اس لیے ہے کہ ماسوا کو تسخیر کیا جائے۔

۶۔ رشتہ ایسا چاہیے، جس میں گرہیں پر گرہیں پڑی ہوئی ہوں تاکہ اسے کھولنے میں زیادہ لطف آئے۔

۷۔ تُو غنچہ ہے؟ اپنے آپ کو باغ سمجھ۔ تُو شبنم ہے؟ سورج کو قبضے میں لا۔

۸۔ اگر تُو یہ زیبا کام انجام دے سکے تو تیرا گرم سانس برف کے شیر کو پگھلا سکتا ہے۔

۹۔ جس نے محسوسات کو تسخیر کر لیا، وہ ایک ذرّے سے دنیا تعمیر کر سکتا ہے۔

۱۰، ۱۱۔ وہ جس کے تیر سے قدسیوں کا سینہ زخمی ہو گیا، اُس نے سب سے پہلے آدمؑ کو فتراک میں باندھا۔ اس نے محسوس کی گتھی سب سے پہلے سلجھائی، پھر موجود کی تسخیر میں حوصلہ و ہمت کی آزمائش کی۔

۱۲۔ یہ پہاڑ، صحرا، دشت، دریا، تری، خشکی کیا ہیں؟ صاحب نظروں کے لیے تعلیم کی تختیاں ہیں۔

۱۳۔ اے مسلمان! تُو افیون کے اثر سے سو گیا ہے۔ اس دنیا کو، جو عالم اسباب ہے، ہیچ کہتا ہے۔

۱۴۔ اُٹھ اور خمار آلود آنکھیں کھول۔ اس عالم مجبور کو ہیچ نہ کہہ۔

۱۵- اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان کی ذات توسیع پائے اور اس کے ممکنات کی آزمائش کی جا سکے یعنی دیکھا جا سکے کہ اس میں کتنی قوت اور کتنی صلاحیت ہے۔

۱۶- زمانہ تیرے بدن پر بار بار تلوار یں مار رہا ہے تاکہ تو دیکھ سکے، تیرے بدن میں خون ہے یا نہیں۔

۱۷- سینے کو ورزش کے پتھر سے زخمی کرے اور اپنی ہڈیوں کی آزمائش کر۔

۱۸- اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ دنیا نیکوں کا حصہ ہے۔ اس کا جلوہ مومن کی آنکھ کے حوالے کیا گیا۔ یہاں اس آیت کی طرف اشارہ ہے:۔

اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔ بیشک یہ زمین میرے نیک بندوں کی وراثت ہے۔

۱۹- یہ دنیا قافلے کے گزرنے کا راستہ ہے، لیکن مومن کے پاس جو کچھ ہے، اس کی جانچ پرکھ کے لیے یہ کسوٹی ہے۔

۲۰- اسے قابو میں لا تاکہ یہ تجھے قابو میں نہ لے آئے۔ اگر اسے موقع مل گیا تو یہ تجھے شراب کی طرح مٹکے میں ڈال کر رکھے گی۔

نیابت حق کے مقدمات ۱،۲- تیری فکر کے گھوڑے کو طوطی کے پر لگے ہوئے ہیں اور اس کا قدم آسمان کی وسعت کے برابر ہے۔ اسے زندگی کی ضرورتیں چلا رہی ہیں۔ اگرچہ خود زمین سے وابستہ ہے، لیکن آسمان کی پیمائش کر رہا ہے:

۳- اس کا مقصد یہ ہے کہ نظام کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرے اور تیری ہنر مندیوں کے جوہر درجۂ کمال پر آشکارا ہو جائیں۔

۴- اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کو دنیا میں خدا کی نیابت مل جائے گی اور عناصر پر اس کی حکمرانی کا سلسلہ مستحکم ہو جائے گا:

عناصر پر حکم چلانے اور کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنے کا مطلب کسی تشریح کا محتاج نہیں، متعدد امور کے متعلق خود اقبال نے آئندہ اشعار میں اشارے کیے ہیں۔ مغربی قوموں نے ایجادات کا جو ہنگامہ بپا کر رکھا ہے، یہ بھی کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنے ہی کی ایک شکل ہے، یہاں تک کہ اب ان کی ایجادات فضائے بسیط میں پہنچ رہی ہیں۔ چاند، سورج اور دوسرے ستاروں تک رسائی کی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ اقبال کے عہد میں بھی بعض حیرت انگیز ایجادات ہو چکی تھیں، لیکن ان کے بعد جو کچھ ہوا، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان اور خصوصاً مسلمان کو اقبال نے جن ضروری کاموں کی طرف متوجہ کیا تھا، ان کی اہمیت کا درجہ کتنا بلند تھا۔

۵- اے مخاطب! تیری تنگی اس دنیا میں پھیلاؤ اختیار کرے گی اور تیرا کام آراستہ ہو جائے گا۔

مراد یہ ہے کہ تو بجائے خود نہ زیادہ قوی ہے اور نہ تجھے دور دور کی چیزوں تک دسترس ہے۔ اس صورت حال کو تنگی سے تعبیر کیا، لیکن نظام کائنات کی تسخیر کے سلسلے میں جو کچھ کرے گا، وہ تیری قوت اور دسترس کو عالمگیر بنا دے گا اور یہی آرائش کار ہے:

۶- تو ہوا کی پشت پر سوار ہو اور اس سانڈنی کے نکیل ڈال دے۔

۷ - پہاڑوں کے خون سے ہاتھ رنگ لے اور موتی کی آب و تاب کی ندی سمندر سے نکال، یعنی پہاڑوں اور دریاؤں میں قدرت کے پوشیدہ خزانے تلاش کر۔

۸ - ایک ایک فضا میں سینکڑوں جہان چھپے ہوئے ہیں۔ ایک ایک ذرّے میں سورج پنہاں ہیں۔

۹ - اس کی کرن کی روشنی سے اُن دیکھے کو دیکھ لے اور جو بھید ابھی تک سمجھے نہیں گئے، انھیں کھول دے تاکہ سب سمجھ لیں۔

۱۰ - تو دنیا کو روشن کرنے والے سورج سے چمک دمک لے لے۔ پانی کے سیل سے وہ بجلی پیدا کر جو گھروں کو روشن کر دے۔

۱۱، ۱۲ - یہ اجرام جو ثابت اور سیّار کہلاتے ہیں یعنی ستاروں کے دو گروہ جن میں سے ایک کو ٹھہرا ہوا اور دوسرے کو پھرنے والا قرار دیتے ہیں۔ آسمان ان کا وطن ہے۔ زمانۂ قدیم کی قومیں انھیں کو معبود سمجھ کر پوجا کرتی تھیں۔ اے انسان! اگر تو اپنی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرے تو یہ سب تیری لونڈیاں، کنیزیں، خدمتگار اور غلام ہیں۔

یہ محض دعوٰی نہیں، انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کائنات کی کوئی شے اس سے اچھی تو کیا، اس کے برابر بھی نہیں لیکن اشرفیت اور آقائی کوئی عطائی خلعت نہیں بلکہ انسان کے حسنِ عمل سے یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ اقبال حسنِ عمل کا راستہ بتا رہے ہیں اور وہ یہ کہ انسان خدا کی فرمانبرداری کے راستے پر چلتا ہوا کائنات کی قوتوں پر قابو پائے۔ یہی اس کی تخلیق کا مقصد و مدعا تھا۔

۱۳ - تو ہمت و حوصلہ سے کام لے۔ تلاش جاری رکھ اور تدبیروں سے تلاش کو نتیجہ خیز بنا۔ تیرا نصب العین یہ ہے کہ انفس اور آفاق کو مسخر کرے یعنی اس کائنات کی مادّی اور معنوی قوتوں پر قابو پائے۔

۱۴ - اپنی آنکھ کھول اور اشیاء کی حقیقت پر نظر ڈال۔ تیری نظر میں اتنی تیزی اور گہرائی ہونی چاہیے کہ شراب کے پردے میں نشہ دیکھ سکے۔

علم اسمار کا مدعا | ۱ - تجھے معلوم ہے کہ اشیاء کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ کر لیا جائے تو نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ یہ نکلتا ہے کہ کمزور آدمی طاقتوروں سے خراج وصول کرتے ہیں۔

۲، ۳ - یہ کائنات بظاہر سادہ نظر آتی ہے لیکن معنویت سے خالی نہیں۔ اس وہم میں مبتلا نہ ہو کہ یہ پرانا ساز اب اس قابل نہیں رہا کہ اسے چھیڑ کر نغمہ پیدا کیا جا سکے۔ اس سے ایسے نغمے نکالے جا سکتے ہیں جن میں بجلی کی طاقت ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اسے ہنرمندی سے بجایا جائے اور بجانے والا خود مضراب بن کر اس کے تار چھیڑے۔

۴ - تو موبکت کے خطاب کا مقصود ہے یعنی تجھے نظر سے صحیح کام لینے کی تاکید کی گئی ہے۔ پھر تو اندھوں کی طرح یہ راستہ کیوں طے کرتا ہے؟

۵، ۶ - جو قطرہ اپنے آپ کو روشن رکھنے کا راز جانتا ہو، وہ انگور کی رگوں میں شراب اور پھول کی پنکھڑیوں پر شبنم بن جاتا ہے۔

پھر سمندر میں پہنچتا ہے تو موتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے جوہر ستارے کی طرح چمک اٹھتے ہیں:۔

۷۔ تو صبا کی طرح پھولوں کی ظاہری صورت ہی کے اردگرد چکر کاٹنے میں نہ لگا رہ۔ اس باغ کی حقیقت میں بھی غوطہ لگا

۸،۹۔ جن لوگوں نے اشیاء پر کمندیں پھینکیں اور ان کی حقیقت معلوم کر لی، انھوں نے بجلی اور حرارت سے چلنے والی سواریاں تیار کر دیں۔ وہ حرف کو پرندے کی طرح پرواز میں لے آئے اور ساز سے مضراب کے بغیر نغمے پیدا کرنے لگے:

ظاہر ہے کہ ان سے مقصود ریل، تار برقی، جہاز وغیرہ ہیں۔ اقبالؔ نے آخری شعر کے متعلق خود واضح کر دیا ہے کہ یہ مرزا غالبؔ سے لیا گیا ہے، البتہ الفاظ بدل دیے ہیں۔ مرزا کا شعر یہ ہے:

نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند ؎ حرف چوں طائر بہ پرواز آورند

یہ مرزا کی اس مثنوی سے لیا گیا ہے، جو سر سید احمد خان مرحوم کی تصحیح کردہ آئین اکبریؔ پر بطور تقریظ لکھی گئی تھی اور کلیات فارسی میں دسویں مثنوی ہے:

۱۰ تا ۱۳۔ اے مسلمان! تیری سواری کا گدھا زندگی کے مشکل راستے کی وجہ سے لنگڑا ہو گیا ہے اور تو زندگی کی رزم و پیکار کے ہنگامے سے بالکل ناواقف ہے۔ تیرے ہم سفر منزل کی طرف بڑھ گئے۔ انھوں نے حقیقت کی لیلیٰ کو محمل سے نکال لیا۔ تو صحرا میں قیس کی طرح خستہ، عاجز، بے بس اور آوارہ پھر رہا ہے۔ اس حقیقت پر غور کر کہ علم اسما ہی کی بنا پر آدمی کی عزت و حرمت ہے اور اشیاء کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ کر لینے ہی پر آدمی کی حفاظت موقوف ہے، جس طرح شہر کی حفاظت فصیل کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

تئیسواں باب

قومی تاریخ کا مقام

اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ قومی زندگی کمال پر اُس وقت پہنچتی ہے جب قوم فرد کی طرح اپنے اندر خودی کا احساس پیدا کر لیتی ہے۔ اس احساس کی پیدائش اور تکمیل کا انتظام قومی روایات کی حفاظت سے ہو سکتا ہے۔

تمہید | اقبالؔ نے ابتدا میں یہ بتایا ہے کہ بچّہ کس طرح درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا اپنی ہستی کے احساس تک پہنچتا ہے پھر فرماتے ہیں کہ بالکل یہی کیفیت قوموں کی ہے۔ جب وہ پیدا ہوتی ہیں تو ان کی کیفیت بھی بچّوں کی سی ہوتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں خودی کا احساس رونما ہوتا ہے۔ اس احساس کے پیدا کرنے اور اسے کمال پر پہنچانے میں قومی تاریخ سب سے بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ تاریخ کو قصّہ یا افسانہ نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ قوم کے ماضی کو ہر لحظہ سامنے رکھتی ہے اور ماضی ہی سے حال و استقبال پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی اسی کا نام ہے کہ قوموں میں تسلسل کا احساس تازہ رہے۔ یہ تازگی قومی تاریخ پر موقوف ہے۔

بچّے کے مدارجِ ارتقاء | ترچک۔ ایک قسم کی آتشبازی جسے ہمارے یہاں پھلجھڑی کہتے ہیں۔ جاں نگار۔ روح افروز۔ راحت انگیز۔

۱۔ اے بلند نظر اور حقیقت شناس انسان! تُو نے کبھی بچّے کو دیکھا ہے جو اپنی حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے؟

۲۔ اُسے نزدیکی اور دوری میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ چاندنی میں اسے لٹا دیا جاتا ہے تو اس انداز میں ہاتھ پاؤں مارتا ہے گویا چاند کو پکڑ لینا چاہتا ہے۔

۳۔ وہ ماں کے سوا کسی کو نہیں پہچانتا۔ یا تو روتا ہے یا دودھ پیتا ہے یا سو رہتا ہے۔

۴۔ اس کے کان حرفوں کے اونچا اور نیچا ہونے سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ دروازے کی زنجیر کھڑکا کر شور پیدا کیا جائے تو بچّہ اسی کو نغمہ سمجھ لیتا ہے۔

۵۔ اس کے افکار بالکل سادہ اور اچھوتے ہوتے ہیں۔ اس کی باتوں میں موتی کی سی پاکیزگی پائی جاتی ہے:

۶۔ پھر اس کا شعور ترقی پاتا ہے تو اس کی سمجھ بوجھ کا سرمایہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شے کی حقیقت معلوم کرے۔ وہ پوچھتا

رہے گا: یہ کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ کس طرح ہوئی؟ کہاں سے آئی؟

۷۔ اُس کی فکر کے ورق پر مختلف چیزوں کے نقش بنتے جاتے ہیں۔ وہ ہر وقت اس شغل میں رہتا ہے کہ اپنے سوا جو کچھ ہے، اسے دیکھے اور اس کی حقیقت معلوم کرے۔

۸۔ اگر پیچھے سے کوئی اس کی آنکھیں اچانک بند کرے تو وہ بیقرار ہو جاتا ہے۔

۹ تا ۱۱۔ اس کی ناپختہ فکر زمانے کی ہوا میں اس طرح اُڑتی ہے جس طرح نیا نیا شکاری باز اُڑتا ہے۔ بچہ اس فکر کو شکار کے پیچھے چھوڑ دیتا ہے، پھر اسے واپس لے آتا ہے۔ واضح رہے کہ جب باز کو شکار پر لگایا جاتا ہے تو اس کے پاؤں ایک دوڑی میں بندھے رہتے ہیں تاکہ شکاری جب چاہے، اشارہ کر کے یا ڈور کھینچ کر اسے واپس لے آئے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس طرح باز شکار کو شکاری کے پاس لانے کا عادی ہو جائے۔ یہاں اقبالؔ نے یہی صورت پیشِ نظر رکھی ہے۔

بچہ اپنی فکر کو شکار کے بعد اس لیے واپس لاتا ہے کہ اس کی فکر نے آگ پکڑ لی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اُس کی سمجھ بوجھ سے پھلجھڑی کی مانند پھول جھڑنے لگیں۔

۱۲۔ اب اُس میں اپنے وجود کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں، جب اس کی پکڑنے والی نظر اپنے آپ پر پڑتی ہے تو وہ سینے پر ہاتھ مار کر کہتا ہے کہ "میں"۔

۱۳۔ اُس کی یاد اسے خود اس کی ذات سے آگاہ کر دیتی ہے۔ یوں اُس کی گزشتہ اور آئندہ کل کے درمیان ربط پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۴۔ اس سنہری تار میں اس کے دن پروئے جاتے ہیں، بالکل اُسی طرح جیسے موتی لڑی میں ایک دوسرے کے بعد ہوتے ہیں۔

۱۵۔ اگرچہ اس کا بدن ہر لحظہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، مگر اس کے دل سے یہ صدا بلند ہوتی رہتی ہے کہ "میں وہی ہوں جو تھا"۔

۱۶۔ "میں" کا یہ احساس جو نیا نیا پیدا ہوا، دراصل زندگی کا آغاز ہے اور سمجھنا چاہیے کہ زندگی کا ساز بجنے لگا اور اس سے نغمے پیدا ہونے لگے۔

قومی خودی | ۱، ۲۔ بچے میں احساسِ خودی کے مختلف مدارج بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جو ملت نئی نئی پیدا ہوتی ہے، اس کی حالت بھی ماں کی گود والے بچے کی سی ہوتی ہے، یعنی جو بچہ اپنے آپ سے آگاہ نہیں ہوتا، وہ موتی تو ہوتا ہے، مگر ایسا جو راستے کی گرد میں لِٹا ہوا ہو۔

۳۔ اُس قوم کے آج کا رشتہ آئندہ کل سے بندھا نہیں ہوتا اور دن رات کے حلقے سے اُس کے پاؤں آزاد ہوتے ہیں۔

۴۔ اُس کی مثال یوں سمجھو جیسے ہستی کی آنکھ میں پُتلی کہ وہ دوسروں کو دیکھتی ہے اور اپنے آپ کو نہیں دیکھتی۔

۵۔ وہ اپنے دھاگے کی سیکڑوں گرہیں کھولتی ہے۔ پھر اسے خودی کے تار کا سرا ملتا ہے، یعنی اس میں بھی کچھ دیر کے

بعد خودی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

٦- پھر وہ دنیا کے کاروبار میں سرگرمی سے حصّہ لیتی ہے تو خودی کا جو نیا نیا شعور پیدا ہوا تھا وہ پائدار و استوار ہو جاتا ہے

٧- وہ نقش اٹھاتی اور بٹھاتی ہے، اس طرح اپنی سرگزشت تیار کرتی ہے۔

نقش اٹھانے اور بٹھانے سے مقصود یہ ہے کہ وہ پرانے انتظامات اور طور طریقے مٹا کر نئے سلسلے جاری کرتی ہے۔ یہی چیزیں اس کی سرگزشت کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری قوتوں سے رزم و پیکار بھی شامل ہے۔

٨، ٩- اگر فرد کے دلوں کا ربط و ضبط ٹوٹ جائے تو اس کے فہم و ادراک کا شانہ دندانوں سے محروم ہو جاتا ہے یعنی فہم و ادراک کچھ کام نہیں دیتے۔ یہ ظاہر ہے کہ شانے کے دندانے ٹوٹ جائیں تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ گویا فرد کا ادراک دلوں کے ربط و ضبط پر موقوف ہے۔ اسی طرح قوم اپنی تاریخ کی سیاہی سے روشنی حاصل کرتی ہے اور اسی کے واقعات کی یاد سے وہ خود شناس رہتی ہے۔

١٠- اگر وہ اپنی تاریخ بھول جائے گی تو پھر فنا کی تاریکی میں گم ہو جائے گی۔

١١، ١٢- اے عقلمند! تیری زندگی کا نسخہ یہ ہے کہ اپنے دلوں کا شیرازہ باندھے رہ۔ یہی دلوں کا ربط ضبط ہمارے لیے لباس ہے۔ یہ لباس جس سوئی سے سِلتا ہے، وہ پرانی روایات کی حفاظت ہے:

قومی تاریخ | ١- تو اپنے آپ سے بیگانہ ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ تاریخ کیا ہے؟ کیا یہ کہانی ہے؟ قصّہ ہے؟ افسانہ ہے؟ ہرگز نہیں۔

٢- یہ تجھے تیری حقیقی حیثیت سے آگاہ کرتی ہے۔ تجھے بتاتی ہے کہ کیا کچھ کرنا چاہیے۔ اس طرح تجھے صاحب عزم و ہمت بناتی ہے۔

٣- تاریخ روح کے لیے آب و تاب کا سرچشمہ ہے اور قوم کے جسم میں اسے رگ و پے کی حیثیت حاصل ہے۔

٤- یہ پہلے تجھے تلوار کی طرح سان پر لگاتی ہے، پھر اٹھا کر دنیا کی کشمکش گاہ میں پھینک دیتی ہے کہ جو کچھ انجام دے سکتا ہے، انجام دے۔

٥- واہ وا! یہ کتنا راحت انگیز اور دل افروز ساز ہے، جس کے تاروں میں گزرے ہوئے زمانے کے نغمے بند ہیں:

٦- تو اس کی جبین میں بجھا ہوا شعلہ دیکھ سکتا ہے۔ امروز کی گود میں گزشتہ کل کے حالات کا نظارہ کر سکتا ہے۔

٧- تاریخ کی شمع قوموں کے نصیبے کا ستارہ ہے۔ اس سے آج کی رات بھی روشن ہے اور گزشتہ کل کی رات بھی۔

٨- وہ گہری نظر والی آنکھ ہے جو دورِ ماضی کو دیکھتی اور اسے تیرے سامنے اصل صورت میں لا کر آراستہ کر دیتی ہے۔

٩- اس کی صراحی میں سینکڑوں سال کی شراب ہے اور اس کی شراب میں گزری ہوئی مستی محفوظ ہے۔

۱۰۔ تاریخ ایسی شکاری ہے کہ جو پرندہ ہمارے باغ سے اُڑ گیا، اسے بھی اپنے جال میں پھانسے ہوئے ہے۔

۱۱۔ تو تاریخ کو یاد اور محفوظ رکھ اور مستحکم و استوار ہو جا۔ جو سانس جا چکے ہیں، ان سے فیضان حاصل کر کے نئی زندگی پیدا کر۔

نفس ہائے رمیدہ یعنی گزرے ہوئے سانسوں سے مراد ہے گزرا ہوا زمانہ، عہد ماضی۔ قومیں ہمیشہ اپنی ماضی کی یاد سے کامگاری حاصل کرتی ہیں اور اسی طرح مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔

۱۲۔ اگر تُو اپنی گزشتہ کل کو امروز سے جوڑ لے گا تو زندگی تیرے ہاتھ کا سدھایا ہوا پرندہ بن جائے گی۔

۱۳۔ اگر تُو گزرے ہوئے زمانے کا رشتہ سنبھالے نہیں رہے گا تو اُس بیمار کی طرح ہو جائے گا جسے دن کو نظر نہیں آتا اور چمگادڑ بن جائے گا، جو روشنی سے بھاگتی ہے۔

۱۴۔ تیرے ماضی سے تیرا حال اور حال سے مستقبل پیدا ہوگا۔

۱۵۔ اگر تُو ایسی زندگی کا خواہاں ہے، جسے کبھی زوال نہ آئے تو ماضی کا رشتہ حال و مستقبل سے نہ توڑنا چاہیے۔

۱۶۔ زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ تسلسل کی آگاہی کی ایک لہر ہے۔ شراب نوشوں کے نزدیک قلقل کا شور ہی زندگی ہے۔

چوبیسواں باب

امومت

اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسان کی بقا امومت (ماں ہونا) کی بدولت ہے اور امومت کی حفاظت و عزت اسلام کی اصل ہے۔

تمہید اقبالؒ نے سب سے پہلے امومت کی فضیلتیں بیان کی ہیں، پھر قومی نقطۂ نگاہ سے مثالی خاتون کا ذکر کیا ہے کہ عورت کی فضیلت صرف اس پر موقوف ہے کہ اس کی آغوش سے غیور و حق پرست مسلمان پیدا ہوں۔ کوئی عورت حسن کا کتنا ہی اونچا رتبہ حاصل کرے، علم میں کتنی ہی ترقی کر جائے اور اس کا تمدن کتنا ہی بلند ہو، لیکن اگر وہ امومت کے جوہر سے عاری ہے تو بہتر ہے کہ ایسا پھول ہمارے باغ میں نہ اُگے۔ قوم کا اصل سرمایہ صرف تندرست اور سخت کوش فرزند ہیں نہ کہ مال و دولت۔

امومت ارحام۔ رحم کی جمع۔ مراد ہے عورتیں۔

دُرج ۔ دُختر کا مخفف ۔ بیٹی ۔

دِہقان زادہ ۔ گنوار ۔ دیہاتی ۔

سِطبر ۔ فربہ ۔

ظلام ۔ ظلمت کی جمع ۔ اندھیرے ۔ تاریکیاں ۔

۱ ۔ مرد کے ساز سے عورت کا زخمہ نغمہ پیدا کرتا ہے ۔ عورت کی نیازمندی مرد کے ناز کو دوبالا کر دیتی ہے ۔

۲ ۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق عورتیں مردوں کی برہنگی کو چھپانے کے لیے لباس ہیں ۔ دل لبھانے والا حسن عشق کے لیے پیراہن بن گیا ۔

یہاں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے :

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۔ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم اُن کا لباس ہو ۔

۳ ۔ عشقِ حق عورت ہی کی آغوش میں پرورش پاتا ہے ۔ یہ نغمہ اسی کا خاموش زخمہ پیدا کرتا ہے ۔

۴ ۔ اُس پاک وجود نے ، جس پر کائنات فخر و ناز کر رہی ہے یعنی رسول اللہ صلعم نے ، عورت کا ذکر خوشبو اور نماز کے ساتھ فرمایا ۔ حدیث کے لیے ملاحظہ ہو اسی مثنوی کا باب "ملت کی آفاقیت" ۔

۵ ۔ جس مسلمان نے عورت کو لونڈی سمجھا ، سمجھ لینا چاہیے کہ اسے قرآن کی حکمت سے کوئی حصہ نہیں ملا

۶، ۷ ۔ اگر تو غور کرے تو امومت سراسر رحمت ہے کیونکہ اسے نبوت سے نسبت ہے ۔ وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلعم جس شفقت کا پیکر تھے ، اسی شفقت کا پرتو اللہ تعالیٰ نے ماؤں کے دلوں میں ڈالا ۔ پیغمبر قوموں کی سیرت کے سانچے تیار کرتے ہیں ۔ مائیں بھی اپنے دائرے میں یہی خدمت انجام دیتی ہیں ۔ ماں کی شفقت کسی تشریح کی محتاج نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ بچے ماں کی آغوش میں پلتے ہیں ۔ وہیں ان کی سیرت پختہ ہوتی ہے ۔ پھر یہ بچے جوان ہو کر قومی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں اور اپنی اسی سیرت سے کام لیتے ہیں جو ماؤں کی آغوش میں تیار ہوتی ہے ۔ اس بنا پر ماؤں کو قوموں کی سیرت تیار کرنے والا قرار دیا ۔

۸ ۔ امومت ہی کی بدولت ہماری حیثیت مستحکم ہوتی ہے ۔ ماں کی پیشانی پر جو خط ہوتا ہے ، وہی ہماری تقدیر ہے ۔

۹، ۱۰ ۔ اگر تیری عقل بات کی تہ تک پہنچ سکتی ہے تو لفظ امت پر غور کر ۔ اس میں بڑے نکتے ہیں ۔ اس کا مادہ ام ہے یعنی ماں ۔ اس پاک ذات نے جو کائنات کے پیدا کرنے کا مقصود تھی ، یعنی رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جنت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے ۔ یہ روایت کا ترجمہ ہے (الجنۃ تحت اقدام الامھات) ۔

۱۱ ۔ قوم عورتوں کی عزت ہی سے ہے ، ورنہ سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کا کام ناتمام ہے ۔

۱۲ ۔ زندگی کی رفتار امومت ہی کی بدولت تیز ہے اور زندگی کے بھید امومت ہی سے کھلتے ہیں :

۱۳ - ہماری ندی میں جو پیچ و تاب یا لہریں یا گرداب یا بلبلے پائے جاتے ہیں، وہ سب امومت ہی سے ہیں۔

مثالی خاتون | ۱ تا ۵ - وہ گنوار اور جاہل لڑکی جس کا قد چھوٹا، جسم موٹا اور خط و خال غیر موزون ہیں۔ جو ان پڑھ ہے، تربیت بھی نہیں پائی، کوتاہ نظر ہے، کم گو ہے اور بالکل سادہ ہے، تاہم وہ ماں بنی اور ماں کے تمام دُکھ رنج سہہ کر دل کا خون کیا اور اس کی آنکھوں کے گرد نیلے حلقے پڑ گئے۔ اگر قوم کو ایسی خاتون کے ہاتھ سے ایک غیرت مند اور حق پرست مسلمان مل جائے تو ہمیں اقرار کرنا چاہیے کہ ہماری قومی ہستی اس خاتون کے رنج و غم اور درد و الم سے مستحکم ہے۔ اسی کی شام سے ہماری صبح دنیا بھر کو چمکانے والی بنی۔

مطلب یہ کہ اس نے دُکھ اٹھائے اور ہمارے لیے ایک جوانمرد حق پرست پیدا کیا۔ تکلیفیں اُٹھانا اس کی شام اور غیور و حق پرست مسلمان تیار کرنا قوم کی صبح تھی۔

۶ - لیکن وہ نازک جسم والی عورت، جس کی گود بچے سے خالی ہے اور محشر جس کی نگاہ کا خانہ زاد ہے؛

۷ - اس کا دماغ مغرب کی چمک دمک سے روشن ہے۔ بہ ظاہر عورت نظر آتی ہے، لیکن اس کے باطن کو دیکھا جائے تو اسے عورت ہونے سے کوئی مناسبت نہیں۔

۸ - اس نے رِلّت بیضا کے قاعدے اور ضابطے توڑ دیے اور اپنی آنکھوں سے حل کیے ہوئے غشوے گراتی رہی۔

۹ - وہ شوخ چشم ہے اس کی آزادی فتنے پیدا کرنے والی ہے اور وہ شرم و حیا سے کبھی آشنا نہیں ہوئی۔

۱۰ - اس نے علم تو پڑھ لیا لیکن ماں ہونے کا بوجھ برداشت نہ کیا۔ اس کی شام کی پیشانی پر ایک بھی ستارہ نہ چمکا یعنی ایک بھی بچہ پیدا نہ ہوا۔

۱۱ - میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ ایسا پھول ہمارے باغ میں پیدا ہی نہ ہو تو بہتر ہے اور قوم کے دامن سے ایسے دھبے کا دھل ہی جانا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اصل قومی سرمایہ | ۱ - لا الٰہ کہنے والے تاروں کی مانند اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی اور وہ ابھی تک ماں کی تاریکی میں آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔

۲ - انھوں نے ابھی تک عدم سے پاؤں باہر نہیں نکالا اور کیف و کم کی اس دنیا میں ابھی نہیں آئے؛

۳ - جلووں کی وہ کرنیں جو ابھی تک دیکھی نہیں گئیں، ہماری موجودہ تیرگی کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔

۴ - پھول کی پنکھڑی پر ابھی شبنم نہیں گری اور صبا نے کلیوں کو ابھی تک خستہ نہیں کیا یعنی کلیاں ابھی تک کھلی نہیں؛

۵ - ممکنات کا یہ لالہ زار ماؤں ہی کے باغ کی کیاریوں میں کھلے گا؛

۶، ۷ - اے حقیقت پر نظر رکھنے والے! جان لے کہ قوم کا اصل سرمایہ روپیہ پیسہ، سر و سامان، چاندی اور سونا نہیں؛ اصل سرمایہ یہ ہے کہ اسے نوجوان ملیں جو تندرست ہوں، ان کے دماغ تازہ ہوں، سخت محنت و مشقت کے عادی

ہوں اور جاتی چو بند رہیں۔

اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ جو قوم ایسے افراد کی دولت سے محروم ہے، وہ مال و متاع کی بنا پر زندہ نہیں رہ سکتی اور یہ دولت ماؤں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی لیے فرماتے ہیں :

۸۔ مائیں اخوت کے بھید کی نگہبان ہیں۔ قرآن مجید اور ملت کے لیے تقویت کا باعث ہیں یعنی ان سے تندرست، تازہ دماغ اور محنتی بچے پیدا ہوں گے۔ وہ قوم کے لیے بھی قوت کا باعث ہوں گے اور قرآن مجید کے پیغام حق پر خود عمل کریں گے اور دنیا کو بھی دعوتِ عمل دیں گے۔

پچیسواں باب

حضرت فاطمۃ الزہرا رضہ

اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ سیدۃ النسا حضرت فاطمۃ الزہرا رضہ مسلمان عورتوں کے لیے ایک کامل نمونہ ہیں۔

تمہید | سب سے پہلے حضرت فاطمہ رضہ کے مناقب بیان کیے ہیں، جن میں سے خاص طور پر قابل توجہ امر یہ ہے کہ حضرت مریم یقیناً ہمیں بہت عزیز ہیں کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ ؑ کی والدہ تھیں اور قرآن مجید ان کی برگزیدگی و پاکیزگی کا گواہ ہے لیکن ہمیں خواتین عالم میں برگزیدہ قرار دیتا ہے۔ حضرت فاطمہ رضہ کے احترام و اعزاز کے لیے تین نسبتیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیں، اول آپ رحمۃ للعالمین ؐ کی محبوب صاحبزادی تھیں، دوم حضرت علی مرتضیٰ ؑ کی حرم تھیں، سوم حضرت حسن رضہ اور حضرت حسین رضہ کی والدۂ ماجدہ تھیں۔ ان دونوں بزرگوں کو اپنے کارناموں کی بدولت مسلمانوں میں جو شرف و برتری حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ پھر حضرت فاطمہ رضہ کے اخلاق طاہرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ کا وجود مبارک مسلمان عورتوں کے لیے کامل نمونہ پیش کرتا ہے۔ آپ حد درجہ سخی تھیں۔ اپنی مرضی کو آپ نے شوہر کی مرضی میں گم کر دیا تھا۔ صبر و رضا کا پیکر تھیں خود گھر کا کام کاج کرتیں۔ چکی پیستیں تو ساتھ ہی قرآن کی تلاوت کرتی جاتیں۔

اس کے بعد خواتین اسلام سے خطاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ خواتین ہی ہماری ملت کے سرمایے کی نگہبان ہیں انھیں کی وجہ سے ہماری جمعیت مستحکم ہے۔ دور حاضر بڑا فتنہ انگیز ہے۔ اے ہماری ماؤں! فرزندوں کو اپنی نگرانی میں رکھو

اور حضرت فاطمہؓ کے عملی نمونے کی پابندی کرو۔

تین نسبتیں

کلبہ۔ تنگ و تاریک حجرہ۔ جھونپڑی۔

حُسام۔ تلوار۔

مُخدّرات۔ مُخدّرہ کی جمع۔ پردہ نشین عورتیں۔ یہ خدر (پردہ) سے مشتق ہے۔

تر فروش۔ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنے والا جیسا حقیقت میں نہیں۔ گندم نما و جو فروش۔ عیار۔ مکار۔

آب بند۔ کھیت، باغ کو پانی دینے والا۔

۱۔ حضرت مریمؑ سے اضافی عزّ و برتری کی صرف ایک نسبت ہے یعنی آپ حضرت عیسٰیؑ کی والدہ تھیں۔ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے ایسی تین نسبتیں ہیں۔

۲، ۳، ۴۔ پہلی نسبت یہ کہ آپ حضرت رحمۃ للعالمینؐ کی نورِ نظر تھیں، جو پہلوں اور پچھلوں کے امام تھے، جن کی وجہ سے دنیا کے جسم میں جان پھونکی گئی اور ایک ایسا نیا معاشرہ وجود میں آیا جس کے قاعدے، قانون اور آئین بالکل نئے تھے۔

۴، ۵۔ دوسری نسبت یہ کہ حضرت فاطمہؓ اس آقا کے تاجدار کی حرم تھیں یعنی حضرت علی مرتضٰیؓ جو اللہ کے شیر تھے اور مشکلیں آسان کر دیتے تھے، وہ بادشاہ تھے، لیکن ایک تنگ و تاریک حجرہ ان کا محل تھا۔ ایک تلوار اور ایک زرہ ان کا کل سروسامان تھا۔

۶۔ تیسری نسبت یہ کہ آپ ان دو جلیل القدر بزرگوں کی والدہ تھیں، جن میں سے ایک عشقِ حق کی پرکار کے مرکز بنے اور دوسرے کو عشقِ حق کی قافلہ سالاری ملی۔

۷، ۸۔ پہلے حضرت حسنؓ تھے جو حریمِ پاک کی شمع تھے۔ انھوں نے بہترین امت یعنی ملتِ اسلامیہ کی جمعیت محفوظ رکھنی کی خاطر حکمرانی کو ٹھکرا دیا کہ آپس میں جنگ اور عداوت کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی، وہ بجھ جائے۔

یہاں اس خانہ جنگی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں شام کی طرف سے شروع ہو گئی تھی۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ منتخب ہوئے اور آپ کو خانہ جنگی روکنے کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو خلافت چھوڑ دی۔ اس طرح رسول اللہ صلعم کی پیش گوئی حضرت حسنؓ کے متعلق پوری ہو گئی یعنی میرا یہ فرزند اُمّت کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے گا۔

۹، ۱۰۔ دوسرے حضرت حسینؓ جو دنیا بھر کے نیکوں کے آقا اور احرار کے لیے قوتِ بازو تھے۔ زندگی کے نغمے میں صرف حضرت حسینؓ کی وجہ سے سوز پیدا ہوا اور اہلِ حق نے انھیں سے آزادی کا سبق لیا۔

۱۱۔ بیٹوں کی سیرتیں ماؤں کی آغوش میں تیار ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت میں سچائی اور پاکیزگی کے جو جوہر ہیں، وہ ماؤں ہی کی تربیت سے چمکتے ہیں۔

ماؤں کے لیے اسوۂ کامل | ۱- تسلیم کی کھیتی کا حاصل حضرت فاطمہؓ تھیں اور آپ مسلمان ماؤں کے لیے اسوۂ کامل بن گئیں یعنی ایسا نمونہ جس میں ماؤں کی زندگی کے ہر پہلو کے لیے بہترسے بہتر مثالیں موجود ہے۔

۲- حضرت فاطمہؓ کی دردمندی کا عالم یہ تھا کہ ایک محتاج سوالی کی حیثیت میں آپ کے پاس آیا۔ آپ اتنی متاثر ہوئیں کہ اس کی امداد کے لیے اپنی چادر ایک یہودی کے ہاتھ بیچ ڈالی۔

۳- نوری اور ناری آپ کے فرمانبردار تھے۔ شوہر کی فرمانبرداری کا عالم یہ تھا کہ آپ نے اپنی مرضی شوہر کی مرضی میں گم کر دی تھی۔

۴- آپ نے صبر و رضا کی ادب گاہ میں تربیت پائی تھی اور صبر و رضا کی کیفیت یہ تھی کہ چکی پیستی جاتیں اور کلام اللہ کی تلاوت کرتی جاتیں۔

۵،۷- آپ کے آنسو بچھونے پر کبھی نہ گرے۔ نماز کے لیے کھڑی ہوتیں تو آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح گرنے لگتے۔ جبریلؑ ان آنسوؤں کو زمین سے اٹھا لیے جاتے اور شبنم کی طرح عرش بریں پر ڈال دیتے۔

۷،۸- اللہ تعالیٰ کے قانون کی ڈوری نے میرے پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے فرمان کا پاس مجھے روک رہا ہے ورنہ میں حضرت فاطمہؓ کے مزار کا طواف کرتا اور اس مقام پر سجدہ ریز ہوتا۔

پردہ نشینوں سے خطاب | ۱- اے مسلمان خاتون! تیری چادر ہماری عزت و ناموس کا پردہ ہے اور تیری روشنی ہمارے فانوس کے لیے چمک دمک کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

۲- تیری پاکیزہ سرشت ہمارے لیے رحمت ہے۔ اسی سے دین کی قوت ہے اور یہی ہماری قوم کی بنیاد ہے۔

۳- بچے نے جب تیرے دودھ سے لب تر کیا تو تو نے سب سے پہلے اسے کلمۂ توحید سکھایا۔

۴- تیری ہی محبت کے سانچے میں ہمارے طور طریقے، ہماری سوچ بچار، ہماری بات چیت اور ہمارے کردار ڈھلتے ہیں۔

۵- ہماری بجلی جو تیرے ابر کی آغوش میں آسودہ تھی، وہ پہاڑوں پر چمکی اور صحراؤں میں تڑپی۔

۶- اے مسلمان خاتون! تجھے قدرت نے آئینِ حق کی نعمت کی امانت دار بنایا۔ تیری سانسوں میں دینِ حق کی حرارت بھری ہوئی ہے۔

۷ تا ۱۰- دورِ حاضر بڑا مکار اور عیار ہے۔ اس کی حقیقت کچھ ہے اور ظاہر کچھ کرتا ہے۔ اس کے قافلے میں دین کی متاع لوٹی جاتی ہے۔ یہ اندھا ہے اور اس کا فہم خدا کو نہیں پہچانتا۔ بے حقیقت لوگ اس کے چکروں میں پڑ کر قیدی بن چکے ہیں۔ اس کی آنکھیں بیباک، شوخ اور بے پردہ ہیں۔ اس کی مژگان کا پنجہ جہاں پڑ جائے، گر جاتا ہے۔ جو وجود اس کا شکار ہو جاتا ہے، عجیب امر یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد کہتا ہے۔ جو اس کا کشتہ ہو چکا ہے، وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہے۔

۱۱- اے مسلمان خاتون! تجھی سے امید ہے کہ اس فتنہ انگیز دور میں ہماری جمعیت کے نخل کی آبیاری کرے گی اور تُو ہی ہماری ملت کے سرمایے کی نگہبان ہے۔

۱۲- تُو نے نفع اور نقصان کے جو پیمانے سوچے ہیں، انھیں نظر انداز کر اور صرف باپ دادا کے راستے پر گامزن تیرے لیے مناسب ہے۔

۱۳- اے مسلمان خاتون! زمانے کی دست درازی سے چوکس رہ۔ اپنے بیٹوں کو آغوش میں لے لے۔

۱۴- یہ چمن میں پیدا ہوئے لیکن انھوں نے ابھی پر نہیں تولے اور اپنے گھونسلے سے بہت دُور پڑے ہیں۔

دورِ حاضر میں ہمارے نوجوانوں کی جو حالت عموماً ہے، اس کا نقشہ ان سے بہتر لفظوں میں نہیں کھینچا جا سکتا کہ یہ پر تولنے کے اہل نہیں ہوئے اور اپنے نشیمن سے دُور ہیں۔

۱۵، ۱۶- اے مسلمان خاتون! تیری فطرت میں بڑے بلند جذبے موجزن ہیں۔ تُو ہوش کی نظر حضرت فاطمہؓ کے نمونے پر جمائے رکھ تاکہ تیری شاخ میں بھی حسینؓ جیسا پھل لگے اور ہمارے باغ میں پہلی سی بہار پھر آ جائے۔

تفسیر سورۂ اخلاص

مثنوی کے مطالب کا خلاصہ

پہلا باب

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ

(کہہ، اللہ کی ذات یگانہ ہے)

حضرت صدیق اکبرؓ کا ارشادِ امن النّاس۔ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

آمَنَ النَّاسِ عَلَیَّ فِی صُحْبَتِہٖ — تمام انسانوں میں سے مجھ پر رفاقت اور مال میں

وَ مَالِہٖ اَبُوْ بَکْرٍ — سب سے بڑھ کر احسان ابوبکرؓ نے کیے ہیں

برکردن۔ روشن کرنا۔

۱۔ ایک رات میں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور آپ کے راستے کی خاک سے پھول چنے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ سید سلیمانؒ مرحوم و مغفور نے رموزِ بے خودیؒ پر بعض ادبی اعتراض کیے تھے۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ "گل ز خاکِ راہ او چیدم بخواب" بحالت خواب میں حضرت صدیقؓ کے راستے کی خاک سے پھول چنے، سے مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے۔ اقبال فرماتے ہیں: دوسرے مصرع پر آپ کا ارشاد تھا کہ مطلب زیادہ واضح ہونا چاہیے اور گل ز خاکِ راہ او چیدم کا کیا مطلب؟ یہ واقعہ خواب کا ہے۔ جو کچھ خواب میں دیکھا گیا بعینہ نظم کر دیا گیا (اقبال نامہ حصہ اول صـ۹۵)

۲۔ وہ ابوبکرؓ جن کے احسان ہمارے آقا و مولاؐ پر تمام انسانوں سے بڑھ کر ہیں۔ وہ ابوبکرؓ جو ہمارے کوہِ سینا کے پہلے کلیم تھے۔

پہلے مصرع کے متعلق حدیث درج کی جا چکی ہے کہ رفاقت اور مال میں حضرت ابوبکرؓ کے احسان سب سے بڑھ کر ہیں یعنی انھوں نے سب سے بڑھ کر مصاحبت کا حق ادا کیا اور انھوں نے سب سے بڑھ کر پیغامِ حق کی اشاعت میں مال صرف کیا۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے مسلمان تھے۔ رسول اللہ صلعم کی ذاتِ بابرکات کو طورِ سینا فرض کیا جائے تو اس طور پر جو کلیم سب سے پہلے پہنچا، وہ حضرت ابوبکرؓ تھے۔

روایات میں قبولِ اسلام کے لیے تین ہستیوں کی سبقت مسلّم ہے۔ ایک حضرت خدیجہؓ دوسرے حضرت علیؓ، تیسرے حضرت صدیقؓ۔ فیصلہ یہ ہے کہ مستورات میں سے حضرت خدیجہؓ نے سبقت حاصل

کی، لڑکوں میں سے حضرت علیؓ نے، جو قبولِ اسلام کے وقت آٹھ سال کے تھے، مردوں میں سے حضرت ابوبکرؓ نے۔ اس سلسلے میں معاملے کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے۔ حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلعم کی حرم تھیں، حضرت علیؓ نے خود رسول اللہ صلعم کے ہاں تربیت پائی تھی۔ کاملاً آزاد و خود مختار صرف ابوبکرؓ تھے۔

۳۔ حضرت ابوبکرؓ کی ہمت اور ان کے ایثار کی حیثیت قومی کمیشن کے لیے ابر رحمت کی تھی۔ وہ اسلام، غار، بدر اور قبر میں دوسرے تھے:

دوسرے مصرع میں حضرت صدیقؓ کی زندگی کے تمام اہم واقعات تاریخی ترتیب سے جمع کر دینا سچ مچ ایک کرامت ہے۔ اصل مضمون حضرت سعید بن مسیب کے ایک قول میں آگیا تھا لیکن ایک مصرع میں لمبے قول کا بنیادی مضمون جمع کر دینا بہت مشکل تھا۔

سعید بن مسیب کا قول یہ تھا۔ کان ابوبکر صدیق من النبیؐ مکان الوزیر وکان یشاورہ فی جمیع امورہ وکان ثانیہ فی الاسلام وثانیہ فی الغار وکان ثانیہ فی العریش یوم بدر وکان ثانیہ فی القبر ولم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقدم علیہ احداً (ابوبکر صدیقؓ کی حیثیت رسول اللہ صلعم کے ہاں وزیر کی تھی۔ آپ ہر معاملے میں ابوبکرؓ سے مشورہ کرتے اور ابوبکرؓ اسلام میں دوسرے اور غار میں دوسرے تھے۔ جنگ بدر کے دن سائبان میں دوسرے تھے اور قبر میں دوسرے تھے۔ رسول اللہ صلعم کے نزدیک ان سے مقدم کوئی نہ تھا)

اقبال کی شانِ دیانت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ یہ روایت انھوں نے خود "رموزِ بے خودی" کے پہلے ایڈیشن کے حاشیے میں درج کر دی تھی۔ اس مصرع کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اسلام میں دوسرے تھے، اس لیے کہ رسول اللہ صلعم پر سب سے پہلے اسلام لائے۔ غار میں دوسرے تھے، اس پر قرآن مجید گواہ ہے یعنی ثانی اثنین اذ ھما فی الغار (جب وہ دو غار ثور میں تھے تو ان دو میں سے دوسرا) جنگ بدر میں کیفیت یہ تھی کہ جنگ شروع ہونے سے پیشتر رسول اللہ صلعم کے لیے فوج کے پیچھے اونچائی پر ایک سائبان سا بنا دیا گیا تھا، جہاں سے آپ فوجی نقل و حرکت کا انتظام فرما سکتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے عریش میں مسلمانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں۔ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلعم کے پاس تھے اور حضرت سعد بن معاذ دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ دعائیں کرتے کرتے ایک مرتبہ محویت کے عالم میں ردائے مبارک رسول اللہ صلعم کے دوشِ مبارک سے گر گئی اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے درست کر دیا۔ یہ ہے ثانی بدر یعنی میدانِ بدر میں رسول اللہ صلعم کے رفیق

خاص۔ سب سے آخر میں تاثانی تعبیروں کہ وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ صلعم کے حجرے میں پہلوئے مبارک کے قریب دفن ہوئے۔

۴ - میں نے عرض کیا، اے عشقِ حق کے برگزیدوں میں سے برگزیدہ! آپ ہی کا عشق عشقِ حق کے دیوان کا پہلا مطلع ہے۔

۵ - ہمارے کام کی بنیاد آپ ہی کے ہاتھ سے پختہ ہوئی کیونکہ اسلام کے لیے رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد پہلا مصیبت خیز دور وہ تھا جس میں مختلف گروہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ مرتد ہو چکے تھے، بعض نے خود نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا اور بعض نے زکوٰۃ روک لی تھی۔ حالات بڑے تشویش ناک تھے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک لمحے کے لیے بھی متزلزل نہ ہوئے اور چھ مہینے کے اندر تمام مخالفتوں کو ختم کر کے ملتِ اسلامیہ کی بنیادیں استوار کر دیں۔ میں نے عرض کیا کہ جس طرح آپ نے ہماری بنیاد درست کر دی تھی، اسی طرح ہماری بیماری کے لیے، جس نے ہمیں سخت پریشان کر رکھا ہے، کوئی علاج تجویز فرما دیجیے۔

۶ - فرمایا: تو کب تک ہوا و ہوس کا قیدی بنا رہے گا؟ سورۂ اخلاص پر غور کر اور اسے اپنے لیے مشعلِ راہ بنا۔

توحید فی العمل کی دعوت ۱ - دیکھو، سیکڑوں سینوں میں ایک ہی سانس کی آمد و رفت جاری ہے۔ یہ بھی توحید کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔

۲ - تم بھی اسی کا رنگ پیدا کرو تو اسی جیسے بن جاؤ گے اور دنیا میں اسی کے عکسِ جمال کے آئینہ دار ہو جاؤ گے۔

۳ - جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا، اس کی رضا یہ تھی کہ تم دوئی کو چھوڑ کر وحدت کی طرف آؤ۔ مسلمان نام اللہ نے رکھا، قرآن کہتا ہے: وَهُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْن: فرماتے ہیں کہ مسلمان نام رکھنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ سب ایک رہو۔

۴ - لیکن تم نے اپنے آپ کو ترک، افغان اور خدا جانے کیا کیا کچھ کہا۔ تم پر افسوس کہ جس حالت میں تھے، اسی میں الجھ کر رہ گئے یعنی توحید کی برکات سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔

۵ - تم کو ان مختلف ناموں سے نجات دلاؤ۔ تم سے ربط ضبط قائم رکھو، جام و ساغر سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ خمِ ملت سے، جو ایک ہے۔ جغرافیائی قومیتوں کی بنا پر الگ الگ نام رکھنے سے تفرقہ پیدا ہوا۔ ان کی حیثیت جام و ساغر کی ہے۔ انھیں چھوڑو تاکہ ملت کی وحدت قائم ہو جائے۔

۶ - تم نام کے پیچھے پڑے ہوئے ہو، جو سراسر رسوائی کا سامان ہے، گویا تم اپنے درخت سے خام ہی نیچے آگرے، پختہ نہیں ہو سکے۔

مراد یہ کہ اسلام کی نسبت چھوڑ کر نسلی اور جغرافیائی نسبتیں اختیار کر لیں اور انھیں اتنی اہمیت دے دی کہ اب ان پر فخر کرتے ہو اور کسی حالت میں بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ بنیادی قومی احساسات کی خامی کی دلیل ہے۔

۷ - تم یگانگی سے موافقت پیدا کرو اور دوئی سے بے تعلق ہو جاؤ۔ اپنی وحدت کو پارہ پارہ نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ اسلامی

ملت کے بجائے ترکی، افغانی، عربی ملت قرار دے لینے کا مطلب یہی ہے کہ وحدت کا شیرازہ بکھر جائے۔

۸۔ اے وحدت کی پرستش کرنے والو! اگر تم دنیا میں متحد ہو کر نہ رہو گے اور اپنی جداگانہ قومیتوں پر زور دو گے تو یاد رکھو، تم دوئی ہی کا سبق رٹتے رہو گے اور تمہارے عقیدۂ وحدت میں خلل آ جائے گا۔ ایک خدا کو ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ قومیت ایک ہو۔ اگر قومیت ایک نہیں تو ظاہر ہے کہ خدا کو ایک ماننے کا عقیدہ عمل کے رو سے باطل ہو گیا۔

۹۔ تم نے خود اپنا دروازہ اپنے آپ پر بند کر لیا۔ جو کچھ زبان سے کہتے ہو، چاہیے کہ اسے دل میں جگہ دو، یعنی قول اور عمل میں اختلاف نہ ہونا چاہیے۔ اگر زبان پر کلمۂ توحید ہے تو اُس کلمے کو دل کے اندر اتارنا چاہیے:

۱۰۔ تم نے ایک قوم کی سینکڑوں قومیں بنا ڈالیں، گویا اپنے قلعے پر خود ہی شبخون مارا۔

۱۱۔ تم ایک ہو جاؤ اور توحید کا نقشہ عملی اعتبار سے دنیا کے سامنے پیش کر دو۔ کلمۂ توحید میں جو مفہوم چھپا ہوا ہے، اسے عمل کے ذریعے سے وجود میں لے آؤ۔

۱۲۔ عمل کے ذریعے سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اُس ایمان کو مردہ سمجھنا چاہیے جس کے مطابق عمل نہیں ہوتا۔

یہ ارشادات کسی خاص تشریح کے محتاج نہیں۔ مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ڈبوتا ہے۔ یہ محض علم ہے، جسے تجربے نے یقین کی منزل پر پہنچا دیا۔ آپ کسی سلیم العقل آدمی سے یہ اُمید نہیں رکھیں گے کہ وہ آگ کے الاؤ میں کود پڑے یا کشتی کے بغیر طوفانی سمندر میں چلا جائے۔ تجربے نے اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ ایسا کرنا ہلاکت یا مضرت کا باعث ہے۔ ایمان کا درجہ اس سے زیادہ بلند ہے۔ اگر واقعی کسی شخص کا ایمان ہے کہ اللہ ایک ہے تو کیا وجہ ہے، وہ اس کے عملی تقاضے پورے نہ کرے؟ حالانکہ اپنے معمولی تجربات کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ اگر وہ ایمان کے مطابق عمل پیرا نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا ایمان بے روح یعنی مردہ ہے اور اسے ایمان کہنا ہی غلط ہے۔

دوسرا باب

اَللّٰهُ الصَّمَدُ

(خدا بے نیاز ہے اور اسے کسی کی احتیاج نہیں)

بے نیازی کی دعوت دولاب - رہٹ۔

شعیر - جَو۔

مرحب - خیبر کے یہودیوں کا سب سے بڑا سردار، جسے حضرت علیؓ نے قتل کیا۔

اقلل من الدنیا تعش حرًا - یہ قول حضرت فاروق اعظمؓ سے منسوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیوی ضرورتیں کم کر دے اور آزادانہ زندگی بسر کر۔ ظاہر ہے کہ انسان کی ضرورتیں جتنی زیادہ ہوں گی، اتنی ہی اسے تگ و دو کرنی پڑے گی اور جب خود اس کی تگ و دو سے ضرورتیں پوری نہ ہوں گی تو وہ دوسروں کے لطف و کرم کا محتاج ہو گا۔ اس طرح اس کی آزادی چھن جائے گی۔ دنیا سے بے نیاز وہی رہ سکتا ہے، جس کی ضرورتیں بہت کم ہوں۔

تقبیل - چومنا۔

خاک خاموش - خشک زمین - بے آب و گیاہ زمین۔

ریو - مکر - حیلہ - فریب۔

صبح دروغ - صبح کاذب - صبح صادق سے پیشتر تھوڑی دیر کے لیے روشنی کی ایک جھلک سی نظر آتی ہے، لوگ اسے صبح سمجھ لیتے ہیں۔ زمانۂ ماضی میں مسافر اس روشنی کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہوئے کہ صبح ہو گئی، سفر شروع کر دیتے تھے اور رہزنوں کے ہاتھوں مارے جاتے تھے، لہٰذا اسے جھوٹی صبح کہنے لگے۔ عربی میں صبح کاذب، فارسی میں صبح دروغ۔

۱، ۲ - اگر تُو نے خدائے بے نیاز سے دل وابستہ کر لیا ہے، یعنی تُو اللہ تعالیٰ کی صفتِ بے نیازی پر ایمان لے آیا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ تُو اسباب کے دائرے سے نکل گیا ہے، یعنی تجھے اسباب کے لیے تگ و دو کی ضرورت نہیں رہی۔ کیوں؟ اس لیے کہ خدا کا بندہ اسباب کا بندہ نہیں ہو سکتا اور زندگی رہٹ کا چکر نہیں۔

۳ - اگر تُو مسلمان ہے تو خدا کے سوا ہر شے سے بے نیاز ہو جا اور دنیا کے لیے خیر و برکت کا سرچشمہ بن جا۔

۴ - دولت مندوں کے پاس جا کر گردشِ روزگار کے شکوے نہ کر اور اس طرح اپنے سوال کا دروازہ نہ کھول بلکہ ہاتھ آستین سے باہر ہی نہ نکال۔

درویش اور سوالی دولت مندوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ صاحب فلاں آفت کی وجہ سے کچھ پاس نہ رہا اور تباہ ہو گئے، گویا مانگنے کا ایک ڈھنگ یہ ہے کہ آسمان کا شکوہ کیا جائے۔ ہاتھ آستین سے باہر نہ نکالنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ کسی سے کچھ نہ مانگا جائے۔

۵ - حضرت علیؓ کی طرح جَو کی روٹی کو اپنا شعار بنا لے۔ مرحب جیسے زور آور سردار کی گردن توڑ اور خیبر جیسے مستحکم مقام پر قبضہ کرے۔

۶ - اہلِ کرم کا احسان کیوں لیا جائے؟ ان کے ہاتھ سے "ہاں" یا "نہیں" کا نشتر کیوں کھایا جائے؟

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص صاحبِ مال و زر سے سوال کرے گا تو وہ سوال مانا جائے گا یا نہیں مانا جائے گا۔ ماننے کی صورت میں جواب "ہاں" ہوگا اور نہ ماننے کی صورت میں "نہیں"۔ حقیقت پر نظر رکھی جائے تو "ہاں" اور "نہیں" دونوں کی حیثیت نشتر کی ہے جس سے سوالی کے دل پر زخم لگتے ہیں۔ اگر سوال پورا کیا گیا تو دینے والے کا احسان ہُوا اور لینے والے کی خود داری کو نقصان پہنچا۔ اگر سوال ٹھکرا دیا گیا تو مطلب یہ ہوا کہ خود داری کو مجروح کر لینے کے باوجود ضرورت بھی پوری نہ ہوئی۔ یہ بھی بہرحال زخم ہی ہُوا۔ عرفیؔ نے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں بھی یہی مضمون پیش کیا ہے۔ کہتا ہے:

اقبالِ کرم می گزد اربابِ ہمم را — ہمّت نخورد نشترِ لا و نعم را

رنجش کو قبول کر لینا اربابِ ہمّت کے لیے تکلیف و اذیّت کا سامان ہے۔ ہمّت اس امر کی روادار نہیں کہ اہلِ کرم کی زبان سے لا (نہیں) اور نعم (ہاں) کے نشتر کھائے۔

۷ - تُو اپنا رزق کمینوں کے ہاتھ سے نہ لے۔ تُو یُوسف ہے، تیری قیمت بہت زیادہ ہے۔ تجھے اپنے آپ کو ارزاں نہ کرنا چاہیے۔

۸ - اگرچہ تیری حیثیت چیونٹی کی ہو، ساتھ ہی تُو بے بال و پر بھی ہو، پھر بھی تیرے لیے زیبا نہیں کہ اپنی ضرورت کسی بڑے سے بڑے صاحبِ اقتدار کے پاس لے جائے۔ یہ مضمون اقبالؔ نے "خضرِ راہ" میں بھی پیش کیا ہے:

مور بے پر حاجتے پیشِ سلیماں مے مبر — مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست

۹، ۱۰ - زندگی کا راستہ بڑا کٹھن ہے، اپنے ساتھ بہت کم سامان لے۔ دنیا میں آزاد زندہ رہ اور آزاد ہی مر۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ کا یہ کتنا اچھا ارشاد ہے کہ دنیوی ضرورتیں کم کر دے اور آزادانہ زندگی بسر کر۔ تُو اسی ارشاد کو اپنا نقشۂ عمل بنا:

۱۱۔ جس حد تک ممکن ہو مٹی نہ بن، کیمیا بن۔ تجھے صاحبِ نعمت ہونا چاہیے جو دوسروں کو بخشش سے مالا مال کرے، سوالی نہ ہونا چاہیے۔

۱۲، ۱۳۔ تو حضرت بوعلی قلندر کے مقام اور مرتبے سے آگاہ ہے، میں انھیں کے جامِ ارشادات میں سے ایک گھونٹ تجھے پلاتا ہوں۔ فرماتے ہیں: کیکاؤس کا تخت ٹھکرا دے، سر دے دے مگر عزت و ناموس ہاتھ سے نہ دے۔

۱۴۔ یہ سنتِ الٰہی ہر لحظہ پیشِ نظر رکھ کہ جن لوگوں کے جام شراب سے خالی ہیں، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی صفت بے نیازی اپنے اندر پیدا کر لیں گے تو ان کے لیے شراب خانے کا دروازہ خود بخود کھل جائے گا۔

ہارون الرشید اور امام مالکؒ | ۱، ۲، ۳۔ مسلمانوں کے سردار خلیفہ ہارون الرشید کا واقعہ ہے۔ وہی ہارون الرشید جس کی تلوار کی دھار کا مزہ نقفور نے بھی چکھا۔

نقفور (نسی فورس اول) مشرقی رومی سلطنت کا بادشاہ تھا۔ ابتدا میں ملکہ آئرین کے ماتحت یہ وزیرِ مال تھا۔ پھر درباریوں کو ساتھ ملا کر تخت پر بیٹھ گیا۔ ملکہ آئرین خراج ادا کرتی تھی۔ نقفور نے تخت نشین ہوتے ہی ہارون الرشید کو لکھا: "اب عورت تاج و تخت کی مالک نہیں جو تمھیں خراج ادا کرتی تھی۔ میں شہنشاہ ہوں اور تم مجھے خراج ادا کرو۔" اسی گستاخانہ خط کے جواب میں ہارون الرشید نے وہ نادر خط لکھا تھا جس کا ابتدائی جملہ تھا: "خلیفہ ہارون الرشید کی طرف سے رومی کتے کے نام۔" پھر فوج لے کر بجلی کی طرح نقفور پر جا گرا اور جب تک اس نے جرموں پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے پورا خراج ادا نہ کر دیا، اسے نہ چھوڑا۔ ہارون الرشید نے نقفور کو بار ہا شکستیں دیں۔ آخر یہ وحشی بلغاریوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ہارون الرشید نے امام مالکؒ سے کہا کہ اے قوم کے آقا! آپ کے دروازے کی خاک سے قوم کی پیشانی روشن ہے۔ آپ حدیث کے باغ میں نغمہ سنج ہیں، میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ سے حدیث کے اسرار کا درس لوں۔

۴۔ لعل کب تک یمن میں پردوں کے اندر چھپا رہے گا؟ آیئے، دار الخلافت (بغداد) میں قیام فرمایئے۔

امام مالکؒ مسجد النبیؐ (مدینہ منورہ) میں درس دیا کرتے تھے۔ ہارون نے انھیں بغداد بلایا۔

۵، ۶۔ عراق میں دن خوب روشن ہوتے ہیں اور یہاں کا حسن بھی بڑا نظر سوز ہوتا ہے۔ اس کے انگور سے آبِ خضر (آبِ حیات) ٹپکتا ہے اور اس کی مٹی زخمِ مسیحا کے لیے مرہم ہے۔

۷۔ امام مالکؒ نے جواب دیا کہ میں رسول اللہ صلعم کا ملازم ہوں۔ حضورؐ کے سوا میرے سر میں کسی کا سودا نہیں۔

۸۔ میں حضورؐ ہی کے شکار بند سے بندھا ہوا ہوں اور اس پاک حرم سے اٹھ کر کہیں جا نہیں سکتا۔

۹۔ خاکِ یثرب کو بوسہ دینا میری زندگی ہے اور میری راتیں عراق کے دنوں سے زیادہ خوشگوار ہیں۔

۱۰، ۱۱، ۱۲۔ عشقِ حق کا فرمان تو یہ ہے کہ میرا حکم مان اور بادشاہوں کو خدمتگاری کے لیے بھی قبول نہ کر۔ تُو چاہتا ہے کہ میرا آقا بن جائے اور آزاد انسان کا مولا کہلائے؟ میں تعلیم دینے کے لیے تیرے دروازے پر آؤں؟ قوم کا خادم گور تیرا ملازم نہیں ہو سکتا۔

۱۳۔ اگر تُو دین کا کچھ علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو میرے حلقۂ درس میں آ کر بیٹھ۔

۱۴۔ اقبال فرماتے ہیں: "بے نیازی میں بھی بڑے ناز ہیں اور اُن نازوں کے بے شمار انداز ہیں"۔ یہ حکایت ختم ہو چکی تاریخی اعتبار سے اس سلسلے میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

ا۔ منصور عباسی کے زمانے میں امام مالکؒ سے جو معاملات پیش آئے، ان کے متعلق یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مہدی عباسی حج کے لیے مکۂ معظمہ آیا تو مدینہ بھی گیا۔ اُس وقت حجاز میں سخت قحط تھا۔ امام مالک نے خلیفہ کو اس طرف توجہ دلائی۔ خلیفہ نے پچیس لاکھ درم بہ غرضِ تقسیم امام کے پاس بھیج دیے اور تین ہزار دینار الگ امام کے لیے بھیجے۔ ساتھ ہی خواہش ظاہر کی کہ میرے ساتھ بغداد چلیں۔ امام نے جواب دیا کہ تھیلیاں بندھی پڑی ہیں، انھیں لے جائیے۔ مالکؒ مدینہ نہیں چھوڑ سکتا۔

ب۔ مہدی نے سواری بھیجی اور پاس بلایا۔ امام نے سواری واپس کر دی اور فرمایا کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کہ انھیں گلیوں میں رسول اللہ صلعم چلا کرتے تھے۔

ج۔ اسی سفر میں مہدی نے اپنے بیٹوں موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا کہ امام سے موطا سنیں۔ چنانچہ شہزادوں نے امام کو بلا بھیجا۔ امام نے فرمایا کہ علم بیش قیمت شے ہے اور شائقین اس کے پاس آتے ہیں۔ چنانچہ مہدی سے اجازت لے کر شہزادے خود امام کے پاس گئے۔

د۔ مہدی کے بعد پہلے موسیٰ بہ لقب ہادی مسند نشین ہوا، پھر ہارون۔ ہارون اپنے بیٹوں، امین اور مامون کو لے کر حج کے لیے آیا۔ امام سے کہا کہ "موطا" لے کر آئیے اور مجھے املا کرا دیجیے۔ امام موصوفؒ موطا کے بغیر ہارون کے پاس گئے اور کہا، علم تیرے گھر سے نکلا، تُو چاہے اسے عزت دے، چاہے ذلیل کر۔ ہارون خود بیٹوں کو لے کر مجلسِ درس میں حاضر ہوا۔ وہاں طلبہ کا ہجوم تھا۔ ہارون نے کہا کہ اس بھیڑ کو الگ کر دیجیے۔ فرمایا، شخصی فائدے کے لیے فائدۂ عام کا خون نہیں کیا جا سکتا۔ ہارون مسند پر بیٹھ گیا۔ امام نے فرمایا: "امیر المومنین! تواضع پسندیدہ ہے"۔ گویا عراق آنے کی دعوت ہارون نے نہیں، اس کے باپ مہدی نے دی تھی، لیکن سوال یہ نہیں کہ دعوت کس نے دی، اصل معاملہ جواب کا ہے، خواہ اس کا

مخاطب مہدی ہو یا ہارون اور اقبال کا اصل تعلق جواب ہی سے ہے اور یہی تعلیم و تلقین کا مرکز ہے:

مسلمان کی کیفیت

۱- بے نیازی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان حق کا رنگ اختیار کرے اور غیر کا رنگ پیراہن سے دھو ڈالے:

۲- اے مسلمان! تو نے غیروں کا علم پڑھا اور اسی کو ذخیرہ کیا۔ اسی گلگونے سے اپنا چہرہ چمکایا:

۳- غیروں کے طور طریقوں کو اپنے لیے باعث عزت سمجھتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تو تُو ہے یا غیر ہے۔ یعنی تیری حقیقی حقیقت غیر کی نقالی میں گم ہوگئی ہے۔ اور یقیناً تو تو نہیں رہا۔

۴- غیر کی بادِ نسیم نے تیری مٹی کو خشک اور بے آب و گیاہ بنا دیا۔ وہاں گلاب اور لالہ پیدا ہوتے تھے۔ تیری مٹی اب ان سے محروم ہو گئی۔

۵- تُو اپنا کھیت اپنے ہاتھوں نہ اجاڑ اور غیر کے بادل سے بارش کی بھیک نہ مانگ۔

مطلب یہ کہ غیر کے بادل سے جو کچھ پیدا ہوگا، وہ اپنی کھیتی اجاڑنے کے مترادف ہوگا۔

۶- تیری عقل غیر کے افکار کی قیدی ہے۔ تیرے گلے میں جو سانس ہے، وہ بھی غیر ہی کا ایک تار ہے۔

۷- تیری زبان کی گفتگوئیں اور تیرے دل کی آرزوئیں سب مستعار ہیں یعنی ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو تیری ہو۔

۸- تیری قمریوں کے ترانے اور تیرے سروں کی قبائیں سب دوسروں سے مانگی ہوئی ہیں:

۹- حد یہ ہے کہ تو اپنے پیالے میں شراب ہی نہیں بلکہ پیالہ بھی دوسروں سے قرض لیتا ہے۔

۱۰، ۱۱، ۱۲- وہ پاک ذات، جس کی نگاہ کے لیے قرآن مجید کا ارشاد ہے: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نہ کجی کی آنکھ نے اور نہ غلطی کھائی) (سورہ نجم) اگر وہ اپنی قوم کی طرف دوبارہ آئے، وہ جس کی شمع پروانوں کو پہچانتی ہے، جانتے ہو وہ تم جیسے مسلمانوں کو کیا کہے گی؟ "تم مجھ سے نہیں" تمہیں مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ یہ سن کر ہم اس کے سوا کیا کہیں گے کہ افسوس ہم پہ، افسوس ہم پہ، افسوس ہم پر:

غیر سے آزادی

۱- ستاروں کی طرح کب تک زندگی بسر کرو گے؟ اپنی ہستی کو صبح کی روشنی میں کب تک گم رکھو گے؟

۲- تم نے صبحِ کاذب کا دھوکا کھایا اور اپنے آپ کو ختم کر لیا:

۳- اپنی حقیقت پر نظر ڈالو، تم تو خود سورج ہو، پھر دوسروں کے تاروں سے روشنی کیوں لیتے ہو!

۴- تم نے اپنے دل پر غیر کا نقش بٹھا لیا۔ افسوس، مٹی کے بدلے کیمیا ہار دی۔

۵- تم کب تک دوسروں کی چمک دمک کے بل پر چمکتے رہو گے؟ اپنا سر دوسروں کی شراب سے، بلکہ گرد یعنی دوسروں کی شراب پی کر سرگراں اور متوالے مت ہو۔

۶- تم کب تک محفل کے چراغ کا چکر لگاتے ہو گے؟ اگر تمہارے پہلو میں دل ہے تو اپنی آگ میں جلو۔

۷- تم نظر کی صورت اختیار کرو۔ اپنی آنکھ کے پردوں ہی میں رہو۔ اڑنا چاہتے ہو تو اڑو، مگر اپنی جگہ نہ چھوڑو۔

نظر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پردے نہیں چھوڑتی۔ ہر جگہ گھومتی ہے مگر اپنی جگہ رہتی ہے۔

۸۔ اے عقلمند! دنیا میں بلبلے کی مانند اپنی خلوت کی جگہ کا راستہ غیروں پر بند کر دے۔

بلبلا اندر سے خالی ہوتا ہے، لیکن اس میں اندر جانے کا راستہ کوئی نہیں ہوتا، لہٰذا اسے خلوت خانہ یعنی الگ بیٹھنے کی جگہ کہا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ غیروں پر دروازہ بند کر دے۔

۹۔ فرد اس لیے فرد ہے کہ اس نے اپنی ہستی پہچان لی۔ قوم اس لیے قوم ہوئی کہ اس نے اپنے سوا کسی سے سازگاری کا ڈول نہ ڈالا۔

مراد یہ ہے کہ فرد اور قوم دونوں کی ہستی احساسِ خودی پر موقوف ہے، لیکن احساس کی عملی کیفیت یکساں نہیں۔ فرد کی خودی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو مرکز بنائے رکھے، قوم کی خودی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے افراد کے درمیان مطابقت پیدا کر کے ایک اجتماعی انا کا انتظام کرے۔

اس شعر میں مرکزی مضمون یہی دو چیزیں ہیں۔ یہ نہیں کہ فرد ہمیشہ اپنی خودی پر جما رہے کہ اگر ایسا ہو تو قوم وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ قومی خودی کا مطلب بھی یہ نہیں کہ ساری دنیا سے ناموافقت پیدا کر لی جائے کہ اگر ایسا ہو تو لڑائی سے ایک لمحے کے لیے بھی فرصت نہ ملے۔ دونوں مقامات پر خودی کے خاص حدود ہیں اور اقبال نے ان سے تجاوز نہیں کیا۔

۱۰۔ رسول اللہ صلعم کے مقدس پیغام سے آگاہی حاصل کر اور خدا کے سوا جو معبود ہیں، ان سے یکسو ہو جا۔

تیسرا باب

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ

(نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا)

رنگ و نسب سے بالاتر قومیت

قنبر۔ حضرت علیؓ کے غلام کا نام۔

اعمام۔ عم کی جمع۔ چچے۔

لانہ۔ شہد کا چھتا، یہ لفظ بھڑوں کے چھتے کے لیے بھی مستعمل ہے۔

عبہر۔ نرگس کی ایک قسم جس کے پھول کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ نرگسِ شہلا وہ ہے جس کے پھول کا رنگ

سُرخی مائل سیاہ ہوتا ہے۔ نرگس کی اسی قسم کو چشم انسانی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

نشان۔ شہد کا چھتا۔

تولاً۔ محبت۔

عروق۔ عرق کی جمع، رگیں۔

اقبال نے لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جس طرح ہمارا خدا نسب کی آلائش سے پاک ہے اسی طرح خدا کی اس صفت کی پیروی میں ہماری قوم بھی ہرگز رنگ و نسب کی روادار نہیں۔

۱۔ اے مسلمان! تیری قوم رنگ اور خون سے بہت اونچی ہے اور اس کے ایک کالے کی قیمت سیکڑوں گورے ہیں۔

عموماً گورے کو کالے پر ترجیح دی جاتی ہے، لیکن اقبال کہتے ہیں کہ اسلام کا ایک کالا سیکڑوں گوروں پر ترجیح کا مستحق ہے۔ یہ فضیلت اسلام کی بدولت ہے، نہ کہ رنگ کی بدولت۔

۲۔ ہمارے غلام کے آبِ وضو کا ایک قطرہ قیمت میں قیصر جیسے شہنشاہ کے خون سے زیادہ گراں ہے۔

۳۔ تو باپ، ماں اور چچاؤں کے رشتے سے آزاد ہو جا۔ حضرت سلمانؓ کی طرح اپنا رشتہ اسلام سے جوڑ لے اور اسلام کا فرزند بن جا۔

مشہور ہے کہ حضرت سلمانؓ سے نسب پوچھا گیا تو فرمایا: "سلمانؓ بن اسلام"۔

۴، ۵، ۶۔ اے عقلمند دوست! میں تجھے ایک نکتہ بتاتا ہوں۔ تو چھتے کے خانوں میں شہد پر نظر ڈال۔ مکھیاں رس چوس چوس کر شہد بناتی ہیں۔ کوئی قطرہ لالے کے سُرخ پھول سے لیا جاتا ہے، کوئی نرگس سے۔ لیکن کبھی سنا ہے کہ کسی قطرے نے کہا ہو: "میری اصل نرگس ہے" اور دوسرے نے کہا ہو: "میں نیلوفر کے رس سے بنا ہوں"؟

گویا شہد مختلف قسم کے پھولوں سے تیار ہوا، مگر چھتے میں پہنچا تو ایک جنس ہو گیا۔ یہی کیفیت ملتِ اسلامیہ کی ہونی چاہیے۔ بے شک اس میں مختلف نسلی گروہ ہوں گے اور ان کے رنگ بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہ ہوں گے، مگر اسلام سے تعلق پیدا ہو جانے کے بعد ان سب کو پچھلے رشتے بھول جانے چاہییں تاکہ صرف اسلام کا رشتہ باقی رہ جائے۔

۷۔ ہماری ملت شہد کا وہ چھتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں تیار ہوا اور اس میں شہد وہ ایمان ہے، جس کا عملی ثبوت حضرت ممدوح نے دیا اور اسی ایمان کی دعوت حضرت کی زبان پر جاری ہوئی۔

۸، ۹۔ اگر تو نسب اور نسل کو ملت کا جزو بنائے گا تو ظاہر ہے کہ اخوت کے کاروبار میں رخنہ پیدا ہو جائے گا یعنی برادری کی وہ شان کیوں کر قائم رہے گی، جو رنگ، نسب اور خون سے بہت بالا ہے۔

یاد رکھ کہ ہماری زمین میں تیرا ریشہ جڑ نہیں پکڑ سکتا کیونکہ تیرے افکار و خیالات ابھی تک

نامسلم ہیں۔

مراد یہ ہے کہ نسب کو ملّت کا جزو بنانے سے اس اخوت میں خلل پیدا ہو جائے گا جسے پختہ اور استوار کرنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا اور نسب کے دعویدار کو رسماً بیشک مسلمان کہہ لیا جائے، لیکن اس کی فکر و نظر کو مسلمان نہیں مانا جا سکتا:

حضرت ابن مسعودؓ کا واقعہ ۱۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہؓ ابن مسعود عشق کا چراغ جلانے والے تھے۔ ان کا جسم اور جان دونوں سراپا عشق کی حرارت تھے۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی مقدس ذات عشقِ حق کے لیے وقف ہو چکی تھی:

۲۔ اُن کے بھائی نے وفات پائی، اس صدمے سے اُن کا سینہ جل اٹھا اور دل کا آئینہ پگھل کر پانی ہو گیا:

۳۔ اُن کا رونا دھونا ختم ہی نہ ہوتا تھا اور بھائی کے غم میں وہ ماؤں کی طرح آہ و فغاں کرتے تھے:

۴۔۵۔۶۔ کہتے تھے: افسوس! وہ عقیدت کا سبق لینے والا جو نیازمندی کی درس گاہ میں میرا رفیق تھا افسوس! سرو کی طرح بلند قامت میرا بھائی، جو رسول اللہ صلعم کے عشق میں میرے برابر چلتا تھا، افسوس! وہ رسول اللہ صلعم کے دربار سے محروم ہو گیا اور میری آنکھیں حضورؐ کے دیدار سے روشن ہیں:

اس حکایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے لیے اسلام لانے کے بعد صرف ایک رشتہ باقی رہ گیا تھا اور وہ رسول اللہ صلعم سے عشق کا رشتہ تھا۔ اسی کو اسلامی رشتہ کہا جاتا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ اپنے بھائی کو یاد کرتے تھے تو اسی رشتے سے یاد کرتے تھے۔ یہی ہر مسلمان کی خصوصیت ہونی چاہیے:

رسول اللہ صلعم سے عشق ۱۔ ہمارا باہم رشتہ روم اور عرب پر موقوف نہیں اور نہ اس سے نسب کا کوئی تعلق ہے، یعنی نہ ہمارے نزدیک جغرافیائی حدود کوئی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ نسب و خون:

۲۔ ہم نے حجازی محبوب (رسول اللہ صلعم) سے دل لگایا ہے، اسی سبب سے ایک دوسرے کے ساتھ ہمارا رشتہ جڑ گیا ہے:

۳۔ یہی محبت ہمارے نزدیک ایسا تعلق ہے کہ اس سے زیادہ کسی تعلق کی ضرورت نہیں۔ ہماری آنکھوں کے لیے حضورؐ کی شراب کا نشہ کافی ہے۔

۴۔ جب اس شراب کی مستی ہمارے خون میں دوڑی تو جتنے پرانے تعلقات اور پرانے رشتے تھے اس نے جلا دیے اور ایک نیا رشتہ پیدا کر دیا۔

۵۔ حضورؐ کا عشق ہی ہمارے لیے یک جا رہنے کا سامان ہے۔ یہ عشق خون کی طرح ملت کی رگوں میں دوڑ رہا ہے:

۶۔ عشق جان میں اتر جاتا ہے اور نسب صرف جسم تک محدود رہتا ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ عشق کا رشتہ نسب کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہے۔

۷۔ اگر تُو نے رسول اللہ صلعم سے لَو لگائی ہے تو نسب سے بے تعلق ہو جا بلکہ ایران و عرب سے بھی رشتہ توڑ لے۔

۸۔ رسول اللہ صلعم کی امت بھی حضورؐ کی طرح اللہ کا نور ہے۔ ہماری ہستی حضورؐ ہی کے عشق سے پیدا ہوئی ہے۔

۹۔ اللہ کے نور کی اصل دحیثیت کون ڈھونڈتا ہے؟ جس خلعت کا تعلق حق سے ہو، اسے تانے بانے کی کیا ضرورت ہے؟

۱۰۔ جس شخص کے پاؤں تک اور باپ دادا کے بند ھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں، یقین کر لینا چاہیے کہ وہ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہے، یعنی سورۂ اخلاص کے اس ٹکڑے کا مطلب ہی یہ ہے کہ نہ تو مسلمان کسی جغرافیائی کشور اور ولایت کا پابند رہے، نہ نسب اور رنگ کا۔ جو مسلمان ان رشتوں میں جکڑا رہے گا، وہ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ پر سچے ایمان کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا۔

چوتھا باب

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ

(اور نہ کوئی ہستی اس کے درجے اور برابری کی ہوئی)

مسلمان کی شانِ برتری | لا تحزنوا و انتم الاعلون ۔ اشارہ ہے سورۂ آل عمران کی اس آیت کی طرف:

وَلَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔

اور دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو۔ تمھیں سب سے سر بلند ہو، بشرطیکہ تم سچے مسلمان ہو۔

غَو۔ شور۔ بلند آواز۔

تُنْدَر۔ کڑک۔

بَذل۔ بخشش۔

عنادِل۔ عندلیب کی جمع۔ بُلبلیں۔

کہنہ چنبر۔ پُرانا حلقہ یا چکّر، مراد آسمان۔

۱۔ مسلمان، جس نے دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں، کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے اس لَو لگانے والے کی فطرت کے بارے میں کیا سمجھا جائے؟

۲۔ اس کی مثال اُس گُلِ لالہ کی ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر اُگتا اور وہیں نشو و نما پاتا ہے۔ کسی پھول چُننے والے کا گوشۂ دامن

اُس نے نہیں دیکھا، یعنی اُس تک چُھننے والے کا ہاتھ کبھی نہیں پہنچا۔

۳- اُس گُلِ لالہ کی آگ صبح کے ابتدائی سانسوں سے بھڑکتی ہے:

مطلب یہ کہ علی الصباح ہلکی ہلکی نسیم چلتی ہے تو اُس لالے میں انتہائی تازگی و شادابی پیدا ہو جاتی ہے۔

۴- آسمان اسے اپنی گود سے باہر نہیں جانے دیتا۔ یہی سمجھتا ہے کہ وہ کوئی تارا ہے جو چلتے چلتے دوسروں سے پیچھے رہ گیا ہے:

۵- سب سے پہلے سورج کی کرن اسے چومتی ہے اور شبنم اس کی آنکھوں سے نیند کا گرد و غبار دھوتی ہے:

یہ اشعار شاید بہ ظاہر شاعرانہ تخیل معلوم ہوں، لیکن حقیقت میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ اقبالؒ سورۂ اخلاص کی مندرجہ بالا آیت کے تحت مسلمان کی شانِ برتری واضح کرنا چاہتے ہیں اور بہ طور تمہید یہ شعر لکھے، جن میں برتری و سربلندی کا نہایت پاکیزہ تصور پہاڑ پر اُگنے والے لالے کی شکل میں پیش کیا اور اس کی تربیت و نگہداشت کے نہایت پاکیزہ اسباب بیان فرمائے۔ ان اشعار کو مسلمان پر ڈھالیے تو واضح ہو گا کہ وہ درجے میں سب سے اونچا ہے۔ کسی جابر کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ قدرت کی بہترین چیزوں سے فیض حاصل کرتا ہے۔ آسمان خود اس کا نگہبان اور کائنات کی مختلف چیزیں اس کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں:

۶- فرماتے ہیں: "اے مسلمان! تجھے خدا کی اس صفت سے رشتہ مستحکم کر لینا چاہیے جو لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ میں بیان ہوئی ہے"، یعنی اس کے برابر کوئی نہیں۔ یہ رشتہ مستحکم ہو جائے گا تو تُو دنیا کی قوموں میں بے مثال بن جائے گا۔

۷- وہ پاک ذات ہے، جو اکیلا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ اُس کا بندہ بھی کوئی شریک گوارا نہیں کر سکتا:

۸- مومن ہر بلند تر سے بلند ہے۔ اس کی غیرت کسی ہمسر کو برداشت نہیں کر سکتی:

۹- وہ لاتحزنوا کا خرقہ پہنے ہوتا ہے، یعنی اسے کسی چیز کا غم نہیں ہوتا اور انتم الاعلون (تمھیں سب سے سربلند ہو) کا تاج اس کے سر پہ ہوتا ہے:

۱۰- دونوں جہانوں کا بوجھ وہ اپنے کندھے پر اٹھا لیتا ہے۔ خشکی اور تری دونوں اس کی آغوش میں پلتی ہیں:

۱۱- بجلی کی کڑک کے شور پر اس کے کان لگے رہتے ہیں۔ اگر برق گرتی ہے تو اسے اپنے کندھے پر اٹھا لیتا ہے۔

ان اشعار سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جتنے مشکلات و مصائب ہیں، مسلمان ان سب کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور دوسری قوموں کو بھی ان سے بچاتا ہے:

خیر و شر کا معیار ۱- باطل سے سامنا ہو جائے تو مومن تلوار بن جاتا ہے۔ حق کی حفاظت کا موقع آ جائے تو وہ ڈھال کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی کے امر و نہی، نیک و بد کی کسوٹی ہیں، یعنی مومن جس چیز کا حکم دے،

وہ نیکی اور جس سے رد کے، وہ بدی ہے۔

۲۔ اُس کے انگارے کی گرہ میں سینکڑوں شعلے ہیں اور زندگی کو اسی کے جوہر سے درجۂ کمال حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ ہائے و ہو کے اس جہان کی فضا میں مومن کی تکبیر کے سوا کوئی نغمہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

۴۔ عفو و درگزر، عدل و انصاف اور سخاوت و احسان میں اس کا درجہ بہت اونچا ہے بلکہ غصے کی حالت میں بھی اس کے مزاج پر لطف و کرم ہی غالب رہتا ہے۔

۵۔ مجالس میں مومن کا ساز ترانہ ریز ہوتا ہے تو دل خوش ہو جاتے ہیں۔ میدانِ جنگ کا وقت آ جائے تو مومن کی حرارتِ ایمان لوہا پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔

۶۔ باغ میں وہ بلبلوں کا ہم نوا بن جاتا ہے، بیابان میں شکار پکڑنے والے شہباز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

۷۔ اُس کا دل آسمان کے نیچے آسودگی نہیں پاتا۔ وہ اپنے جسم کے ساتھ آسمان پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

۸۔ مومن ایک ایسا پرندہ ہے جو تاروں کو دانے سمجھ کر ان پر چونچ مارتا ہے اور اس فضا میں اُڑتا ہے جو اس آسمان سے آگے ہے۔

۹۔ مومن کی حقیقی شان واضح کرنے کے بعد اپنے عہد کے مسلمان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں: تُو نے تو پرواز کے لیے کبھی پر نہیں کھولے، تیری کیا حیثیت ہے۔ تُو ایک کیڑا ہے جو مٹی کے نیچے اطمینان سے بیٹھا ہے۔

۱۰۔ جانتا ہے کہ تُو کیوں ذلیل ہُوا؟ تیری ذلت کا اصل سبب یہ ہے کہ تُو نے قرآن کو چھوڑ دیا اور زمانے کی گردش کے شکوے کرنے لگا۔

مراد یہ ہے کہ مسلمان جن مصیبتوں اور آفتوں کا ہدف بنا، اُن کا ذمہ دار وہ خود ہے کیونکہ قرآن کو ترک کر دیا اور خدا نے کامیابی و کامگاری کے جو قاعدے، ضابطے اور قانون مقرر کر رکھے ہیں، ان کی پابندی نہ کی۔ اپنی نالائقی کو زمانے کی گردش کا نتیجہ قرار دینا ہرگز ٹھیک نہیں۔

۱۱۔ اے شبنم کی طرح زمین پر گرنے والے! تیرے پاس ایک زندہ کتاب قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے، تو اس سے زندگی کا سبق لے۔

۱۲۔ تُو کب تک زمین سے چمٹا رہے گا اور ذلت و خواری کی موجودہ حالت برداشت کرتا جائے گا؟ اُٹھ، سرو سامان اُٹھا اور اسے اُچھال کر آسمان پہ پہنچا دے۔

پانچواں باب

رحمۃ للعالمینؐ کے حضور میں عرضِ حال

رحمۃ للعالمین | ہندو ۔ غلام ۔

نابود مندی ۔ بے مایگی ۔ بے حقیقتی ۔ بے حیثیتی ۔

شل ۔ سست ، نرم ۔ بیکار ۔

بُصیری ۔ مشہور شاعر جس نے قصیدۂ بردہ لکھ کر عالم رویا میں رسول اللہ صلعم کو سنایا اور صلے میں مقدس چادر کے عطیّے سے سرفراز ہوا ۔

اعصار ۔ عصر کی جمع ، زمانے ۔

دہور ۔ دہر کی جمع ۔ زمانے ۔

مرغولہ مویاں ۔ گھنگریالے بالوں والے ۔ محبوب ۔

سارا ۔ خالص ۔

۱ ۔ حضورؐ والا ! آپ کا ظہور زندگی کا عہدِ شباب تھا اور آپ کا جلوہ زندگی کے خواب کی تعبیر تھا ۔

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے ظہور پر یہ کائنات عہدِ شباب کو پہنچی اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں رکھی تھیں ، انھوں نے درجۂ کمال حاصل کر لیا ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر زندگی کو ایک خواب قرار دیا جائے تو اس خواب کی تعبیر یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم کا ظہور ہو ۔ حضورؐ کے جلوے سے دنیا روشنی حاصل کرے ۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضورؐ ہی کی تعلیم میں زندگی کے خواب کی صحیح تعبیر آشکارا ہوئی ۔

۲ ۔ حضورِ والا ! ہماری زمین نے صرف اس وجہ سے اونچا درجہ حاصل کر لیا کہ آپ کی بارگاہ سے شرف پایا ۔ آسمان آپ کے لبِ بام کو چومنے کی بدولت سربلند ہوا ۔

۳ ۔ اس کائنات کا ہر پہلو آپ کے روئے مبارک کی چمک دمک سے روشن ہے ۔ ترک ہوں یا تاجیک ہوں یا عرب ہوں ، سب آپ کے غلام ہیں ۔

۴ ۔ اس کائنات کا مرتبہ صرف آپ کی بدولت اونچا ہوا اور اس کی دولت آپ کے فقر کے سوا کچھ نہیں ۔

دوسرا مصرع خاص توجہ کا محتاج ہے۔ دولت اور فقر بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اقبالؔ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس کائنات میں جو دولت سب سے بڑھ کر بیش بہا تھی، وہ حضورؐ کی پاکیزہ اور مطہر زندگی تھی، جس کا جوہر فقر تھا، لہٰذا وہی طریق زندگی اس کائنات کی حقیقی دولت بن گیا۔

۵ ـ حضور والاؐ نے دنیا میں زندگی کا چراغ روشن کیا اور غلاموں کو آقائی کا طریقہ سکھایا۔

۶، ۷ ـ آب و گل کے اس مقام یعنی دنیا میں جتنے بھی وجود تھے، وہ حضورؐ کے بغیر اپنی بے مائیگی اور بے حقیقتی پر شرمسار تھے۔ وہ خاک کے ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ آپ کے نفسِ گرم نے مٹی سے آگ پیدا کی تو وہ سب آدمی بن گئے۔

یہاں آگ سے مراد بظاہر عشقِ حق ہے۔ عشقِ حق کی مکمل تعلیم دنیا کو صرف رسول اللہ صلعم کے ذریعے سے ملی۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ پہلے یہ سب مٹی کے ڈھیر تھے، اگرچہ صورتیں آدمیوں کی سی تھیں۔ حقیقی آدمی اُس وقت بنے جب رسول اللہ صلعم نے ان میں عشقِ حق کی حرارت پیدا کر دی۔

۸ ـ بے حقیقت ذرّے اپنی خداداد قوتوں سے آگاہ ہو گئے اور انھوں نے اُٹھ کر چاند اور سورج کے دامن تھام لیے۔

<u>مسلمان کی کم نصیبی اور حق ناشناسی</u> | ۱ ـ حضور والاؐ! جب سے میری نظر حضورؐ کے رُوئے انور پر پڑی ہے، حضورؐ ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص صاحب ایمان نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والدین، اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔" یقیناً ہر صاحب ایمان مسلمان کے نزدیک رسول اللہ صلعم دنیا بھر سے محبوب تر ہیں اور جسے معاذ اللہ یہ مقام حاصل نہ ہو، وہ ایمان کی لذت سے محروم رہ گیا۔

۲ ـ عشق نے میرے اندر آگ بھڑکائی۔ اب اسے فرصت مبارک ہو کہ میری جان جل چکی۔

۳ ـ اب میرے پاس ایک آہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی کو میں اپنے اُجڑے گھر کا دیا سمجھتا ہوں۔

۴ ـ حضورؐ! جو غم میرے رگ و پے میں رچا ہوا ہے، اُسے عرض کرنے سے رُکے رہنا مشکل ہے۔ شراب کس طرح صراحی میں چھپی رہ سکتی ہے!

۵ ـ مسلمان حضور والاؐ کی تعلیم سے بے بہرہ ہو گیا۔ یہ حرمِ پاک پھر بُت خانہ بن گیا۔

۶ ـ رنگ رنگ کے بُت ہیں۔ منات ہے، لات ہے، عزّیٰ ہے اور ہبل ہے۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی بُت بغل میں دبائے پھرتا ہے۔

۷ ـ ہمارے مذہبی پیشوا کفر میں برہمنوں سے بھی آگے نکل گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے دماغ میں سومنات سجا رکھا ہے۔

۸ ـ انھوں نے عرب سے سرو سامان اُٹھا لیا اور عجم کے شراب خانے میں جا کر سو گئے۔

۹ ـ اُن کے اعضا عجم کے برف آمیز پانی سے بے حس و حرکت ہو گئے اور ان کی شراب اُن کے آنسوؤں سے زیادہ سرد ہے۔

۱۰- وہ کافروں کی طرح موت سے ڈرتے ہیں اور ان میں سے کسی کے بھی سینے میں دل زندہ موجود نہیں۔

۱۱- میں نے ان نعشوں کو طبیبوں کے سامنے سے اٹھایا اور حضور والاؐ کی پیشگاہ میں لے آیا۔

۱۲- یہ مر چکے تھے، میں نے انھیں آب حیات کی باتیں سنائیں اور قرآن کے بھیدوں میں سے ایک بھید انھیں بتایا کہ شاید یہ پھر زندگی سے بہرہ ور ہو جائیں۔

۱۳- میں نے نجد کے دوستوں اور رفیقوں کی داستانیں سنائیں اور نجد ہی کے باغ سے ان کے لیے خوشبو لایا۔

۱۴- میں نے نغمے کی شمع روشن کر کے مجلس کو جگمگا دیا اور قوم پر زندگی کا راز آشکارا کرنا چاہا۔

۱۵- انھوں نے سنتے ہی کہا کہ یہ شخص تو ہم پر فرنگیوں کا منتر پھونک رہا ہے اور جن ترانوں کا شور اس نے بپا کر رکھا ہے، وہ تو فرنگیوں کے سازسے اٹھ رہے ہیں۔

بارگاہِ حضورؐ میں التجا ۱- اے وہ پاک ذات! جس نے بُصیری کو ردائے مبارک سے سرفرازی بخشی اور مجھے سلمیٰ کا ساز عطا کیا۔ یعنی یہ کام سونپا گیا کہ اسلامی ترانے ملّت کو سناؤں۔

۲- ان غلط اندیشوں کو ذوقِ حق عطا کیجیے۔ افسوس کہ یہ اپنی متاع کو نہیں پہچانتے، یعنی میں جو کچھ ان کے سامنے پیش کر رہا ہوں، یہ انھیں کا سرمایہ اور انھیں کا مال و سامان ہے، مگر انھیں کوئی اندازہ نہیں، غلط اندیشی سے سمجھ رہے ہیں کہ دوسروں کی باتیں انھیں سنائی جا رہی ہیں۔

۳، ۴، ۵- اگر میرے دل کا آئینہ جوہروں سے خالی ہے، اگر میری باتوں میں قرآن مجید کے سوا بھی کچھ ہے تو حضور والاؐ! آپ کی روشنی تمام زمانوں کے لیے صبح کا سروسامان ہے اور آپ کی آنکھ سینے کے اندر کی سب چیزیں دیکھ رہی ہے۔ آپ میری فکر کی عزّت و حرمت کا پردہ چاک کر دیجیے اور ایسا انتظام فرمایے کہ میرے کانٹے سے پھولوں کی یہ کیاری پاک ہو جائے۔

۶- زندگی کا لباس میرے جسم پر تنگ کر دیجیے اور ملّت کو میری برائیوں سے بچائے رہیے۔

۷- میرے بے سروسامان کھیت کو سبز نہ ہونے دیجیے اور اسے اپنے ابرِ بہار سے فیض نہ بخشیے۔

۸- میرے انگور کی رگوں میں شراب خشک کر دیجیے اور میری کافوری شراب میں زہر ڈال دیجیے۔

۹- قیامت کے دن مجھے ذلیل و رسوا ہونے دیجیے اور اپنے پاؤں کے بوسے سے بے نصیب رکھیے۔

۱۰، ۱۱- اگر میں نے صرف قرآنی اسرار کے موتی پروئے ہیں اور مسلمانوں کے سامنے سچی باتیں کہی ہیں تو حضور والاؐ! آپ کا احسان ہر بے حیثیت کو صاحبِ حیثیت بنا دیتا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا، اس کے بدلے میں صرف آپ کی دعا کافی ہے۔

۱۲- عزّ و جلال والے خدا کی بارگاہ میں عرض کیجیے کہ میرا عشقِ حق عمل سے ہمکنار ہو۔

۱۳، ۱۴- مجھے غمگین جان کی دولت بخشی گئی ہے اور دین کے علم سے بھی حصّہ ملا ہے۔ خدا سے عرض کیجیے کہ مجھے عمل میں زیادہ استواری نصیب ہو۔ میں ابرِ بہار کے پانی کا قطرہ ہوں، مجھے گوہر بنا دیا جائے، یعنی جانِ حزین اور

علم دین کی دولت، اس وقت تک حقیقی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی، جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ پانی بہرحال پانی ہے، خواہ معمولی بادل کا ہو یا ابرِ بہار کا، لیکن وہ عمل سے گوہر بنتا ہے اور جب تک گوہر نہ بنے، اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

سایۂ دیوارِ میں مرقد کی آرزو ۱- جب سے میں اس دنیا میں جان کا سر و سامان لے کر آیا ہوں، ایک اور آرزو دل کی آغوش میں پالتا رہا ہوں۔

۲- وہ دل کی طرح میرے سینے میں مطمئن بیٹھی ہے اور میری زندگی کی صبح سے شناسا چلی آ رہی ہے۔

۳- جب میں نے والد سے حضور والا کا نام مبارک سیکھا تو ساتھ ہی اس آرزو کی آگ بھی روشن ہو گئی۔

۴، ۵- میری عمر بڑھتی گئی اور آسمان زندگی کے جوئے میں مجھ سے کام لیتا رہا۔ میری یہ آرزو زیادہ جوان ہوتی رہی اور جوں جوں یہ شراب پرانی ہوتی گئی، اس کی قیمت بڑھتی گئی۔

۶- اس آرزو کو میری مٹی کے نیچے گوہر کی حیثیت حاصل ہے اور میری رات کی تاریکی میں صرف اسی ایک ستارے کی روشنی ہے۔

۷ تا ۱۰- میں مدتوں لالہ رُویوں سے ملتا جلتا رہا اور گھنگریالے بالوں والے حسینوں سے محبت کرتا رہا۔ چاند جیسی پیشانی والے محبوبوں کے ساتھ بادہ نوشی کی اور اطمینان و سکون کا چراغ بجھاتا رہا۔ میرے خرمن کے گرد بجلیاں منڈلاتی رہیں اور میرے دل کا سامان رہزن اٹھا کر لے گئے لیکن اس آرزو کی شراب میری جان کی صراحی سے گر نہ سکی اور یہ خالص سونا میرے دامن سے باہر نہ نکل سکا۔

۱۱- میری بُت ساز عقل نے زنار پہن لیا اور اس کا نقش میری جان کی ولایت میں بیٹھ گیا۔

۱۲- سالہا سال میں شک میں مبتلا رہا اور یہ شک میرے خشک دماغ سے الگ نہ ہوتا تھا۔

۱۳- میں نے یقینی علم کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تھا اور فلسفے کی اُس بستی میں پڑا رہا جس کا سرمایہ وہم و گمان کے سوا کچھ نہ تھا۔

۱۴- میری تاریکی حق کی روشنی سے بیگانہ تھی اور میری شام کو شفق کا نور نصیب نہیں ہوا تھا۔

۱۵- اس حالت کے باوجود وہ آرزو میرے دل میں سوئی رہی، گویا صدف کی آغوش میں موتی سویا ہوا تھا۔

۱۶- آخر یہ آرزو میری آنکھ کے ساغر سے ٹپک پڑی اور اس نے میرے ضمیر میں نغمے پیدا کر دیے۔

۱۷- اے وہ پاک ذات! جس کے سوا کسی کی یاد میری جان میں سما نہیں سکتی، اگر اجازت مرحمت ہو تو میں وہ آرزو زبان پر لے آؤں!

۱۸، ۱۹- زندگی میں عمل کا کوئی سامان نظر نہ آتا تھا، اس لیے میں اپنے آپ کو اس آرزو کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے

اس آرزو کے اظہار سے شرم آتی ہے، البتہ حضورؐ کی شفقت میرا حوصلہ بڑھا رہی ہے:

۲۰ - حضور والاؐ کی شانِ رحمت نے دنیا کو نوازشوں سے سرفرازی بخشی - میری آرزو یہ ہے کہ آخری سانس حجاز میں پورا ہو -

۲۱ - ایک مسلمان، جو اللہ کے سوا ہر شے سے بیگانہ ہے، کب تک بُت خانے میں زنّاری بنا بیٹھا رہے؟

۲۲ - کتنے افسوس کا مقام ہے کہ جب اس کی زندگی کے دن ختم ہوں تو اس کا جسد بُت خانے کی آغوش میں رکھا جائے؟

۲۳ - اگر میری خاک کے اجزاء قیامت کے دن حضور والاؐ کے دروازے سے اٹھیں تو میرا موجودہ دور کتنا ہی باعثِ افسوس ہو لیکن آئندہ دور تو انتہائی خوش نصیبی کا ہوگا.

۲۴ - کتنا مبارک ہے وہ شہر جہاں آپ تشریف فرما تھے. کتنی پاکیزہ ہے وہ خاک جہاں آپ آرام فرما ہیں -

۲۵ - عاشق کے لیے حُبِ وطن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے دوست کے مسکن اور اپنے بادشاہ کے شہر میں پہنچے:

۲۶ - حضور والاؐ! میرے ستارے کو روشن آنکھ بخشیے اور میرے لیے اپنی دیوار کے سایے میں قبر کی جگہ عطا کیجیے:

۲۷، ۲۸ - تا کہ میرے بیقرار دل کو قرار نصیب ہو، میرے پارے میں بستگی پیدا ہو جائے اور میں آسمان سے کہوں کہ دیکھ، مجھے کیسا آرام نصیب ہوا. تو میرا آغاز دیکھ چکا ہے، اب میرے انجام پر بھی ایک نظر ڈال:

ڈاکٹر سر محمدؐ اقبالؒ کی زندۂ جاوید تصانیف

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
بانگ درا	حضرت علامہ اقبال مرحوم کی تمام تصانیف کو مرحوم کے	۵/-
ضرب کلیم	صاحبزادہ والاقدر ڈاکٹر شیخ جاوید اقبال کے زیر ہدایت خاص	۳/-
ارمغان حجاز	انتظام و اہتمام سے طبع کرانے کا فخر بھی اس ادارے کو حاصل ہے۔	۴/۵۰
پیام مشرق	ہر تصنیف حسین و جمیل جلد سے مزین	۴/۵۰
زبور عجم		۴/۵۰
بال جبریل		۴/-
جاوید نامہ		۵/-
مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر		۲/۵۰
سرود رفتہ	علامہ اقبال کا وہ کلام جو اُن کے مرتب کردہ دواوین میں شامل نہ ہو سکا	۸/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

شرحِ کلامِ اقبالؒ

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
مطالبِ بانگِ درا	مولانا غلام رسول مہر	۵/-
مطالبِ بالِ جبریل	کے	۴/-
مطالبِ ضربِ کلیم	افادہ بخش	۳/-
مطالبِ ارمغانِ حجاز	قلم	زیرِ طبع
مطالبِ پیامِ مشرق	سے	"
مطالبِ زبورِ عجم	شرح	"
مطالبِ جاوید نامہ	کلامِ اقبالؒ	"
مطالب		
پس چہ باید کرد		"

شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور